

درس عقائد

آیۃ اللہ مصباح یزدی

مترجم: ضمیر حسین بہاولپوری

مجمع جهانی اہل بیت علیہم السلام

فہرست مطالب

حرف اول..... ۲۸

پیش لفظ..... ۳۱

پہلا درس..... ۳۶

دین کیا ہے؟..... ۳۶

دین کا مفہوم..... ۳۶

نتیجہ..... ۳۹

سوالات..... ۴۰

دوسرا درس..... ۴۱

دین میں تحقیق..... ۴۱

تحقیق کے عوامل..... ۴۱

دین میں تحقیق..... ۴۳

ایک شبہ کا حل..... ۴۴

سوالات..... ۴۵

تیسرا درس..... ۴۶

انسان بن کے جینے کی شرط..... ۴۶

مقدمہ..... ۴۶

انسان کمال طلب ہے..... ۴۷

انسان کا کمال، عقل کی پیروی میں ہے..... ۴۸

نتیجہ..... ۴۹

سوالات..... ۵۰

چوتھا درس..... ۵۲

جہان بینی کے بنیادی مسائل کا راہ حل..... ۵۲

مقدمہ..... ۵۲

شناخت کی قسمیں..... ۵۲

معرفت کی قسمیں..... ۵۳

تنقید..... ۵۴

نتیجہ..... ۵۶

سوالات..... ۵۶

پانچواں درس..... ۵۸

۵۸..... خدا کی معرفت

۵۸..... مقدمہ

۵۸..... حضوری اور حصولی معرفت

۵۹..... فطری شناخت

۶۰..... انسان کی فطریات کو دو حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے

۶۱..... نتیجہ

۶۱..... سوالات

۶۲..... چھٹا درس

۶۲..... خدا شناسی کا آسان راستہ

۶۲..... خدا شناسی کے راستے

۶۳..... آسان راستہ کی خصوصیات

۶۴..... آشنا نشانیاں

۶۶..... سوالات

۶۷..... ساتواں درس

۶۷..... واجب الوجود کا اثبات

۶۷.....مقدمہ

۶۸.....امکان اور وجوب

۶۹.....علت اور معلول

۷۰.....علتوں کے تسلسل کا محال ہونا

۷۱.....تقریر برہان

۷۲.....سوالات

۷۳.....آٹھواں درس

۷۳.....خدا کی صفات

۷۳.....مقدمہ

۷۴.....خدا کا ازلی و ابدی ہونا

۷۴.....صفات سلیمہ

۷۷.....وجود بحثی والی علت کی خصوصیات

۷۸.....سوالات

۷۹.....نواں درس

۷۹.....صفات ذاتیہ

۷۹.....مقدمہ

۸۰.....صفات ذاتیہ اور فعلیہ

۸۱.....صفات ذاتیہ کا اثبات

۸۱.....حیات

۸۲.....علم

۸۳.....قدرت

۸۴.....سوالات

۸۶.....دسواں درس

۸۶.....صفات فعلیہ

۸۶.....مقدمہ

۸۷.....خالقیت

۸۸.....ربوبیت

۸۹.....الوہیت

۹۰.....سوالات

۹۱.....گیارہواں درس

بقیہ صفات فعلیہ..... ۹۱

مقدمہ..... ۹۱

ارادہ..... ۹۱

حکمت..... ۹۲

کلام الہی..... ۹۲

صدق..... ۹۵

سوالات..... ۹۶

بارہواں درس..... ۹۷

انحراف کے اسباب کی تحقیق..... ۹۷

مقدمہ..... ۹۷

انحراف کے اسباب..... ۹۷

سوالات..... ۱۰۱

تیرہواں درس..... ۱۰۲

چند شبہات کا حل..... ۱۰۲

نامحسوس موجود پر اعتقاد..... ۱۰۲

۱۰۴..... کیا قاعدہ علیت ایک قاعدہ کمی ہے.....

۱۰۴..... علوم اجتماعی کے نتائج.....

۱۰۶..... سوالات.....

۱۰۷..... چودھواں درس.....

۱۰۷..... مادی جہان بینی اور اس پر تنقید.....

۱۰۷..... مادی جہان بینی کے اصول.....

۱۰۸..... پہلی اصل.....

۱۰۹..... دوسری اصل.....

۱۰۹..... تیسری اصل.....

۱۰۹..... چوتھی اصل.....

۱۱۰..... سوالات.....

۱۱۲..... پندرہواں درس.....

۱۱۲..... مائریالیسم ڈیالٹیک اور اس پر تنقید.....

۱۱۲..... مکینکی اور ڈیالٹیکی مائریالیسم.....

۱۱۳..... تنقید.....

۱۱۴.....قاعدہ جہش

۱۱۵.....تنقید

۱۱۶.....قاعدہ نفی نفی

۱۱۶.....تنقید

۱۱۷.....سوالات

۱۱۸.....سولہواں درس

۱۱۸.....خدا کی لائٹ

۱۱۸.....مقدمہ

۱۲۲.....سوالات

۱۲۳.....سترہواں درس

۱۲۳.....توحید کے معانی

۱۲۳.....مقدمہ

۱۲۶.....دو محکمے

۱۲۷.....سوالات

۱۲۸.....اٹھارہواں درس

جبر و اختیار..... ۱۲۸

مقدمہ..... ۱۲۸

اختیار کی وضاحت..... ۱۳۰

ثبہات کے جوابات..... ۱۳۲

سوالات..... ۱۳۳

انیسواں درس..... ۱۳۵

قضا و قدر کا مفہوم..... ۱۳۵

قضا و قدر علمی و عینی..... ۱۳۶

انسان کے اختیار سے قضا و قدر کا رابطہ..... ۱۳۷

متعدد علتوں کے اثر انداز کی قسمیں..... ۱۳۸

قضا و قدر پر اعتقاد کے آثار..... ۱۴۰

سوالات..... ۱۴۱

بیسواں درس..... ۱۴۲

عدل الہی..... ۱۴۲

مقدمہ..... ۱۴۲

۱۴۳..... مفہوم عدل

۱۴۴..... نتیجہ

۱۴۵..... دلیل عدل الہی

۱۴۶..... چند شبہات کا حل

۱۴۹..... سوالات

۱۵۱..... اکیسواں درس

۱۵۱..... مسائل نبوت پر بحث کرنے کے نتائج

۱۵۱..... مقدمہ

۱۵۲..... اس حصہ کے مباحث کا حذف

۱۵۳..... علم کلام میں تحقیق کی روش

۱۵۳..... نتیجہ

۱۵۴..... سوالات

۱۵۵..... بائیسواں درس

۱۵۵..... بشر کو وحی اور نبوت کی ضرورت

۱۵۵..... بعثت انبیاء علی ضرورت

۱۵۶..... بشری علوم کی ناکامی

۱۵۸..... بعثت انبیاء [ع] کے فوائد

۱۵۹..... سوالات

۱۶۱..... تیسواں درس

۱۶۱..... چند شبہات کا حل

۱۶۳..... نتیجہ

۱۶۵..... نتیجہ

۱۶۷..... سوالات

۱۶۸..... چوبیسواں درس

۱۶۸..... عصمت انبیاء [ع]

۱۶۸..... وحی کے محفوظ رہنے کی ضرورت

۱۷۰..... عصمت کی دوسری قسمیں

۱۷۱..... انبیاء [ع] کی عصمت

۱۷۳..... سوالات

۱۷۴..... پچیسواں درس

انبیاء [ع] کے معصوم ہونے کی دلیلیں..... ۱۷۴

مقدمہ..... ۱۷۴

عصمت انبیاء [ع] پر عقلی دلائل..... ۱۷۵

عصمت انبیاء [ع] پر نقلی دلائل..... ۱۷۶

عصمت انبیاء [ع] کا راز..... ۱۷۷

سوالات..... ۱۷۹

چھیواں درس..... ۱۸۰

چند شبہات کا حل..... ۱۸۰

چند شبہات کا حل..... ۱۸۰

سوالات..... ۱۸۶

سٹائیواں درس..... ۱۸۸

معجزہ..... ۱۸۸

نبوت کو ثابت کرنے کے راستے..... ۱۸۸

معجزہ کی تعریف..... ۱۸۹

خارق عادت امور..... ۱۸۹

۱۹۰.....الہی خارق عادت امور.....

۱۹۱.....انبیاء[ع] کے معجزات کی خصوصیات.....

۱۹۲.....سوالات.....

۱۹۳.....اٹھائیواں درس.....

۱۹۳.....چند شبہات کا حل.....

۱۹۳.....چند شبہات کا حل.....

۱۹۴.....سوالات.....

۱۹۸.....انتہواں درس.....

۱۹۸.....انبیاء علیم السلام کی خصوصیات.....

۱۹۸.....انبیاء علیم السلام کی کثرت.....

۲۰۰.....انبیاء علیم السلام کی تعداد.....

۲۰۱.....نبوت اور رسالت.....

۲۰۲.....اولوالعزم انبیاء علیم السلام.....

۲۰۲.....چند نکات.....

۲۰۳.....سوالات.....

۲۰۵.....تیسواں درس

۲۰۵.....انبیاءِ علیم السلام اور عوام

۲۰۵.....مقدمہ

۲۰۵.....انبیاءِ علیم السلام کے مقابل میں لوگوں کا کردار

۲۰۶.....انبیاءِ علیم السلام سے مخالفت کے اسباب

۲۰۷.....انبیاءِ علیم السلام سے ملنے کا طریقہ

۲۰۸.....انسانی معاشروں کی تدبیر میں بعض سنت الہی

۲۱۰.....سوالات

۲۱۱.....اکتیسواں درس

۲۱۱.....پہنچمبر اسلام ﷺ

۲۱۱.....مقدمہ

۲۱۳.....پہنچمبر اسلام ﷺ کی رسالت کا اثبات

۲۱۵.....سوالات

۲۱۶.....تیسواں درس

۲۱۶.....اعجاز قرآن

۲۱۶.....قرآن کا معجزہ ہونا

۲۲۲.....سوالات

۲۲۳.....تینتواں درس

۲۲۳.....قرآن کا تحریف سے محفوظ رہنا

۲۲۳.....مقدمہ

۲۲۴.....قرآن میں کسی چیز کا اضافہ نہ ہونا

۲۲۵.....قرآن سے کسی چیز کا کم نہ ہونا

۲۲۶.....سوالات

۲۲۸.....چونتواں درس

۲۲۸.....اسلام کا جہانی اور جاودانی ہونا

۲۲۸.....مقدمہ

۲۲۹.....اسلام کا جہانی ہونا

۲۲۹.....اسلام کے جہانی ہونے پر قرآنی دلائل

۲۳۰.....اسلام کا جاودانی ہونا

۲۳۱.....چند شبہات کا حل

سوالات..... ۲۳۲

پیشگوئیوں درس..... ۲۳۴

خاتمیت..... ۲۳۴

مقدمہ..... ۲۳۴

خاتمیت پر قرآنی دلائل..... ۲۳۴

خاتمیت پر روایتی دلائل..... ۲۳۵

ختم نبوت کا راز..... ۲۳۶

چند شبہات کے جوابات..... ۲۳۷

سوالات..... ۲۳۸

چھٹیوں درس..... ۲۴۰

امامت..... ۲۴۰

مقدمہ..... ۲۴۰

مفہوم امامت..... ۲۴۲

سوالات..... ۲۴۴

پیشگوئیوں درس..... ۲۴۵

۲۴۵..... امام علیہ السلام کی احتیاج.....

۲۴۵..... مقدمہ.....

۲۴۶..... وجود امام علیہ السلام کی ضرورت.....

۲۴۸..... نتیجہ.....

۲۴۹..... سوالات.....

۲۵۰..... اڑتواں درس.....

۲۵۰..... منصب امام.....

۲۵۲..... سوالات.....

۲۵۵..... انتالیواں درس.....

۲۵۵..... عصمت اور علم امام.....

۲۵۵..... مقدمہ.....

۲۵۵..... عصمت امام.....

۲۵۷..... علم امام.....

۲۶۲..... سوالات.....

۲۶۳..... چالیواں درس.....

۲۶۳.....حضرت ہمدی (عج)

۲۶۳.....مقدمہ

۲۶۳.....جہانی حکومت الہی

۲۶۵.....وعدۃ الہی

۲۶۶.....چند روایتیں

۲۶۷.....غیبت اور اس کا راز

۲۷۰.....سوالات

۲۷۱.....اکتالیسواں درس

۲۷۱.....شناخت عاقبت کی اہمیت

۲۷۱.....مقدمہ

۲۷۲.....قیامت پر اعتقاد کی اہمیت و ضرورت

۲۷۳.....قیامت کے مسئلہ پر قرآن کی تاکید

۲۷۵.....نتیجہ

۲۷۶.....سوالات

۲۷۷.....بیسواں درس

۲۷۷..... مسئلہ قیامت اور مسئلہ روح کا باہمی رابطہ

۲۷۷..... زندہ موجودات کی وحدت کا معیار

۲۸۱..... سوالات

۲۸۲..... تینتالیسواں درس

۲۸۲..... روح کا غیر محسوس ہونا روح کا مجرد ہونا

۲۸۲..... مقدمہ

۲۸۶..... قرآنی دلائل

۲۸۷..... نتیجہ کلام

۲۸۷..... سوالات

۲۸۸..... چوالیسواں درس

۲۸۹..... قیامت کا اثبات

۲۸۹..... مقدمہ

۲۹۰..... برہان حکمت

۲۹۰..... حکمت کے خلاف کام ہوتا

۲۹۲..... برہان عدالت

سوالات..... ۲۹۳

پینتالیسواں درس..... ۲۹۴

قرآن میں قیامت کا تذکرہ..... ۲۹۴

مقدمہ..... ۲۹۴

قیامت کے مانند دوسرے حوادث..... ۲۹۶

سوالات..... ۲۹۹

چھیالیسواں درس..... ۳۰۰

منکرین کے شبہات کے لئے قرآن کا جواب فنا ہونے کے بعد دوبارہ پلٹنے کا شبہ..... ۳۰۰

سوالات..... ۳۰۳

سینتالیسواں درس..... ۳۰۴

قیامت کے بارے میں خدا کا وعدہ..... ۳۰۴

مقدمہ..... ۳۰۴

عقلی دلائل کی طرف اشارہ..... ۳۰۵

سوالات..... ۳۰۸

اڑتالیسواں درس..... ۳۰۹

عالم آخرت کی خصوصیات (آخرت کی پہچان) ۳۰۹

مقدمہ ۳۰۹

عقل کی روشنی میں آخرت کی خصوصیات ۳۱۲

سوالات ۳۱۳

انچا سوال درس ۳۱۵

موت سے قیامت تک ۳۱۵

مقدمہ ۳۱۵

ہر ایک کو موت آنی ہے ۳۱۵

قبض روح آسان ہے یا سخت؟ ۳۱۶

عالم برزخ ۳۱۹

سوالات ۳۱۹

پچا سوال درس ۳۲۱

قرآن مجید میں قیامت کا نقشہ ۳۲۱

مقدمہ ۳۲۱

زمین دریا اور پہاڑوں کی حالت ۳۲۱

۳۲۳..... موت کا صور

۳۲۳..... زندگی اور آغاز قیامت کا صور

۳۲۴..... الہی حکومت کا ظہور اور سببی و نبی رشتوں کا خاتمہ

۳۲۶..... جنت

۳۲۸..... جہنم

۳۳۰..... سوالات

۳۳۱..... اکیا و نواں درس

۳۳۱..... دنیا کا آخرت سے مقابلہ

۳۳۱..... مقدمہ

۳۳۲..... آخرت میں نعمت اور عذاب کے مابین جدائی

۳۳۳..... آخرت کا اصل ہونا

۳۳۴..... دنیاوی زندگی کو انتخاب کرنے کا نتیجہ

۳۳۵..... سوالات

۳۳۶..... با و نواں درس

۳۳۶..... دنیا آخرت کی کھیتی ہے

۳۳۶.....مقدمہ

۳۳۷.....دنیا آخرت کی کھیتی ہے

۳۳۸.....دنیا کی نعمتیں آخرت کی سعادت (خوشبختی) کا سبب نہیں

۳۳۹.....دنیا کی نعمتیں آخرت کی شقاوت (بدبختی) کا سبب بھی نہیں ہو سکتیں

۳۴۰.....نتیجہ کلام

۳۴۱.....سوالات

۳۴۲.....ترپنواں درس

۳۴۳.....دنیا و آخرت کے درمیان رابطہ کی قسم

۳۴۴.....مقدمہ

۳۴۵.....قرآنی دلیلیں

۳۴۶.....سوالات

۳۴۷.....چونواں درس

۳۴۸.....ابدی خوشبختی یا بدبختی میں ایمان کا دخل

۳۴۹.....مقدمہ

۳۵۰.....ایمان اور کفر کی حقیقت

۳۵۰.....ایمان اور کفر کی حد (نصاب)

۳۵۱.....ابدی خوشبختی یا بد بختی میں ایمان اور کفر کا دخل

۳۵۲.....قرآنی دلیلیں

۳۵۳.....سوالات

۳۵۵.....چھپنواں درس

۳۵۵.....ایمان اور عمل کا آپس میں رابطہ

۳۵۵.....مقدمہ

۳۵۶.....ایمان کا عمل سے رابطہ

۳۵۷.....عمل کا ایمان سے رابطہ

۳۵۸.....نتیجہ

۳۵۹.....سوالات

۳۵۹.....چھپنواں درس

۳۵۹.....مقدمہ

۳۶۰.....انسان کا حقیقی کمال

۳۶۲.....عقلی بیان

سوالات..... ۳۶۴

ستا و نواں درس..... ۳۶۴

جط و تکفیر..... ۳۶۴

مقدمہ..... ۳۶۴

ایمان اور کفر کا رابطہ..... ۳۶۵

نیک و بد اعمال کا رابطہ..... ۳۶۶

سوالات..... ۳۶۸

اٹھا و نواں درس..... ۳۶۸

مومنین کے امتیازات..... ۳۶۸

مقدمہ..... ۳۶۸

ثواب میں اضافہ..... ۳۶۹

گناہان صغیرہ کی بخشش..... ۳۷۰

دوسروں کے اعمال سے استفادہ..... ۳۷۱

سوالات..... ۳۷۱

اٹھواں درس..... ۳۷۲

۳۷۲..... شفاعت

۳۷۲..... مقدمہ

۳۷۲..... شفاعت کا مفہوم

۳۷۵..... شفاعت کے اصول

۳۷۸..... سوالات

۳۷۸..... مٹھواں درس

۳۷۸..... چند شجاعت کا حل

۳۷۸..... شفاعت کا انکار کرنے والی آیتوں کا جائزہ

۳۸۳..... سوالات

بسم اللہ الرحمن الرحیم

حرف اول

جب آفتاب عالم تاب افق پر نمودار ہوتا ہے کائنات کی ہر چیز اپنی صلاحیت و ظرفیت کے مطابق اس سے فیضیاب ہوتی ہے حتیٰ ننھے ننھے پودے اس کی کرنوں سے سبزی حاصل کرتے اور غنچے و کھیاں رنگ و نکھار پیدا کر لیتی ہیں تاریکیاں کافور اور کوچہ و راہ اجالوں سے پر نور ہو جاتے ہیں، چنانچہ متمدن دنیا سے دور عرب کی سنگلاخ وادیوں میں قدرت کی فیاضیوں سے جس وقت اسلام کا سورج طلوع ہوا، دنیا کی ہر فرد اور ہر قوم نے قوت و قابلیت کے اعتبار سے فیض اٹھایا۔ اسلام کے مبلغ و موسس سرور کائنات حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ غار حراء سے مثل حق لے کر آئے اور علم و آگہی کی پیاسی اس دنیا کو چشمہ حق و حقیقت سے سیراب کر دیا، آپ کے تمام الہی پیغامات ایک ایک عقیدہ اور ایک ایک عمل فطرت انسانی سے ہم آہنگ ارتقائے بشریت کی ضرورت تھا، اس لئے ۲۳ برس کے مختصر عرصے میں ہی اسلام کی عالمتاب شاعین ہر طرف پھیل گئیں۔

اور اس وقت دنیا پر حکمران ایران و روم کی قدیم تہذیبیں اسلامی قدروں کے سامنے ماند پڑ گئیں، وہ تہذیبی اصنام جو صرف دیکھنے میں اچھے لگتے ہیں اگر حرکت و عمل سے عاری ہوں اور انسانیت کو سمت دینے کا حوصلہ، ولولہ اور شعور نہ رکھتے تو مذہب عقل و آگہی سے روبرو ہونے کی توانائی کھودیتے ہیں یہی وجہ ہے کہ ایک چوتھائی صدی سے بھی کم مدت میں اسلام نے تمام ادیان و مذاہب اور تہذیب و روایات پر غلبہ حاصل کر لیا۔ اگرچہ رسول اسلام ﷺ کی یہ گراں بہا میراث کہ جس کی اہل بیت علیہم السلام اور ان کے

پيرووں نے خود کو طوفانی خطرات سے گزار کر حفاظت و پاسبانی کی ہے، وقت کے ہاتھوں خود فرزند ان اسلام کی بے توجہی اور ناقدری کے سبب ایک طویل عرصے کے لئے تنگنائیوں کا شکار ہو کر اپنی عمومی افادیت کو عام کرنے سے محروم کر دی گئی تھی، پھر بھی حکومت و سیاست کے عتاب کی پروا کئے بغیر مکتب اہل بیت علیہم السلام نے اپنا چشمہ فیض جاری رکھا اور چودہ سو سال کے عرصے میں بہت سے ایسے جلیل القدر علماء و دانشور دنیا نے اسلام کو تقدیم کئے جنہوں نے بیرونی افکار و نظریات سے متاثر اسلام و قرآن مخالف فکری و نظری موجوں کی زد پر اپنی حق آگین تحریروں اور تقریروں سے مکتب اسلام کی پشپناہی کی ہے اور ہر دور اور ہر زمانے میں ہر قسم کے شکوک و شبہات کا ازالہ کیا ہے، خاص طور پر عصر حاضر میں اسلامی انقلاب کی کامیابی کے بعد ساری دنیا کی نگاہیں ایک بار پھر اسلام و قرآن اور مکتب اہل بیت علیہم السلام کی طرف اٹھی اور گڑی ہوئی میں، دشمنان اسلام اس فکری و مغوی قوت و اقتدار کو توڑنے کے لئے اور دوستداران اسلام اس مذہبی اور ثقافتی موج کے ساتھ اپنا رشتہ جوڑنے اور کامیاب و کامراں زندگی حاصل کرنے کے لئے بے چین و بے تاب ہیں یہ زمانہ علمی اور فکری مقابلے کا زمانہ ہے اور جو مکتب بھی تبلیغ اور نشر و اشاعت کے بہتر طریقوں سے فائدہ اٹھا کر انسانی عقل و شعور کو جذب کرنے والے افکار و نظریات دنیا تک پہنچائے گا، وہ اس میدان میں آگے نکل جائے گا۔

(عالمی اہل بیت کونسل) مجمع جهانی اہل بیت علیہم السلام نے بھی مسلمانوں خاص طور پر اہل بیت عصمت و طہارت کے پیرووں کے درمیان ہم فکری و یکہتی کو فروغ دینا وقت کی ایک اہم ضرورت قرار دیتے ہوئے اس راہ میں قدم اٹھایا ہے کہ اس نورانی تحریک میں حصہ لے کر بہتر انداز سے اپنا فریضہ ادا کرے، تاکہ موجودہ دنیا نے بشریت جو قرآن و عترت کے صاف و شفاف معارف کی پیاسی ہے زیادہ سے زیادہ عشق و مغویت سے سرشار اسلام کے اس مکتب عرفان و ولایت سے سیراب ہو سکے، ہمیں یقین ہے عقل و خرد پر استوار ماہرانہ انداز میں اگر اہل بیت عصمت و طہارت کی ثقافت کو عام کیا جائے اور حریت و بیداری کے علمبردار خاندان نبوت رسالت کی جاوداں میراث اپنے صحیح خدو خال میں دنیا تک پہنچا دی جائے تو اخلاق و انسانیت کے دشمن،

انانیت کے شکار، سامراجی خوں خواروں کی نام نہاد تہذیب و ثقافت اور عصر حاضر کی ترقی یافتہ جہالت سے بھکی ماندی آدمیت کو امن و نجات کی دعوتوں کے ذریعہ امام عصر (عج) کی عالمی حکومت کے استقبال کے لئے تیار کیا جاسکتا ہے۔ ہم اس راہ میں تمام علمی و تحقیقی کوششوں کے لئے محققین و مصنفین کے شکر گزار ہیں اور خود کو مؤلفین و مترجمین کا ادنیٰ خدمتگار تصور کرتے ہیں، زیر نظر کتاب، مکتب اہل بیت علیہم السلام کی ترویج و اشاعت کے اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے، آیت اللہ مصباح یزدی کی گرانقدر کتاب درس عقائد کو مولانا ضمیر حسین نے اردو زبان میں اپنے ترجمہ سے آراستہ کیا ہے جس کے لئے ہم دونوں کے شکر گزار ہیں اور مزید توفیقات کے آرزو مند ہیں، اسی منزل میں ہم اپنے تمام دوستوں اور معاونین کا بھی صمیم قلب سے شکریہ ادا کرتے ہیں کہ جنہوں نے اس کتاب کے منظر عام تک آنے میں کسی بھی عنوان سے زحمت اٹھائی ہے، خدا کرے کہ ثقافتی میدان میں یہ ادنیٰ جہاد رضائے مولیٰ کا باعث قرار پائے۔

والسلام مع الاکرام

مدیر امور ثقافت، مجمع جهانی اہل بیت علیہم السلام

بسم اللہ الرحمن الرحیم

پیش لفظ

تمام حمد و ثنا اس خدا کے لئے ہے جس نے اس عالم ہستی کو وجود بخشا، اور انسانوں کی ہدایت کے لئے پے در پے انبیاء کو مبعوث فرمایا، تاکہ انسانوں کے مختار ہوتے ہوئے انہیں انتہائی کمال تک پہنچا دیں تاکہ ان کا شمار اشرف المخلوقات میں ہو جائے، انسان کے انتہائی کمال تک پہنچنے میں صحیح عقائد کا بہت بڑا عمل و دخل ہے جب تک انسان کے عقائد صحیح نہ ہوں، اس وقت تک انتہائی کمال تک پہنچنا ناممکن ہے اور اسلام کے دشمن ہمیشہ اس بات پر اپنی پوری توانائیاں صرف کرتے چلے آ رہے ہیں تاکہ مسلمانوں میں فاسد عقائد رائج کر کے ان کے درمیان پھوٹ ڈال دیں اور انہیں صراط المستقیم سے منحرف کر کے رہ گمراہی پر لگا دیں۔ افسوس کا مقام ہے بڑے بڑے دانشمند بھی فاسد عقائد کے سیلاب میں بہتے ہوئے نظر آتے ہیں، یہاں تک کہ بعض تو خدا اور اس کے مبعوث کئے ہوئے رسولوں کے متعلق شک و تردید میں پڑ کر افراط و تفریط کا شکار ہو گئے، بعض کو خدا کا بیٹا اور بعض کو بالکل اپنے جیسا بلکہ اس سے بھی بدتر، بعض پیغمبروں کی طرف گناہان کیمرہ کی نسبت دے کر ان کے قتل پر آمادہ ہو گئے تاکہ اپنے باطل عقائد اور خود ساختہ خداؤں کا دفاع کر سکیں اور اپنے باطل عقائد کا علم ہوتے ہوئے بھی اس پر ڈٹے رہے چونکہ اگر وہ پیغمبر برحق کو تسلیم کر لیتے تو ان کی شرت، سلطنت و ریاست خطرے میں پڑ جاتی۔

لہذا انہوں نے دنیا کی لالچ میں آکر اپنی آخرت کو تباہ و برباد کر کے ہمیشہ اپنے لئے جہنم کے دردناک عذاب کو خرید لیا اور دنیا کی چند روزہ فانی زندگی کو آخرت کی ابدی زندگی پر ترجیح دے دی زیر نظر کتاب ان صحیح عقائد پر مشتمل ہے جو ہادیان برحق کی زبانوں سے بیان ہوئے ہیں جن پر عمل کر کے انسان دنیا و آخرت کی سعادتیں حاصل کر سکتا ہے۔ اس کتاب کے مؤلف حضرت آیت اللہ مصباح یزدی دامت برکاتہ کسی تعارف کے محتاج نہیں ہیں، آپ کا شمار عصر حاضر کے بزرگترین دانشمندوں میں ہوتا ہے، علم منطق، فلسفہ و کلام، میں آپ کا چرچا ہر عام و خاص پر عیاں ہے۔ میں نے ان کی اس کتاب کو اردو داں حضرات کے لئے مناسب سمجھ کر اردو کے قالب میں ڈھالنے کی کوشش کی ہے، تاکہ صحیح عقائد کے متلاشی حضرات ان پر عمل کرتے ہوئے دنیا و آخرت کی سعادتیں حاصل کر سکیں۔ اگرچہ اس کتاب میں علمی اصطلاحات زیادہ استعمال ہوئیں ہیں تاہم میں نے ان کو آسان لفظوں میں بیان کرنے کی کوشش کی ہے تاکہ تمام قارئین حضرات بصورت احسن متفیض ہو سکیں۔ آخر میں قارئین گرامی سے گزارش ہے کہ جہاں کہیں غلطی کا شائبہ ملاحظہ فرمائیں تو بطور اصلاح ہمیں مطلع فرمائیں تاکہ آئندہ ایڈیشن میں اصلاح ہو سکے۔

آپ کی دعاؤں کا طالب

ضمیر حسین

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد لله رب العالمين والصلوة والسلام على خير خلقه محمد وآله الطاهرين لاسيما بقيّة الله في الارضين عجل الله تعالى فرجه وجعلنا من اعوانه و
انصاره.

بنیادی عقائد و افکار

ہر بار ارزش اور اجتماعی و سیاسی نظام کی بنیاد پر ہوتے ہیں، یہ عقائد انسانی کردار و اخلاق کو سوار نے میں، سو فیصد یا اس سے کمتر اثر
انداز ہوتے ہیں، اسی وجہ سے اسلام کے بار ارزش نظام کی بنیادوں کو مستحکم کرنے کے لئے اس درخت کے ریشوں یعنی نظام عقیدتی
کو دلوں میں استوار کرنا ہوگا، تاکہ ہمیشہ مثبت نتائج حاصل ہو سکیں، اور دو جہاں کی کامیابی نصیب ہو سکے۔ اسی وجہ سے اسلامی مفکرین
نے آغاز اسلام سے اسلامی عقائد کو مختلف اسلوب اور شکل و صورت میں بیان کیا اور منجملہ علماء کلام نے اس سلسلہ میں مختلف
کتبیں لکھیں، اس دور میں بھی نئے شکوک و شبہات کے پیدا ہونے کی وجہ سے مختلف کتبیں معرض وجود میں آئیں۔

لیکن غالباً یہ کتابیں دو مختلف اور متفاوت سطح پر لکھیں گئیں ہیں، ان کتابوں کی ایک قسم نہایت سادہ اور زیادہ سے زیادہ توضیحات پر
مشتمل ہے اور دوسری قسم پیچیدہ اصطلاحات، سخت بیانات اور سنگین عبارتوں پر مشتمل ہے، لیکن اس کے درمیان ایسی کتابیں جو متوسط
درجہ کی اور قابل تدریس ہوں، نہیں ہیں اسی وجہ سے دینی مدارس میں برسوں سے ایسی کتابوں کی کمی کا احساس کیا جاتا رہا ہے۔

اسی وجہ سے سازمان تبلیغات اسلامی کے ذمہ دار افراد اور ادارہ در راہ حق کے فضلا اور علما کی مدد سے اس کتاب کو مرتب کیا گیا ہے، جسکی چند خصوصیات درج ذیل میں۔ ۱۔ اس کتاب میں اس بات کی کوشش کی گئی ہے کہ مطالب منطقی ترتیب پر منظم ہوں اور تا حد امکان مسائل کو بیان کرنے کے دوران آئندہ کے حوالہ جات سے پرہیز کیا جائے۔

۲۔ عبارتوں کو آسان اور سادہ کرنے کے لئے نہایت کوشش کی گئی ہے، پیچیدہ اصطلاحات اور دشوار عبارتوں سے پوری طرح پرہیز کیا گیا ہے لہذا مطلب کو واضح کرنے کے لئے ادبی عبارتوں کو ترک کر دیا گیا ہے۔

۳۔ مطالب کو ثابت کرنے کے لئے روشن دلائل اور محکم تعاییر کا استعمال کیا گیا ہے متعدد اور ست دلائل سے پرہیز کیا گیا ہے۔

۴۔ مطالب کی توضیح میں زائد وضاحت کو پڑھنے والوں کی طبیعت کے خستہ حال نہ ہونے کا خاص خیال رکھا گیا ہے

۵۔ چونکہ یہ کتاب متوسط سطح کے لوگوں کے لئے لکھی گئی ہے لہذا ایسے عمیق استدالات کہ جسے سمجھنے کے لئے فلسفہ، تفسیر یا فقہ الحدیث جیسے علوم سے آشنائی کی ضرورت ہے پرہیز کیا گیا ہے لیکن جہاں کہیں ایسے استدالات کی ضرورت پڑی وہاں صرف اختصار کے ساتھ سادے لفظوں میں وضاحت کر دی گئی ہے اور کامل استدلال کے لئے فقط دوسری کتابوں کے حوالے پر اکتفا کیا گیا ہے تاکہ پڑھنے والوں میں جستجو و تحقیق کی انگ جاکتی رہے۔

۶۔ اس کتاب کے مطالب کو دروس کی شکل میں تقسیم اور متوسط تھا ایک جلسہ (درس) کے برابر ذکر کیا گیا ہے۔

۷۔ بعض دروس کے مہم مطالب کی دوسرے دروس میں کیداً تکرار کی گئی ہے تاکہ پڑھنے والے اچھی طرح سمجھ سکیں۔

۸۔ ہر درس کے آخر میں اسی درس سے مربوط سوالات درج کئے گئے ہیں جو درس کی تفہیم اور اسے پوری طرح سمجھنے میں نہایت

مفید و مددگار ثابت ہوتے ہیں۔

۹۔ لیکن جو بات مسلم ہے وہ یہ کہ مذکورہ کتاب بھی ضعف سے خالی نہیں ہوگی لہذا امید ہے کہ اساتذہ محترم اپنی تنقیدات کے ذریعہ جاری مدد کریں تاکہ آئندہ طبع میں اس کا خیال رکھا جاسکے، اس کے ساتھ ساتھ حضرت ولی عصر ارواحنا لہ الفداء کی بارگاہ میں یہ درخواست ہے کہ حقیر کی اس ناہیض خدمت کو شرف قبولیت عطاء ہو اور اس طرح سے حوزہ علمیہ اور شہداء والا مقام کے حقوق میں سے ایک حق ادا ہو جائے۔

قم محمد تقی مصباح یزدی۔

پہلا درس

دین کیا ہے؟

دین کا مفہوم

اس کتاب کا ہدف عقائد اسلامی کا بیان کرنا ہے جسے اصول دین کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، لہذا کسی بھی وضاحت سے پہلے مناسب یہ ہے کہ کلمہ ”دین“ اور اس سے مشابہ الفاظ کی ایک وضاحت کر دی جائے، اس لئے کہ علم منطق میں ”مبادی تصوری“ (تعریفات) کا مقام تمام مطالب پر مقدم ہے۔ دین ایک عربی کلمہ ہے جس کے معنی لغت میں اطاعت اور جزا کے ہیں اور اصطلاح میں اس جہان، انسان کے پیدا کرنے والے پر عقیدہ رکھنا اور ان عقائد سے مناسب دستورات عملی پر اعتقاد رکھنے کے معنی میں ہے، اسی وجہ سے وہ لوگ جو اس جہان کے خالق پر مطلق اعتقاد نہیں رکھتے اور اس جہان کی خلقت کو اتفاقی حادثہ یا مادی و طبعی فعل و انفعالات کا نتیجہ سمجھتے ہیں انہیں ”بے دین“ کہا جاتا ہے۔

لیکن وہ لوگ جو اس جہان کے خالق پر اعتقاد رکھتے ہیں، مگر اپنے اعمال و کردار میں انحراف و کج روی کے ٹھکار میں انہیں ”بادین“ کہا جاتا ہے، اس طرح روئے زمین پر موجودہ ادیان حق و باطل میں تقسیم کئے جاتے ہیں، لہذا دین حق یعنی ایسے قوانین کا مجموعہ جو صحیح عقائد پر مشتمل اور واقعیت کے مطابق ہوں نیز ایسے اعمال کا حکم دے کہ جن کی صحت میں کافی ضمانت پائی جاتی ہو۔

۲۔ اصول دین اور فروع دین گذشتہ مفہوم دین کی توضیحات کے پیش نظریہ بات روشن ہو گئی کہ کوئی بھی دین ہو دو حصوں میں تقسیم ہوتا ہے۔ ۱۔ عقائد: جو پایہ و اساس کے حکم میں ہیں۔

۲۔ قوانین عملی: جو انھیں اساس کے مطابق اور انھیں کے ذریعہ وجود میں آئے ہوں۔ لہذا یہ بات پوری طرح روشن ہے کہ کسی بھی دین میں اس کے عقائد کو ”اصول“ اور احکام عملی کو (فروع) کا نام دیا جاتا ہے جیسا کہ اسلامی دانشمندیوں نے ان دو اصطلاحوں کو عقائد اور احکام اسلامی کے لئے استعمال کیا ہے۔

۳۔ جہاں بینی (تصور خلقت) اور آئیڈیالوجی۔ جہاں بینی اور آئیڈیالوجی کی اصطلاح کم و بیش ایک ہی معنی میں استعمال ہوتی ہے، جہاں بینی کے معنی یہ ہیں (جہاں و انسان کے مطابق چند اعتقادات اور بطور کلی ہستی) اور آئیڈیالوجی کے معنی یہ ہیں (انسانی کردار سے مطابق چند کلی نظریات اور آراء)۔ ان دونوں معنی کو ملحوظ رکھتے ہوئے، کسی بھی عقیدتی اور اصولی نظام کو اس دین کی جہاں بینی اور اس کے احکام عملی کے نظام کو آئیڈیالوژی کا نام اور انھیں دین کے اصول و فروع پر تطبیق دی جاتی ہے، لیکن یہ نکتہ پیش نظر رہے کہ آئیڈیالوجی کی اصطلاح احکام جزئی کو شامل نہیں ہوتی جس طرح کہ جہاں بینی کی اصطلاح بھی جزئی اعتقادات کے لئے استعمال نہیں ہوتی۔ ایک دوسرا نکتہ کہ جس کی طرف توجہ ضروری ہے وہ یہ ہے کہ کلمہ آئیڈیالوجی عام معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے، کہ جو جہاں بینی کو بھی شامل ہوتا ہے۔

۴۔ الہی و مادی جہاں بینی۔ انسانوں کے درمیان جہاں بینی کی مختلف قسمیں پائی جاتی ہیں لیکن ان سب کو ماوراء طبعیت کے قبول یا اسے انکار کرنے کی بنیاد پر دو حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے، الہی جہاں بینی، اور مادی جہاں بینی۔ گذشتہ ادوار میں مادی جہاں بینی کے پیروکاروں کو کبھی ۲۴۹۲۴۹ طبعی، اور ”دہریہ“ اور کبھی ۲۴۹۲۴۹ زندہ، اور ”ملحد“ کے نام سے یاد کیا جاتا تھا، لیکن انھیں ہمارے زمانہ میں ”مادی“ اور ”ماٹریالیٹ“ کہا جاتا ہے، مادی گری کی بھی مختلف شاخیں ہیں، جس میں سے مشہور ترین (مٹریلزم

^۱ جہاں بینی اور آئیڈیالوجی کے سلسلہ میں زیادہ معلومات کے لئے رجوع کیا جائے، کتاب کا نام آئیڈیالوجی تطبیقی، درس اول۔

ڈیالٹیک ہے کہ جو (مارکسزم) کا ایک حصہ ہے۔ اس ضمن میں یہ بھی روشن ہو گیا کہ ”جہان بینی“ کا استعمال دینی عقائد سے بھی زیادہ وسیع ہے اس لئے کہ یہ احادی عقائد کو بھی شامل ہے جیسا کہ آئیڈیالوجی کی اصطلاح بھی دینی مجموعہ احکام سے مخصوص نہیں ہے۔

۵۔ آسمانی ادیان اور ان کے اصول۔ تاریخ ادیان، جامعہ شناسی اور عوام شناسی کے دانشمندیوں کے درمیان پیدائش ادیان کی کیفیت کے سلسلہ میں اختلاف ہے، لیکن اسلامی اسناد کے ذریعہ جو کچھ سمجھ میں آتا ہے وہ یہ ہے کہ دین کا وجود انسان کی پیدائش کے ساتھ ہوا اور پہلے انسان (حضرت آدم ابو البشر) خدا کے رسول، توحید و یکتا پرستی کے منادی تھے، اور بقیہ شرک آلود ادیان تحریفاتہ سلیقوں کے اختلاف، فردی اور گروہی اغراض کی وجہ سے وجود میں آئے ہیں^۱۔ ا۔ خدائے یکتا پر اعتقاد۔

۲۔ عالم آخرت میں ہر انسان کے لئے ابدی حیات اور جو کچھ اس جہان میں انجام دیا گیا ہے اس کی جزا یا سزا کا پانا۔

۳۔ بعثت انبیاء پر اعتقاد رکھنا تاکہ بشر کو انتہائی کمال اور سعادت دنیوی و اخروی کی طرف ہدایت مل سکے یہ تینوں اصول دراصل ان سوالوں کے جواب میں جو ہر ایک آگاہ انسان کے لئے پیش آئے ہیں، ہستی کا مبدا اور آغاز کیا ہے؟ زندگی کا خاتمہ کیا ہے؟ کس روش کے ذریعہ اچھی زندگی گزارنے کا طریقہ حاصل کیا جاسکتا ہے، وحی کے ذریعہ جو دستور العمل پیش کیا جاتا ہے وہ وہی دینی آئیڈیالوجی ہے جو الہی جہان بینی کا نتیجہ ہے۔ اصلی عقائد لازم و ملزوم اور توالیع و تفاسیل سے متصف ہیں جو دینی عقیدتی نظام کو تشکیل دیتے ہیں انھیں اعتقادات میں اختلاف مختلف مذاہب اور فرقوں کی پیدائش کا سبب واقع ہوئے ہیں جیسا کہ بعض انبیاء کی نبوت اور آسمانی کتب کے تعین میں اختلاف ادیان یہودی، مسیحی اور اسلام کے درمیان تفرقہ کا باعث بنا اور اسی اختلاف کی وجہ سے عقائد و اعمال میں ایسے اختلافات اٹھے کہ جو کسی طرح بنیادی اعتقاد سے ہانگی نہیں رکھتے جیسے عقیدہ تثلیث جو توحید کے بالکل ضد ہے، اگرچہ مسیحیوں نے اس کی توجیہ کرنے کی پوری کوشش کر ڈالی ہے، یا پھر تعین جانشینی پیغمبر ﷺ کا مسئلہ کہ اسے خدا انتخاب کرے یا عوام

^۱ بعض آسمانی ادیان میں جباروں اور ستمگروں کی رضایت حاصل کرنے کے لئے بعض تحریفات کچھ اس طرح ہیں کہ، دین کے دائرے کو خدا کے ساتھ انسان کے رابطہ میں محدود اور احکام دین کو خاص مذہبی مراسم سے مخصوص، سماج کی سیاست اور اس کے امور کو دائرہ دین سے خارج کر دیا گیا ہے جبکہ ہر دین آسمانی معاشرہ کی تمام ضرورتوں کو ہر طرف کرنے کا ذمہ دار ہوتا ہے ادیان توحیدی ہی ادیان آسمانی ہیں، جو تین کلی اصول میں مشترک ہیں۔

الانس جو شیعہ اور سنی گروہوں میں شدید اختلاف کا باعث ہوا۔ تاکہ دنیوی و اخروی سعادت حاصل ہو سکے جنہیں سمجھنے کے لئے عام انسانوں کی عقلیں ناکافی ہیں، اس مطلب کی توضیح انشاء اللہ آئندہ آئے گی، اور خدا کی جانب سے مبعوث ہونے والے آخری پیغمبر ﷺ واجب ہے کہ وہ قیامت تک کے وہ تمام دستورات جو انسانوں کے لئے ضروری ہیں بیان کریں، اس وجہ سے اسلامی تعلیمات میں اجتماعی و سیاسی اور اقتصادی تعلیمات کا ایک بڑا حصہ موجود ہے۔

نتیجہ

توحید و نبوت اور معاد کو تمام آسمانی ادیان میں اساسی عقائد میں سے شمار کیا گیا ہے، لیکن وہ عقائد جو اساسی عقائد کے تجربہ و تحلیل کے ذریعہ حاصل ہوئے ہیں، یا انہیں کا ایک حصہ ہیں، ایک خاص اصطلاح کے مطابق انہیں اصلی عقائد میں شمار کیا جاسکتا ہے، جیسے وجود خدا کے اعتقاد کو ایک اصل اور اس کی وحدت کے اعتقاد کو ایک دوسری اصل مان لیا جائے، یا رسول اللہ ﷺ کی نبوت پر اعتقاد اصول دین کا ایک حصہ ہے، جیسا کہ شیعہ دانشمندیوں نے عدل جو ایک فرعی مسئلہ ہے اسے اصول کا جز قرار دیا ہے یا امامت جو نبوت کی تابع ہے ایک دوسری اصل کے عنوان سے ذکر کیا ہے، درحقیقت کلمہ اصل کا استعمال ایسے اعتقادات کے سلسلہ میں اصطلاح کے تابع ہے اور یہ کسی بھی قسم کے مناقشہ اور بحث کا مقام نہیں ہے۔

اسی وجہ سے کلمہ اصول دین کو دو معنی عام و خاص میں استعمال کیا جاسکتا ہے، اس کی عام اصطلاح فروع دین اور بعض احکام کے مقابلہ میں بولی جاتی ہے، اور اس کی خاص اصطلاح بنیادی ترین عقائد سے مخصوص ہے، اسی طرح آسمانی ادیان کے درمیان مشترک عقائد جیسے اصول سہ گانہ (توحید، نبوت اور معاد) بطور مطلق (اصول دین) اور ان کے علاوہ چند اصل کے اضافہ کے ساتھ (اصول دین خاص) یا پھر ایک چند وہ اعتقادات جو کسی مذہب یا فرقہ کی پہچان ہیں، اضافہ کر کے (اصول دین و مذاہب) یا (ایک مذہب کے اصول عقائد) کا حصہ شمار کئے جاسکتے ہیں۔

سوالات

۱۔ دین کے لغوی اور اصطلاحی مفہیم کو بیان کریں؟ ۲۔ جہان بینی اور آئیڈیالوجی کی تعریف کے علاوہ ان دونوں کے فرق کو واضح کریں؟

۳۔ جہان بینی کی دو مہم کی وضاحت کریں؟

۴۔ اصول دین کی دو عام و خاص اصطلاحیں میں اس کی وضاحت کریں؟

۵۔ آسمانی ادیان میں مشترک اصول کیا ہیں، اور ان کی اہمیت کی وجہ کیا ہے؟

دوسرا درس

دین میں تحقیق

تحقیق کے عوامل

انسان کی نفسانی (روحانی و معنوی) خصوصیات میں سے ایک خاصیت حقائق اور واقعات کا پتہ لگانا ہے جو ہر انسان میں آغاز ولادت سے پایا جاتا ہے، اور عمر کی آخری سانوں تک یہ غریزہ فطری باقی رہتا ہے، یہی حقیقت جوئی کی فطرت جسے ”حس کجگاہی“ بھی کہا جاتا ہے انسان کو دین کے دائرے میں موجودہ مسائل کے سلسلہ میں تحقیق و جستجو اور دین حق کی شناخت کے لئے آمادہ کرتی ہے، جیسے کیا غیر مادی اور غیر محسوس شے (غیب) کا وجود ہے؟ اور اگر ایسا کچھ ہے تو پھر کیا جہان مادی و محسوس اور جہان غیب میں کوئی ربط ہے؟ اور اگر ان دونوں میں ربط ہے تو پھر کیا کوئی نامحسوس موجود ہے جو اس جہان مادی کا خالق ہو؟ کیا انسان کا وجود اسی مادی بدن میں منحصر ہے؟ اور اس کی حیات صرف اسی دنیا سے مخصوص ہے یا اس دنیوی زندگی کے علاوہ کوئی اور زندگی ہے؟ اور اگر انسان کے لئے ایک دوسری زندگی آخرت ہے تو کیا اس دنیاوی زندگی اور اس آخرت میں کوئی ربط ہے یا نہیں؟

اور اگر کوئی ربط ہے تو پھر امور دنیوی میں کون سے امور آخرت کی زندگی میں مؤثر ہیں؟

اور کون سا راستہ زندگی کو صحیح گزارنے کے طور طریقہ کی پہچان کے لئے ہے؟ ایسا طور طریقہ جو دنیا و آخرت میں انسان کی سعادت کی ضمانت دے؟ اور وہ طور طریقہ کیا ہے؟ پس حقیقت جوئی کی فطرت وہ اولین عامل ہے جو انسان کو مسائل کی جستجو منجملہ دینی مسائل اور دین حق کو پہچاننے کے لئے ابھارتی ہے۔

حقیقت کی شناخت کے لئے انسانی فطرت میں جو عوامل جوش و ولولہ کا سبب بنتے ہیں ان میں سے ایک ان تمام آرزؤں کو حاصل کرنا ہے جو ایک یا چند فطرتوں (حقائق کی شناخت کے علاوہ) سے متعلق اور کسی خاص معلومات پر منحصر ہیں، جیسے کہ مختلف دنیوی نعمتوں سے بہرہ مند ہونا، علمی کوششوں کا نتیجہ ہے اور علوم تجربی کی کامیابیاں انسانوں کے لئے اپنی آرزؤں کے حصول میں نہایت مددگار ہیں، اسی طرح اگر دین، انسان کے منف و مصالح اور اس کی آرزؤں کو پورا کر دے، اور برے کاموں سے اسے روک دے تو یہ امر اس کے لئے نہایت مطلوب ہوگا، لہذا منفعت طلبی کی حس اور نقصان سے بچنے کی فطرت دین میں اور زیادہ تحقیق و جستجو کی انگ کو افزائش دینے کا سبب ہے۔

لیکن معلومات میں وسعت پیدا کرنے کے لئے اور تمام حقائق کو درک کرنے کے لئے کافی وسائل کا ہونا ضروری ہے، یہ ممکن ہے کہ انسان تحقیق کے لئے ایسے مسائل کا انتخاب کرے کہ جنہیں حل کرنا آسان سہل الوصول اور محسوس ہو لیکن دینی مسائل کی جستجو سے صرف اس بنا پر پرہیز کرتا رہے کہ ان کا حل کرنا مشکل اور کسی اہم علمی نتائج تک پہنچنا ممکن نہیں ہے، اس وجہ سے یہ امر ضروری ہے کہ لوگوں کے لئے یہ حقیقت روشن ہو جائے کہ دینی مسائل کافی اہمیت کے حامل ہیں اور ان مسائل میں تحقیق و جستجو بقیہ مسائل کی جستجو سے کمالاً متفاوت ہے۔ بعض ماہرین نفسیات کا عقیدہ ہے کہ اساساً خدا پرستی ایک متعل آرزو ہے، جس کے سرچشمہ کو ”حس دینی“ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے اور اسے حس جستجو، حس نیکی اور حس زیبائی (خوبصورتی) میں انسانی روح کے لئے چوتھا پہلو شمار کیا جاتا ہے۔

ان لوگوں نے تاریخی شواہد کی رو سے یہ امر ثابت کیا ہے کہ خدا پرستی کی حس ہر زمانہ میں مختلف شکلوں میں رہی ہے لہذا اس حس کا ہمیشگی اور اس طرح وسیع ہونا اس کے فطری ہونے کی دلیل ہے۔ البتہ اس فطرت کے عمومی ہونے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ یہ تمام انسانوں میں زندہ و بیدار بھی ہو اور اسے مطلوب کی جانب براگنختہ کرنے میں مدد بھی کرے، بلکہ صحیح تربیت کے نہ ہونے اور فاسد معاشرہ کے پائے جانے کی وجہ سے اس کی دوستی بہت ضعیف پڑ گئی ہو یا اسے اپنی صحیح مسیر پر حرکت کرنے سے منحرف کر

دے، جیسا کہ بقیہ تمام فطرتوں میں ضعف اور انحراف کا امکان ہے۔ اس نظریہ کے تحت دین میں تحقیق و جستجو ایک مشعل فطرت ہے، دلائل اور برہان کے ذریعہ اسے ثابت کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے اس مطلب کو آیات و روایات کے ذریعہ مورد تائید قرار دیا جاسکتا ہے کہ جو دین کے فطری ہونے پر دلالت کرتی ہیں، لیکن چونکہ اس میل فطری کی تاثیر آشکار نہیں ہے لہذا کوئی بحث و مباحثہ کے دوران اپنے موقف کی تائید میں اس کے وجود کا منکر ہو سکتا ہے اسی وجہ سے ہم تنہا اسی بیان پر اکتفا نہیں کریں گے بلکہ عقلی دلائل کے ذریعہ اس حقیقت کو ثابت کریں گے۔

دین میں تحقیق

یہ حقیقت روشن ہو چکی ہے کہ ایک طرف حقائق کی شناخت کا فطری رجحان اور دوسری طرف حصول منفعت و مصلحت اور خطرات سے بچنے کی فطری خواہش ایک ایسا طاقتور عامل ہے جو تفکر و تحقیق اور علوم کی تحصیل میں نہایت مددگار ہے یہی وجہ ہے جب کسی شخص کو اس بات کا احساس ہو جاتا ہے کہ طول تاریخ میں بعض انسانوں نے یہ دعویٰ کیا کہ ہم پروردگار کی طرف سے انسانوں کو دو جہان کی سعادت تک پہنچانے کے لئے مبعوث ہوئے ہیں، جنہوں نے اپنے پیغامات کے ابلاغ اور انسانوں کی ہدایت کے لئے کسی بھی قسم کی زحمت اٹھانے سے دریغ نہیں کیا، اور تمام سختیوں کو اپنے لئے خیر و حتیٰ کہ اپنی جانوں کو بھی اس ہدف کے تحت قربان کر دیا، تو اس کے اندر دین میں تحقیق و جستجو کی ایک عجیب سی امنگ پیدا ہوتی ہے، اور وہ یہ جاننے کی کوشش کرتا ہے کہ کیا ان لوگوں نے جو دعویٰ کیا تھا کیا ان کا یہ دعویٰ درست اور منطقی دلائل کی رو سے صحیح تھا یا نہیں،

خصوصاً یہ جربہ بیداری اس وقت اور بڑھ جاتی ہے جب انہیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان لوگوں نے حیات جاودانی اور نعمت و سعادت کی بشارت دی ہے، عذاب دائمی اور ابدی شقاوت سے ڈرایا ہے، یعنی ان کی دعوت کو قبول کر لینا فراوان نعمتوں کے حصول کا موجب اور اس سے انکار کرنا دائمی خسران کا سبب ہے، ان سب حقائق کے جاننے کے بعد کون شخص دین سے غفلت کے لئے عذر پیش کر سکتا ہے اور دین کے سلسلہ میں تحقیق و جستجو سے منہ پھیر سکتا ہے؟ ہاں! ممکن ہے کہ بعض اشخاص آرام طلب

اور کاہل ہونے کی وجہ سے یہ تحقیق انجام نہ دیں یا پھر دین کے قبول کر لینے کے بعد اس کی پابندیوں اور بعض نفسانی خواہشوں پر روک لگ جانے کی وجہ سے دین میں جستجو کرنے سے پرہیز کریں۔ لیکن ایسے اشخاص کو اپنی آرام طلب طبیعت کی سزا بھگتنا ہوگی، اور عذاب ابدی میں گرفتار ہونا ہوگا ایسے لوگوں کی حالت ان بچوں سے بھی بدتر ہے جو دواؤں کی تمنی کی وجہ سے ڈاکٹروں کے پاس جانے سے کتراتے ہیں اور اپنے لئے حتی موت کو دعوت دے دیتے ہیں، اس لئے کہ یہ بچے اپنے فائدہ و نقصان کو سمجھنے کے سلسلہ میں کافی عقل و شعور نہیں رکھتے ڈاکٹر کی ہدایتوں سے مخالفت دنیا کی چند روزہ نعمتوں سے محرومی سے زیادہ نہیں ہے لیکن ایک بالغ انسان، سود و زیاں کو درک کرنے اور جلد ختم ہو جانے والی نعمتوں کے سلسلہ میں غور و فکر کی صلاحیت کا حامل ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے قرآن نے اپنے غافل انسانوں کو حیوانات سے بھی زیادہ گمراہ جانا ہے۔ (اول عک کا لانعام بل ہم اضل، اول عک ہم الغفلون^۱) یہ لوگ گویا جانور میں بلکہ ان سے بھی کہیں گئے گزرے، یہی لوگ (امور حق سے) بالکل بے خبر ہیں۔

ایک اور مقام پر حیوانات سے بدتر کہا ہے۔ (ان شر الذوات عند اللہ الصم البکم الذین لا یعقلون^۲) اس میں شک نہیں کہ زمین پر چلنے والے تمام حیوانات سے بدتر خدا کے نزدیک وہ بہرہ گوئے (کفار) ہیں جو کچھ نہیں سمجھتے۔

ایک شبہ کا حل

اس مقام پر شاید کوئی شخص اپنے لئے یہ بہانا نہ پیش کرے کہ ایک مسئلہ کے تحت تھا اسی صورت میں تحقیق و جستجو مفید ہے کہ جب اس کے حل کی امید ہو لیکن ہم دین اور اس کے مسائل کے سلسلہ میں ایسی فکر کے مالک نہیں ہیں، اسی وجہ سے اپنی طاقت کو ایسے امور میں صرف کرنے کی بجائے کیوں نہ ایسے موارد میں صرف کریں جس میں زیادہ سے زیادہ نتیجہ برآمد ہونے کی توقع ہو، ایسے شخص کا جواب اس طرح دیں گے۔ سب سے پہلے یہ کہ: دین کے اساسی مسائل کو حل کرنا کسی بھی صورت میں علمی مسائل کے حل کرنے

^۱ ”بل یرید الانسان لیفجر امامہ“۔ سورۃ قیامت۔ آیت ۵/ ترجمہ: مگر انسان تو یہ چاہتا ہے کہ اپنے آگے بھی (ہمیشہ) برائی کرتا جائے

^۲ سورۃ اعراف۔ آیت/ ۱۷۹۔ وہ لوگ جو پائے بلکہ ان سے بھی زیادہ گمراہ ہیں۔

^۳ سورۃ انفال۔ آیت/ ۲۲۔ وہ لوگ تمام حیوانات سے بدتر خدا کے نزدیک وہ بہرے گونگے کفار ہیں جو حقائق کو درک نہیں کرتے۔

سے کم نہیں ہے اور اس بات کو ہم بخوبی جانتے ہیں کہ بعض مشکل مسائل کا حل دانشمندوں کے سالہا سال کی زحماتوں کا نتیجہ ہے۔ دوسرا یہ کہ: احتمال کی قدر و قیمت تھا ایک عامل کے تابع (مقدار احتمال) نہیں ہے، بلکہ اس درمیان متعل کی مقدار کو بھی جاننا ہوگا، مثلاً اگر ایک اقتصادی تجارت میں منفعت ۵٪ اور دوسری تجارتوں میں ۱۰٪ ہو لیکن اگر پہلی والی تجارت میں متعل کی منفعت ایک ہزار روپیہ اور دوسری تجارت میں ایک لاکھ روپیہ ہو تو پھر پہلی تجارت پانچ گونہ دوسری تجارت پر فوقیت رکھتی ہے اگرچہ پہلی تجارت میں مقدار احتمال ۵٪ فیصد جو دوسری تجارت کی مقدار احتمال ۱۰٪ کا نصف ہے۔ چونکہ دین میں تحقیق کی منفعت کا احتمال بے شمار ہے ہر چند قطعی نتیجہ ہے کہ دستیابی کا احتمال ضعیف ہو، لیکن اس راہ میں تحقیق اور کوشش ہر اس راہ سے زیادہ ہے جس میں نتیجہ محدود ہو، اور تنہا اسی صورت میں دینی مسائل میں ترک تحقیق قابل قبول ہے کہ جب انسان کو یہ یقین ہو جائے کہ دین غیر درست اور اس کے مسائل قابل حل نہیں ہیں، لیکن ایسا یقین و اطمینان کہاں سے حاصل ہو سکتا ہے؟

سوالات

- ۱۔ حقائق کی شناخت کے لئے انسان کا غریزہ کیا ہے؟
- ۲۔ کیوں انسان تمام حقائق کی تحقیق نہیں کرتا؟
- ۳۔ حس دینی کا مطلب کیا ہے؟ اور اس کے وجود کو ثابت کرنے کے لئے کون سی دلیل ذکر کی گئی ہے؟
- ۴۔ اصول دین میں تحقیق کی ضرورت کو بیان کریں؟
- ۵۔ کیا دین کے قطعی مسائل کو حل کرنے کی امید نہ ہونے کو، ترک تحقیق کے لئے عذر بنایا جاسکتا ہے؟

تیسرا درس

انسان بن کے بچنے کی شرط

مقدمہ

گذشتہ درس میں آسان عبارتوں کے ذریعہ دین میں تحقیق اور دین حق کی شناخت کے سلسلہ میں بحث کی گئی کہ یہ امر منفعت جوئی اور ضرر سے بچنے کے لئے ایک فطری عامل ہے جسے ہر انسان اپنے وجود میں پاسکتا ہے یا علم حضوری اس کی تشخیص میں اشتباہ نہیں کر سکتا۔ اس درس میں اسی مطلب کو ایک دوسرے انداز میں ثابت کریں گے، جو دقیق مقدمات پر مشتمل ہے اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اگر کوئی دین کے سلسلہ میں غور و فکر نہ کرے، جان بینی اور صحیح ایسے دین کے سلسلہ میں تحقیق کرنا جو بے نہایت منفعت کی طرف راہنمائی اور عظیم ضرر سے نجات دینے کا مدعی ہے ضروری ہے (تحقق معلول کے لئے علت ناقصہ ضرورت بالقیاس ہے) لیکن منفعت کا حصول اور ضرر سے پرہیز انسان کا فطری مطلوب ہے، لہذا ایسے دین کے سلسلہ میں تحقیق کرنا ضروری ہے۔

یہ استدلال جسے ”قیاس استثنائی“ کی شکل میں بیان کیا گیا ہے عقل کے احکام عملی اور ضرورت بالقیاس کی طرف ان کی بازگشت کے سلسلہ میں ایک خاص منطقی تحلیل ہے جو معلول (نتیجہ مطلوب) تک پہنچنے کے لئے ایک علت (فعل اختیاری) ہے، جیسا کہ اسے بیان کیا جا چکا ہے۔

اس درس میں یعنی مورد بحث دلیل کو اس شکل میں بیان کیا جاسکتا ہے، اگر کمال انسانی تک پہنچنا مطلوب فکری ہو تو اصول جان بینی کی پہچان جو کمال روح کے لئے شرط ہے ضروری ہوگا، لیکن کمال تک پہنچنا مطلوب فطری ہے، لہذا ان اصول کا جاننا ضروری

^۱ اس دلیل کی شکل کچھ اس طرح ہے اگر منفعت کا حصول اور ضرر سے پرہیز انسان کا فطری مطلوب ہے۔

ہے۔ آئیڈیالوجی کا معتقد نہ ہو وہ کمال انسانی کو حاصل نہیں سکتا، بلکہ اسے سرے سے ایک حقیقی انسان نہیں مانا جاسکتا یا دوسری تعبیر کے مطابق انسان بن کے جینے کے لئے جہان بینی اور صحیح آئیڈیالوجی کی ضرورت ہے۔ یہ دلیل تین مقدمات پر مشتمل ہے۔

۱۔ انسان ایک کمال جو (کمال طلب) موجود ہے۔

۲۔ کمال انسانی حکم عقل کی بنیاد پر حاصل ہونے والے اختیاری کردار کے سایہ میں حاصل ہوتا ہے۔

۳۔ عقل کے احکام علی ایک خاص نظری شناخت کے پر تو میں اٹھکار ہوتے ہیں کہ جن میں سے بہترین جہان بینی کے تین اصول ہیں، یعنی مبدا وجود کی شناخت (توحید) حیات کا انجام (معاد) حاصل کرنے کے لئے ضمانت شدہ راستہ (نبوت) یا ہستی کی پہچان انسان کے پہچان اور راہ کی پہچان ہے اب اس کے بعد ان تینوں مقدمات کی وضاحت کے ساتھ بحث کے سلسلہ کو آگے بڑھاتے ہیں۔

انسان کمال طلب ہے

اگر انسان اپنے باطنی اور روحی (معنوی) میلانات میں غور و فکر کرے تو اسے بخوبی معلوم ہوگا کہ یہ سارے تمایلات ایک مخصوص ہدف کی جانب گامزن ہیں، اصولاً کوئی بھی انسان اس بات کو پسند نہیں کرتا، کہ اس کے وجود میں کوئی نقص ہو اور اپنی پوری تاب و توانائی کے ساتھ اپنے ذاتی عیوب و نقائص کو دور کرنے میں لگا رہتا ہے تاکہ اپنے مطلوب ہدف تک پہنچ سکے اور جب تک وہ عیوب دور نہیں ہوتے انھیں لوگوں کی نگاہوں سے مخفی رکھتا ہے۔ یہ میلانات جب اپنی فطرت کے مطابق ہوتے ہیں تو یہی مادی و معنوی بحال (کمال کی طرف جانے) کا ذریعہ بن جاتے ہیں، لیکن اگر اسباب و شرائط کی بنیاد پر یہی میلانات انحرافی مسیر پر گامزن ہو جائیں تو غرور و گھمٹ، ریاکاری اور خود خواہی جیسی بری صفت انسان کے اندر پیدا جاتی ہے، ہر حال کمال طلبی کی صفت ایک

قوی فطرت ہے جو روح انسان میں پائی جاتی ہے، جس کے واضح نمونہ اور آثار بخوبی مشاہدہ کئے جاسکتے ہیں لیکن ایک معمولی توجہ کے ذریعہ معلوم ہو جاتا ہے کہ ان سب کا ریشہ وہی کمال جوئی ہے۔

انسان کا کمال، عقل کی پیروی میں ہے

نباتات کا رشد کرنا خارجی اسباب و شرائط کا نتیجہ اور ایک جبری امر ہے، کوئی بھی درخت اپنے اختیار سے رشد نہیں کرتا، اور اپنی مرضی کے مطابق پھل نہیں دیتا، اس لئے کہ وہ ارادہ اور شعور کا حامل نہیں ہے۔ لیکن جانوروں کے رشد و نمو میں انتخاب کے آثار مشاہدہ کئے جاسکتے ہیں، لیکن یہ ارادہ و انتخاب اپنی طبعی تقاضوں کے مطابق ایک محدود دائرے میں غرائزہ حیوانی کے تحت ہر حیوان کی اپنی حسی قوت کے مطابق ایک محدود شعور کے پر تو میں ہے۔

لیکن انسان کی ذات نباتاتی و حیوانی خواصیات کے حامل ہونے کے علاوہ دور و حافی امتیازی پہلوؤں کا بھی مالک ہے، ایک طرف تو اس کے فطری میلانات اور خواہشات کے لئے کوئی حد مقرر نہیں ہے اور دوسری طرف اس کی قوت عقل کی کمال ہے جس کے ذریعہ وہ اپنی معلومات کو بے نہایت بنا سکتا ہے، ان دونوں خصوصیات کو مد نظر رکھتے ہوئے اس کے ارادوں کی وسعت طبیعت کے حدود سے بھی کہیں زیادہ نظر آتی ہے۔

جس طرح نباتات کے کمالات ایک خاص نباتی طاقت کے ذریعہ حاصل ہوتے ہیں اور حیوانی کمالات انھیں حسی ادراکات کے نتیجہ پائے جانے والے ارادوں کی وجہ سے ہے اسی طرح انسانی کمالات کا سرچشمہ در واقع اس کا روحانی پہلو ہے جو عقل اور ارادوں کے ذریعہ حاصل ہوتے ہیں، وہ عقل کہ جو مطلوب کے مراتب کو پہچان لے اور تزام (اہم اور مکمل سمجھنے کے وقت ان میں سے بہترین کو ترجیح دے۔ لہذا رفتار و کردار کے انسانی ہونے کا مطلب یہ ہے کہ عقل کی راہنمائی میں انسانی میلانات کے ذریعہ وجود میں آنے والے ارادوں کے ذریعہ حاصل ہو اور وہ عمل جو صرف اور صرف حیوانی غرائز کے ذریعہ عمل میں آئے، وہ حیوانی ہے جس

طرح کہ وہ حرکت جو میکینکی طاقت کے ذریعہ انسانی بدن میں پیدا ہوتی ہے وہ ایک فیزیکی (طبعی حرکت ہے۔ عقل کے احکام عملی کو مبنائی نظری کی ضرورت ہے اختیاری عمل ایک ایسا وسیلہ ہے کہ جس کے ذریعہ مطلوب نتیجہ کو حاصل کیا جاسکتا ہے، اور اس کی قدر و قیمت اس کے ہدف کے مطابق ہے جو روح کے کمال (کمال کی طرف جانے) میں اثر انداز ہوتی ہے، لہذا جو عمل بھی کسی روحی کمال کے خاتمہ کا سبب ہے اس کی قدر و قیمت منفی ہوگی۔ لہذا اسی صورت میں عقل، انسان کے اختیاری اعمال پر قضاوت کر سکتی ہے کہ جب انسانی کمالات اور ان کے مراتب سے پوری طرح آگاہ ہو، اور اچھی طرح سے جانتی و پہچانتی ہو کہ انسان کی حقیقت کیا ہے؟ اور اس کی زندگی کی شاعوں کا دائرہ کتنا وسیع ہے؟

اور وہ کمالات کے کتنے مدارج طے کر سکتا ہے؟ یا دوسری تعمیر کے مطابق اس کے وجود کے کتنے پہلو ہیں؟ اور اس کی خلقت کا مقصد و ہدف کیا ہے؟ اسی وجہ سے صحیح آئیڈیالوجی کا حاصل کرنا، یعنی اختیاری اعمال پر ایک پرارزش نظام کا حاکم صحیح جہان بینی اور اس کے مسائل کو حل کرنے کی راہ میں ایک قدم ہے، لہذا جب تک وہ ان مسائل کو حل نہیں کرتا اس وقت تک کردار و اعمال کے سلسلہ میں کوئی قطعی قضاوت نہیں کر سکتا، جس طرح سے کہ جب تک ہدف معلوم نہیں ہوتا اس وقت تک اس ہدف تک جانے والے راستہ کی تعیین غیر ممکن ہے، لہذا یہ معارف نظری جو جہان بینی کے اساسی مسائل کو تشکیل دیتے ہیں حقیقت میں اسے عقل احکام عملی اور بارز نظام کے مبنی میں شمار کیا جاسکتا ہے۔

نتیجہ

ان مقدمات کی تشریح کے بعد اب ہم دین میں تحقیق کی ضرورت، صحیح آئیڈیالوجی اور جہان بینی کو اس طرح ثابت کریں گے۔ انسان اپنی فطرت کی وجہ سے اپنے انسانی کمال کی جستجو میں ہے اور اس کوشش میں ہے کہ کسی نہ کسی طرح اپنے مطلوبہ کمال کو حاصل کر لے، لیکن قبل اس کے کہ وہ ان امور کو پہچانے جو اسے کمال تک پہنچا سکتے ہیں ضروری ہے کہ وہ اپنے انتہائی کمال کو پہچانے، اور اس انتہائی کمال کا جاننا اپنے وجود کی حقیقت اور اس کے آغاز و انجام کے بارے میں اطلاع حاصل کرنے میں ہے اس کے بعد اپنے

کمال کے مختلف مراتب میں مختلف اعمال کے درمیان موجود، رابطہ کے مثبت یا منفی ہونے کو تشخیص دے، تاکہ وہ اس طرح اپنے انسانی کمال کے صحیح راستہ کو پہچان سکے، لہذا جب تک وہ نظری شناخت (اصول جہان بینی) کو حاصل نہیں کرتا اس وقت تک صحیح علمی نظام (آئیڈیالوجی) کو قبول نہیں کر سکتا۔ لہذا دین حق کی معرفت حاصل کرنا جو صحیح جہان بینی اور آئیڈیالوژی کو شامل ہے ضروری ہے اور اس کے بغیر کمال انسانی تک پہنچنا غیر ممکن ہے جیسا کہ وہ رفتار جو ایسے افکار و اقدار کا نتیجہ نہ ہو وہ انسانی نہیں ہو سکتی یا وہ لوگ جو انہیں جاننے کے باوجود انکار کرتے ہیں، تنہا اپنی حیوانی خواہشات اور جلد ختم ہونے والی مادی نعمتوں پر اعتماد کرتے ہیں، ان کی اہمیت اصل میں ایک حیوان سے زیادہ نہیں ہیں، جیسا کہ قرآن کریم فرماتا ہے ”يَتَشَوَّهْنَ وَيَكُلُونَ كَمَا تَأْكُلُ الْأَنْعَامُ“^۱، وہ دنیا میں سکون حاصل کرتے ہیں اور اس طرح (بے فکری سے) کھاتے پیتے ہیں جس طرح حیوان کھاتے پیتے ہیں۔ وہ حیوانوں کی طرح زندگی گزارتے ہیں اور کھاتے ہیں۔

چونکہ وہ لوگ اپنی انسانی صلاحیتوں کو تباہ کرتے ہیں لہذا دردناک عذاب میں مبتلا ہوں گے ”ذُرِّبُوا يَكُلُوا وَيَشْتَبُوا وَيَلْهَمُ الْأَلُفُوفُ يَعْلَمُونَ“^۲، اے رسول اللہ ﷺ انہیں انہیں کی حالت پر چھوڑ دیجئے تاکہ (خوب) عیش و نوش کر لیں اور (زندگی کے) مزے اڑالیں اور ان کی تمنائیں انہیں لہو و لعب میں مشغول رکھے عنقریب وہ جان لیں گے۔

سوالات

۱۔ دین میں تحقیق کی دوسری دلیل کن مقدمات پر مشتمل ہے؟

۲۔ انسانی کمال طلبی کی وضاحت کریں؟

۳۔ انسان کی مهم خصوصیات کو بیان کریں؟

^۱ سورہ محمد۔ آیت / ۱۲۔

^۲ سورہ حجر۔ آیت / ۳۔ انہیں، انہیں کے حال پر چھوڑ دیں کہ کھائیں اور زندگی گذاریں اور ان کی دنیوی آرزوئیں انہیں مگن رکھیں کہ عنقریب انہیں معلوم ہو جائے گا۔

۴۔ مذکورہ خصوصیات اور ان کے حقیقی کمال میں کیا رابطہ ہے؟

۵۔ کسی طرح آئیڈیالوژی، جہان بینی پر منحصر ہے؟

۶۔ دوسری دلیل کی منطقی صورت بیان کریں؟

چوتھا درس

جہان بینی کے بنیادی مسائل کا راہ حل

مقدمہ

جب ایک انسان معرفت کے بنیادی مسائل کو حل کرنے اور دین حق کے اصول و قواعد کی پہچان کے لئے قدم اٹھاتا ہے تو وہ پہلے ہی مرحلہ میں ان سوالوں کا سامنا کرتا ہے کہ وہ کس طرح ان مسائل کو حل کرے؟ کس طریقہ سے بنیادی اور صحیح معارف کو حاصل کرے؟ اور اصولاً ان کی شناخت کے راستے کیا ہیں؟ نیز ان میں سے کسے ان معارف تک پہنچنے کے لئے انتخاب کرے؟ ان مطالب پر فنی اور تفصیلی گفتگو کرنے کے لئے فلسفہ کی ایک بحث (شیاء کی معرفت) (ایپیمولوژی) کا سہارا لینا ضروری ہے، کہ جسمیں شناخت انسان کے مختلف پہلوؤں پر بحث کی گئی ہے، اور اس کی اہمیت پر روشنی ڈالی گئی ہے ہم یہاں پر ان تمام پہلوؤں سے بحث نہیں کر سکتے اس لئے کہ وہ ہمیں اس کتاب میں اصل ہدف سے دور کر دیں گے، اس وجہ سے ان میں سے فقط بعض کے بیان پر اکتفا کیا جاتا ہے، اور مزید تحقیق کے لئے (انشاء اللہ) ہم ضرورت پڑنے پر اشارہ کریں گے^۱

شناخت کی قسمیں

انسان کی اس شناخت کے اعتبار سے چار قسموں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

۱۔ شناخت علمی (تجربی) (خاص اصطلاح میں) یہ شناخت حسی امور کی مدد سے حاصل ہوتی ہے اگرچہ عقل اور اکات حسی کی

عمومیت اور اس کے مجرد عن المادہ ہونے میں اپنا پورا کردار ادا کرتی ہے شناخت علمی سے، تجربی علوم مثلاً سائنس، لیسر ٹری،

^۱ اس سلسلہ میں مزید اطلاع حاصل کرنے کے لئے اس کتاب کے دوسرے حصہ ”آموزش فلسفہ“ اور مقالہ ”شناخت“ جو کتاب پاسداری از سنگرهای اپیدولوژیک“ میں ہے، اور اپیدولوژی تطبیقی کے دروس میں سے پانچویں درس سے سولہویں درس تک کا مطالعہ کیا جائے

اور زیست شناسی (علم حیات) جیسے علوم میں استفادہ کیا جاتا ہے۔

۲۔ شناخت عقلی: ایسی شناخت مفہیم انتزاعی (معتولات ثانیہ) کے ذریعہ حاصل ہوتی ہے، اس میں اساسی اور بنیادی رول عقل کا ہوتا ہے، ہر چند اس بات کا امکان ہے کہ بعض قضایا بہ عنوان مفہیم انتزاعی یا مقدمہ از قیاس ہونے کی وجہ سے حسی و تجربی ہوں، اس شناخت کی وسعت منطق، علوم فلسفہ، اور ریاضیات سب کو شامل ہے۔

۳۔ شناخت تبدیلی: اس شناخت کی حیثیت ثانوی ہے، جو (قابل اعتماد ماخذ و مدرک) (اتوریہ) اور صادق شخص کے خبر دینے کے ذریعہ حاصل ہوتی ہے وہ مطالب جو پیروان دین، اپنے دینی رہنما ہونے کے ناطے ان کے اقوال کو قبول کرتے ہیں، اور کبھی کبھی ان کا یہ اعتقاد حس و تجربہ کے ذریعہ حاصل ہونے والے اعتقاد سے کہیں زیادہ قوی ہوتا ہے جو اسی شناخت کا ایک حصہ ہے۔

۴۔ شناخت شہودی: یہ شناخت دوسری اقسام کے برخلاف مفہوم ذہنی کے واسطے کے بغیر معلوم ذات عینی سے متعلق ہوتی ہے، جس میں کسی قسم کے اشتباہ کا امکان نہیں رہ جاتا لیکن جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے کہ جو کچھ بھی شہودی اور عرفانی کے نام سے بیان کیا جاتا ہے درحقیقت شہودات کی ایک ذہنی تفسیر ہوتی ہے جو قابل خطا ہے^۱۔

معرفت کی قسمیں

شناخت کی قسمیں جن اصولوں کی بنیاد پر بیان کی گئیں ہیں انہیں اصولوں کے ذریعہ جہاں بینی کی بھی تقسیمات کی جاسکتی ہیں۔

۱۔ معرفت علمی: یعنی انسان، علوم تجربی کے ذریعہ حاصل ہونے والے نتائج کے ذریعہ ہستی کے سلسلہ میں ایک مکمل معلومات حاصل کرے۔

۲۔ معرفت فلسفی: وہ معرفت جو ازراہ استدلال اور عقلی کاوشوں کے ذریعہ حاصل ہو۔

^۱ رجوع فرمائیں، آموزش فلسفہ۔ تیرہویں درس۔

۳۔ معرفت دینی: وہ معرفت جو رہبران دین پر ایمان رکھنے اور ان کی گفتار کو قبول کرنے کے ذریعہ حاصل ہوتی ہے۔

۴۔ معرفت عرفانی: وہ معرفت جو کشف و شہود اور اشراق کے ذریعہ حاصل ہوتی ہے، اب دیکھنا یہ ہے کہ واقعاً جہان بینی کے بنیادی مسائل کو انہیں چار تقسیموں کے ذریعہ حل کیا جاسکتا ہے، تاکہ ان میں کسی ایک کے برتر ہونے کا سوال پیدا نہ ہو۔

نتیجہ

حس و تجربی شناخت کی وسعت اور مادی و طبیعی قنایا میں محدودیت کی وجہ سے یہ بات روشن ہو جاتی ہے کہ علوم تجربی کی بنیاد پر معرفت کے اصول کو نہیں سمجھا جاسکتا اور اس سے مربوط مسائل کو حل نہیں کیا جاسکتا، اس لئے کہ اس کے مسائل علوم تجربی کی حدود سے خارج ہیں، اور علوم تجربی میں ان مسائل کے تحت نفی و اثبات کا امکان نہیں ہے، جس طرح سے کہ وجود خدا کو آزمائشوں کے ذریعہ ثابت نہیں کیا جاسکتا، یا (العیاذ باللہ) اسکی نفی کا امکان نہیں ہے، اس لئے کہ علوم تجربی کے آلات ماوراء طبعیت تک پہنچنے سے قاصر ہیں، بلکہ ان کے ذریعہ تنہا مادی قنایا میں اثبات و نفی کا حکم صادر کیا جاسکتا ہے۔ لہذا علمی و تجربی معرفت (اپنے اصطلاحی معنی) کی حقیقت ایک سراب سے زیادہ نہیں ہے اور اسے صحیح معنوں میں کلمہ معرفت سے یاد نہیں کیا جاسکتا، بلکہ اسے ”جہان مادی کی شناخت“ کا نام دیا جاسکتا ہے، اس لئے کہ ایسی شناخت معرفت کے بنیادی مسائل کا جواب نہیں دے سکتی۔

لیکن وہ شناخت جو تبدیلی روش کے ذریعہ حاصل ہو، جیسا کہ ہم نے اشارہ بھی کیا ہے اس کی ایک ثانوی حیثیت ہے کہ جسکا مطلب یہ ہے کہ پہلے مصدر یا مصادر کا اعتبار ثابت ہو چکا ہو، یعنی پہلے مرحلہ میں کسی کی بعثت ثابت ہو تاکہ اس کے پیغامات کو مقبّر سمجھا جاسکے، اور ہر امر سے پہلے پیغام ارسال کرنے والے یعنی وجود خدا کا اثبات ہونا چاہیے، لہذا یہ بات بطور کامل روشن ہے کہ خود پیغام ارسال کرنے والے کا وجود اور کسی پیغمبر کے وجود کو پیغام کے مستند ہونے کے ذریعہ ثابت نہیں کیا جاسکتا، جیسے کہ یہ نہیں کہا جاسکتا کہ چونکہ قرآن کہتا ہے ”خدا ہے“ پس اس کا وجود ثابت ہے، البتہ وجود خدا کے اثبات، شناخت پیغمبر اور حقانیت

قرآن کے بعد ”مخبر صادق“ اور ”مناہج معتبر“ کے ذریعہ تمام فرعی مسائل اور احکامات کو قبول کیا جاسکتا ہے لیکن بنیادی مسائل کو سب سے پہلے حل کرنا ضروری ہے، پس معلوم یہ ہوا کہ روش تبدیلی بھی بنیادی مسائل کے حل کے لئے ناکافی ہے، لیکن اشراقی عرفانی روش کے سلسلہ میں بہت طولانی بحث ہے۔ پہلے یہ کہ مسائل جہان بینی ایک ایسی شناخت ہے جو ذہنی مفاہیم پر مشتمل ہے لیکن متن شہود میں اسکا کوئی مقام نہیں ہے لہذا ایسے مفاہیم کے سلسلہ میں شہود پر اعتماد کرنا سہل انگاری اور ان کے ارادوں کے مطابق ہوگا۔

دوسرا یہ کہ: الفاظ و مفاہیم کے قالب میں شہودات کی تفسیر اور انہیں بیان کرنا، ایک قوی ذہن کا کام ہے، جسے عقلی کاوشوں اور فلسفی تحلیلوں میں ایک طولانی مدت تک جانفشانوں کے بغیر حاصل نہیں کیا جاسکتا، لہذا جو لوگ ایسے ذہن کے حامل نہیں ہوتے وہ اپنی تعبیرات میں تضاد مفاہیم کا استعمال کرتے ہیں جو گمراہی کے عظیم عوامل میں شمار ہوتے ہیں۔ تیسرے یہ کہ: بہت سے مقامات پر جو چیز واقعات شہود میں آشکار ہوتی ہے خیالی انگار اور ذہنی تفسیر کی وجہ سے خود خود مشاہدہ کرنے والے کے لئے، شک و تردید کا باعث ہوتی ہے۔ چوتھے یہ کہ: ان حقائق کی جستجو جسے تفسیر ذہنی (معرفت) کا نام دیا جاتا ہے سیر و سلوک میں سالہا سال زحمت کے ذریعہ حاصل ہوتی ہے، سیر و سلوک کی روش کو قبول کرنا علمی شناخت کا ایک حصہ ہے، جس میں معرفت کے بنیادی مسائل اور مبانی نظری سے واقف ہونے کی ضرورت ہے۔

لہذا سیر و سلوک میں سفر سے پہلے ان مسائل کا حل کرنا ضروری ہے تاکہ نتیجہ میں کشف و شہود حاصل ہو سکے درں حالیکہ شہودی شناخت کا مرحلہ انجام کار ہے اصولاً عرفان حقیقی اس کو حاصل ہوتا ہے جو راہ خدا میں خالصۃً لوجه اللہ (صرف خدا کی مرضی کے لئے) زحمت اٹھائے اور ایسی سعی و کوشش راہ بندگی و اطاعت میں شناخت خدا پر منحصر ہے، جسے سب سے پہلے حاصل کرنا ضروری ہے۔

نتیجہ

اس تحقیق کے بعد جو نتیجہ سامنے آتا ہے وہ یہ ہے کہ تھا وہ راستہ جس نے معرفت شناسی کے بنیادی مسائل کا حل تلاش کرنے والوں کے سامنے راہیں ہموار کی ہیں وہ راہ عقل اور روش تدبر و تفکر ہے، اور اس لحاظ سے جہان بینی واقعی کو جہان بینی فلسفی تسلیم کرنا چاہیے۔ البتہ عقل کے ذریعہ ان مسائل کو حل کرنا اور معرفت کو فلسفی مباحث میں منحصر کرنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ صحیح معرفت حاصل کرنے کے لئے تمام فلسفی مسائل کا حل کیا جانا ضروری ہے بلکہ اس راہ میں صرف بدیہی اور چند مسائل کا حل کر لینا ہی کافی ہے کہ جو معرفت کے بنیادی مسائل میں نثار ہوتے ہیں، اگرچہ اس کے باوجود ایسے مسائل اور اسی قسم کے بہت سے اعتراضات کا جواب دینے کے لئے فلسفی مہارتوں کا زیادہ ہونا ضروری ہے۔

اسی طرح شناخت عقلی کے بنیادی مسائل کو حل کرنے کے لئے مفید طریقہ شناخت کو بہ رومی کار لانے کا مطلب یہ نہیں ہے بقیہ معلومات کو ترک کر دیا جائے بلکہ بہت سے عقلی استدلالات میں ان مقدمات سے استفادہ کیا جاسکتا ہے، جو علم حضوری یا حس و تجربہ کے ذریعہ حاصل ہوتے ہیں، جس طرح سے کہ ثانوی مسائل اور فرعی اعتقادات کو حل کرنے کے لئے تعبیری شناخت کا سہارا لیا جاسکتا ہے اور انہیں کتاب و سنت (دین کے معتبر منابع) کی اساس پر ثابت کیا جاسکتا ہے۔

صحیح معرفت اور آئیڈیالوجی کو حاصل کرنے کے بعد سیر و سلوک کے مراحل کو طے کرنے کے لئے مکاشفات و مشاہدات کی منزل تک پہنچا جاسکتا ہے اور بہت سے وہ مسائل جو عقلی استدلالات کے ذریعہ حل ہوتے ہیں انہیں ذہنی مفاہیم کے واسطے کے بغیر حاصل کیا جاسکتا ہے۔

سوالات

۱۔ شناخت انسان کی اقسام اور ہر ایک کی وسعت کو بیان فرمائیں؟

۲۔ معرفت کی کتنی قسمیں تصور کی جاسکتی ہیں؟

۳۔ معرفت کے بنیادی مسائل کس طرح ثابت کئے جاسکتے ہیں؟

۴۔ جان بینی علمی (معرفت علمی) پر تنقید و تبصرہ کریں؟

۵۔ معرفت کے مسائل کو بیان کرنے کے لئے تجربی شناختوں سے کس طرح استفادہ کیا جاسکتا ہے؟

۶۔ عقیدتی مسائل کے اثبات میں کس طرح اور کن موارد میں تجربی شناختوں سے استفادہ کیا جاسکتا ہے؟

۷۔ معرفت عرفانی کی تعریف کریں؟ اور کیا شہود عرفانی کے ذریعہ معرفت کے بنیادی مسائل کو حل کیا جاسکتا ہے؟

پانچواں درس

خدا کی معرفت

مقدمہ

اب تک ہمیں یہ معلوم ہوا کہ دین کی اساس و بنیاد کائنات کے خلق کرنے والے پر اعتقاد (یقین) رکھنا ہے اور معرفت الہی اور معرفت مادی کے درمیان اصلی فرق اسی کا پایا جانا اور نہ پایا جانا ہے لہذا سب سے پہلا وہ مسئلہ جو حقیقت کے چاہنے والوں کے لئے پیدا ہوتا ہے اور جس کا جواب ہر شی سے پہلے ضروری ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ کیا کسی خدا کا وجود ہے یا نہیں؟ اور اس سوال کے جواب کو حاصل کرنے کے لئے جیسا کہ گذشتہ درس میں بیان کیا جا چکا ہے اسے حل کرنے کے لئے عقل کی جولانیوں کی ضرورت ہے تاکہ کسی قطعی نتیجہ تک پہنچا جا سکے نتیجہ چاہے ۲۴۹۲۴۹ اثبات، میں ہو یا ۲۴۹۲۴۹ نفی، میں اثبات کی صورت میں اس کے فرعی مسائل (توحید عدل اور تمام صفات الہی) کی باری آتی ہے، نتیجہ کے نفی ہونے کی صورت میں مادی نظریہ کی تائید و تصدیق ہوتی ہے کہ جس کے بعد دین کے بقیہ مسائل کو حل کرنے کی کوئی ضرورت باقی نہیں رہتی۔

حضورِ اور حصولِ معرفت

خدا کے سلسلہ میں دو اعتبار سے اس کی معرفت کا تصور کیا جاتا ہے۔ ۱۔ معرفت حضور۔

۲۔ معرفت حصول۔ خدا کی نسبت معرفت حضور کا مطلب یہ ہے کہ انسان مفاہیم ذہنی کو واسطہ بنائے بغیر شہود قلبی کے ذریعہ خدا کی ذات سے آشنا ہو جائے۔ لہذا یہ بات روشن ہے کہ اگر کوئی شخص خدا کے سلسلہ میں ایک واضح شہود سے رو برو ہو جائے تو (جیسا کہ بلند مرتبہ عارفوں نے دعویٰ کیا ہے)، پھر کسی بھی عقلی استدلال و برہان کی ضرورت باقی نہیں رہتی لیکن جیسا کہ پہلے اشارہ کیا جا

چکا ہے کہ ایسا شہود اور علم حضوری عام افراد کے لئے عرفانی سیر و سلوک کے مراحل طے کرنے کے بعد ہی میسر ہے، اگرچہ ایسے انکشافات کا امکان عام افراد کے لئے کسی حد تک بجا ہے لیکن چونکہ معرفت کو حاصل کرنے کے لئے کافی معلومات نہیں رکھتے لہذا یہ چیز ان کیلئے ممکن نہیں ہوگی۔ معرفت حصولی کا مطلب یہ ہے کہ انسان کئی مفاہیم (جیسے بے نیاز خالق، عالم و قادر) یعنی ادراکات ذہنی اور ایک لحاظ سے غائبانہ طور پر خدا کی طرف نسبت دے، اور اس حد تک اعتقاد رکھے، کہ ایسی ذات کا وجود ہے کہ جس نے اس جہان کو پیدا کیا ہے اور پھر معرفت حصولی کے دوسرے ذرائع کو اس سے متعلق ایک منظم اصول تک رسائی ہو سکے، جو کچھ بھی فلسفی برائین اور عقلی کاوشوں کے ذریعہ حاصل ہوتا ہے وہ دراصل یہی معرفت حصولی ہے، لیکن جب ایسی معرفت انسان کو حاصل ہو جائے تو اسے معرفت حضوری کے سلسلہ میں بنی کوشش کرنا چاہیے۔

فطری شناخت

عرفاء، حکماء اور دینی رہبروں کے اکثر اقوال میں اس عبارت کو اکثر و بیشتر دیکھا گیا ہے کہ ”خدا کی شناخت فطری ہے“، یا ”انسان فطرۃً خدا شناس ہے“ اس مطلب کو سمجھنے کے لئے ہمیں سب سے پہلے فطرت کے معنی سمجھنا ہوں گے۔ فطرت ایک عربی کلمہ اور ”نوع خلقت“ کے معنی میں ہے، اور انھیں امور کو فطری کہا جاتا ہے کہ جس کا، خلقت و آفرینش تقاضا کرے، اسی وجہ سے اس کے لئے تین خصوصیات کا لحاظ لیا گیا ہے۔ ۱۔ فطرت وہ موجود ہے جو نوع از موجودات کے تمام افراد میں، پائی جائے اگرچہ وہ کیفیت شدت و ضعف کے اعتبار سے متفاوت ہوں۔

۲۔ فطری امور طول تاریخ میں ہمیشہ ثابت و مستحکم و ناقابل تبدیل رہے ہیں اور ایسا کبھی بھی نہیں ہو سکتا کہ کسی نوع کی فطرت ایک زمانہ گزر جانے کے بعد اپنی اقتضا بدل دے اور اسی طرح زمانے کے بدلنے کی طرح اس کی اقتضا بدلتی رہے۔ (فطرت اللہ الہی فطر

^۱ البتہ ایسے مشاہدات و انکشافات کے اہل افراد سے انکار نہیں کیا جاسکتا جیسا کہ ہمارا اعتقاد ہے کہ ہمارے ائمہ معصومین علیہم السلام اپنے زمانہ طفولیت میں بھی ایسے شہودات کے مالک ہوا کرتے تھے یہاں تک کہ بعض ائمہ نے شکم مادر میں بھی ایسی شناخت کا ثبوت دیا ہے۔

النَّاسُ عَلَيْهَا لَتَبْدِلَ يُخْلِقُ اللَّهُ، یہی خدا کی فطرت ہے جس پر اس نے لوگوں کو پیدا کیا ہے خدا کی خلق کی ہوئی فطرت میں کوئی تبدیلی نہیں آسکتی۔ سورہ روم۔ آیت ۳۰۔ فطری امور فطری ہونے کے لحاظ سے اور اقتضاء خلقت کے سبب اس کو سکھنے اور سکھانے کی ضرورت نہیں ہوتی ہاں اتنا ضرور ہے کہ اسے صحیح راستہ دکھانے اور قوت بخشنے کے لئے تعلیم کی ضرورت ہے۔

انسان کی فطریات کو دو حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے

الف: فطری معرفت کہ جو ہر انسان کے پاس تعلیم کے بغیر موجود ہے۔

ب: فطری میلانات اور رجحانات ہر فرد کی خلقت کا تقاضا و لازمہ ہیں، لہذا اگر ہر فطرت بشر کے لئے خدا کے سلسلہ میں ایک قسم کی شناخت ثابت ہو جائے کہ جس کے حصول کے لئے تعلیم و تعلم کی ضرورت نہ ہو تو اسے ”فطری خدا شناسی کا نام دیا جاسکتا ہے“ اور اگر تمام انسانوں میں خدا کی طرف توجہ اور اس کی پرستش کے میلانات ظاہر ہو جائیں تو اسے (فطری خدا پرستی) کہا جاسکتا ہے۔ ہم نے دوسرے درس میں اس بات کی طرف اشارہ کیا تھا کہ بہت سے صاحبانِ فکر کی رو سے دین اور خدا کی طرف توجہ پیدا کرنا انسان کی روحی خصوصیات کا تقاضا ہے کہ جسے ”حسن مذہبی“ یا ”عاطفہ دینی“ کا نام دیا جاتا ہے، اب اس کے بعد ہم اس مطلب کا بھی اضافہ کرتے ہیں کہ خدا شناسی بھی انسانی فطرت کا تقاضہ ہے۔

لیکن جیسا کہ خدا پرستی کی فطرت ایک دیدہ و دانستہ میلان نہیں اسی طرح خدا شناسی کی فطرت بھی لاشعوری اور غیر دانستہ ہے اس لحاظ سے یہ فطرت عام افراد کو خدا شناسی کی عقلی جستجو و تلاش سے بے نیاز نہیں کر سکتی۔ لیکن اس نکتہ کو فراموش نہیں کیا جاسکتا کہ ہر انسان معرفتِ حضوری کے ایک ادنیٰ درجہ پر فائز ہے لہذا معمولی فکر و استدلال کے ذریعہ، وجود خدا کو ثابت کر سکتا ہے اور آہستہ آہستہ اپنی لاشعوری شناخت (مشاہدہ قلبی) کو قوی بنا سکتا ہے، اور آگاہانہ طور پر معرفت کے مدارج طے کر سکتا ہے۔

نتیجہ

خدا شناسی کے فطری ہونے کا مطلب یہ ہے کہ انسان کا دل و وجود خدا سے آشنا ہے اور اس کی روح میں خدا شناسی کی فطرت موجود ہے جسے رشد و کمال دیا جاسکتا ہے۔ لیکن یہ فطرت عام افراد میں اس حالت میں نہیں ہے کہ انہیں کئی ثبوت سے تفکر اور عقلی استدلال سے بے نیاز کر دے۔

سوالات

- ۱۔ معرفت کا سب سے بنیادی مسئلہ کیا ہے؟ اور اس کے اساسی ہونے کی وجہ کیا ہے؟
- ۲۔ خدا کے سلسلہ میں شناخت حضوری اور حصولی کی وضاحت کریں؟
- ۳۔ کیا شناخت حضوری کو عقلی استدلال کے ذریعہ حاصل کیا جاسکتا ہے؟ اور کیوں؟
- ۴۔ شناخت حضوری کے لئے شناخت حصولی کیا مدد کر سکتی ہے؟
- ۵۔ فطرت کے معنی بیان کریں؟
- ۶۔ امور فطری کی خصوصیات بیان فرمائیں؟
- ۷۔ امور فطری کی اقسام ذکر کریں؟
- ۸۔ کون سا فطری امر خدا سے مربوط ہے؟
- ۹۔ خدا شناسی کے فطری ہونے کے بارے میں وضاحت پیش کریں؟ ۱۰۔ کیا خدا شناسی کی فطرت عام لوگوں کو عقلی استدلال سے بے نیاز کر سکتی ہے؟ اور کیوں؟

چھٹا درس

خدا شناسی کا آسان راستہ

خدا شناسی کے راستے

خدا کی معرفت حاصل کرنے کے بہت سے ذرائع اور مختلف طریقے ہیں، کہ جن کی طرف مختلف فلسفی و کلامی کتابوں، دینی رہنماؤں کے بیانات، اور آسمانی کتابوں میں اشارہ کیا گیا ہے، یہ دلائل مختلف جہتوں سے ایک دوسرے سے متفاوت ہیں جیسے کہ بعض دلیلوں میں حسی و تجربی مقدمات سے استفادہ کیا گیا ہے اور بعض دلائل محض مقدمات عقلی پر مشتمل ہیں، بعض دلیلیں خدائے حکیم کے وجود کا اثبات کرتی ہیں تو بعض ایک ایسے وجود کو ثابت کرتے ہیں جو اپنی پیدائش میں کسی دوسرے وجود کا محتاج نہیں ہے، (واجب الوجود) لہذا اس کی صفات کی پہچان کے لئے کچھ دوسرے دلائل کی ضرورت ہے۔

خدا شناسی کے دلائل کو ان پلوں سے تشبیہ دی گئی ہے کہ جو کسی ندی یا دریا سے عبور کرنے کے لئے بنائے گئے ہوں، ان میں بعض پل لکڑی کے ہوتے ہیں کہ جن سے صرف ایک ہکا (کم وزن) آدمی آسانی سے گذر سکتا ہے اور بعض محکم اور طولانی ہوتے ہیں کہ جن سے ہر کوئی گذر سکتا ہے اور بعض پل آہنی و پرہچ راستوں پر مشتمل ہوتے ہیں نشیب و فراز اور سرنگوں سے گذرتے ہیں کہ جنہیں بڑی بڑی ٹرینوں کے گذرنے کے لئے بنایا جاتا ہے۔

وہ لوگ کہ جو سادہ ذہن ہیں وہ آسان راستوں سے خدا کو پہچان سکتے ہیں اور اس کی عبادت انجام دے سکتے ہیں، لیکن وہ لوگ کہ جن کے ذہنوں میں شک و شبہات پائے جاتے ہیں انہیں محکم پل سے گذرنا ہوگا، اور جن کے ذہنوں میں شکوک و شبہات کا انبار ہے اور طرح طرح کے وسوسہ پیدا ہوتے ہیں انہیں ایسے پل سے گذرنا ہوگا کہ جو زیادہ سے زیادہ استحکام کا حامل ہو، اگرچہ اس میں نشیب و

راز اور پیچ و خم کی مشکلات موجود ہوں۔ ہم اس مقام پر خدا شناسی کے آسان دلائل کے سلسلہ میں بحث کریں گے، اس کے بعد متوسط دلائل پیش کریں گے، لیکن پیچ و خم سے بھرپور راستے کہ جنہیں طے کرنے کے لئے فلسفہ کے بنیادی مسائل کو حل کرنے کی ضرورت ہے اے ایسے افراد طے کریں کہ جن کے ذہنوں میں ثبات کا انبار ہے، جو اپنے ثبات کو زائل کرنے نیز بھولے بھٹکے لوگوں کو نجات دلانا چاہتے ہیں۔

آسان راستہ کی خصوصیات

خدا شناسی کا آسان راستہ بہت سی خصوصیات کا حامل ہے کہ جس میں سے ہم خصوصیات یہ ہیں ۱۔ اس راستہ کو طے کرنے کے لئے پیچیدہ دلائل کی ضرورت نہیں، بلکہ وہ ایک آسان دلیل ہے کہ جسے یہاں ذکر کیا جاسکتا ہے، اسی وجہ سے وہ تمام لوگوں کے لئے خواہ وہ کسی طبقہ سے ہوں قابل فہم ہے۔

۲۔ یہ راستہ براہ راست (خدا علم و قدیر) کی طرف ہدایت کرتا ہے، جبکہ فلسفہ و کلام کے اکثر براہین پہلے مرحلہ میں ایک ایسے موجود کو ثابت کرنا چاہتے ہیں جو (واجب الوجود) ہے اور اس کی صفات علم و قدرت، حکمت و خالقیت اور ربوبیت کو ثابت کرنے کے لئے دوسرے دلائل کی ضرورت ہوتی ہے۔

۳۔ یہ راستہ ہر شے سے زیادہ فطرت کو بیدار کرنے اور فطری معرفت دلانے میں اثر انداز ہے اسی راستہ کو طے کرنے کے بعد انسان میں ایک ایسی عرفانی کیفیت پیدا ہوتی ہے کہ گویا وہ دست خدا کو جہان کی خلقت اور اسکی تدبیر میں مشاہدہ کرتے ہوئے محسوس کر رہا ہے وہی دست خدا کہ جس سے اس کی فطرت آشنا ہے۔ انہیں خصوصیات کی وجہ سے اس راستہ کو انبیاء اور دینی رہبروں نے عام لوگوں کے لئے انتخاب کیا اور لوگوں کو اس راستہ کی طرف آنے کی دعوت دی اور خواص کے لئے ایک دوسرے طریقہ کا رکنا انتخاب کیا یا ملحدوں اور مادی فلاسفہ کے مقابلہ میں مخصوص دلائل پیش کئے۔

آشنا نیاں

خدا شناسی کا آسان راستہ جہان میں خدا کی آیات پر غور و فکر اور قرآن کی تعبیر کے مطابق آیات الہی میں تفکر کرنا ہے زمین و آسمان اور انسان کا وجود بلکہ کل جہان کی ہر شئی ایک مطلوب و مقصود نشانی کے وجود سے آشنا ہے اور ساعت قلب کی سوئیوں کو اس مرکز ہستی کی طرف ہدایت کر رہی ہیں کہ جو ہمہ وقت ہر جگہ حاضر و ناظر ہے۔ یہی کتاب جو آپ کے ہاتھ میں ہے اسی کی نشانیوں میں سے ہے، کیا ایسا نہیں ہے کہ اس کے مطالعہ سے اس کے مؤلف اور اس کے ہدف سے آپ آشنا ہوں گے؟ کیا آپ یہ احتمال دے سکتے ہیں کہ یہ کتاب خود بہ خود وجود میں آگئی ہے اور اس کا کوئی مؤلف و مصنف نہیں ہے؟ کیا یہ احتمال تصور نہیں ہے کہ کوئی یہ تصور کر بیٹھے کہ سیکڑوں جلد پر مشتمل دائرۃ المعارف کی کتاب ایک دھماکے سے وجود میں آگئی، اس کے ذرات نے حروف کی شکل اختیار کر لی اور دوسرے چھوٹے چھوٹے دھماکوں سے کاغذات بن گئے اور پھر چند دھماکوں سے پوری کتاب مرتب ہو گئی۔

کیا اس عظیم حتیٰ کی خلقت کو بے شمار اسرار و حکمت کے باوجود آنکھ بند کر کے ایک حادثہ مان لینا اس تصور سے ہزار گنا احتمالہ نہیں ہے کہ جسے ہم نے بیان کیا؟ ہاں، ہر باہدف نظام اپنے ناظم کے عظیم ہدف پر دلالت کرتا ہے اور ایسے باہدف نظام تو اس جہان میں بے شمار ہیں کہ جن میں سب کی بازگشت ایک ہی چیز کی طرف ہے یعنی خالق حکیم نے اس جہان کو خلق کیا ہے اور اس کی باگ ڈور سنبھال رکھی ہے۔

گلستان کے دامن میں کھلنے والا پھول اور پھولوں کا درخت، خاک و راکھ کی آغوش سے اپنی مختلف شکل و صورت میں سر اٹھاتا ہے سب کا ایک تار و درخت تھا ایک معمولی بچ کا نتیجہ ہے جو ہر سال سیکڑوں خوش ذائقہ اور لذیذ پھل عطا کرتا ہے، یہی حال بقیہ درختوں کا بھی ہے۔ اسی طرح وہ بلبل جو درختوں کی ٹہنیوں پر بیٹھی نغمہ سرائی کرتی ہے، انڈے کی چھال توڑ کر باہر آنے والا چوڑہ زمین پر دانے چلنے کے لئے نوک مارتا ہے یا گائے کا پیدا ہونے والا بچھڑا سیر ہونے کے لئے اپنی ماں کے پستان ڈھونڈتا ہے یا نوزاد (نومولود) کی بھوک مٹانے کے لئے ماؤں کے پستان میں اترنے والا دودھ یہ سب کچھ اسی کی آسمان نشانیوں میں۔ واقعا آپ

تصور کریں کہ نو مولود کے متولد ہوتے ہی ماں کے پستان میں دودھ کا آجانا کیسا مرتب اور دقیق نظام ہے۔ وہ مچھلیاں جو انڈے دینے کے لئے پہلی مرتبہ سیکڑوں کیلو میٹر کا راستہ طے کرتی ہیں یا وہ پرندے جو دریائی گھاس پھوس میں اپنے گھونسلوں کو بخوبی پہچان لیتے ہیں یہاں تک کہ ایک بار بھی بھولے سے کسی دوسرے کے گھونسلے میں قدم نہیں رکھتے یا پھر شد کی مکھیاں جو خوشبودار پھولوں کے رسوں کو حاصل کرنے کے لئے صبح اپنے آشیانے (چھتہ) سے باہر آتی ہیں، طولانی مسافتوں کو طے کرتی ہیں اور شام ہوتے ہی مستقیم طور پر اپنے (چھتہ) لوٹ آتی ہیں۔ یہ سب کی سب اس کی نشانیاں ہیں، اور سب سے زیادہ عجیب مسئلہ تو یہ ہے کہ شد کی مکھیاں اور گائے، بھینس، بھیر بکریاں اپنی احتیاج سے کہیں زیادہ دودھ اور شد دستی میں تاکہ خدا کا برگزیدہ انسان اس سے استفادہ کر سکے۔

خود انسان کے بدن میں نہایت پیچیدہ اور حکیمانہ نظام قابل مشاہدہ ہیں منظم مجموعوں سے بدن کی ترکیب اور ہر مجموعہ کا متناسب اعضا سے مرکب ہونا اور ہر عضو کا لاکھوں زندہ خلیوں سے ترکیب پانا جبکہ یہ سب کے سب تنہا ایک خلیہ سے پیدا ہوئے ہیں اور ان تمام خلیوں کا ایک خاص ترکیبات سے وجود میں آنا اور پھر ہر عضو بدن کا ایک خاص مقام پر واقع ہونا، اور تمام اعضاء بدن کا کسی خاص هدف کے تحت حرکت کرنا، جیسے پھیپھڑوں کے ذریعہ اکسیجن کا حاصل کرنا اور پھر خون کے گلبول (globule) کے ذریعہ انہیں بدن کے مختلف اعضاء تک پہنچ جانا نیز ایک معین مقدار میں جگر کے ذریعہ قند کی کمی کو پورا کرنا، نئے خلیوں کی پیدائش کے ذریعہ آسیب دیدہ عضلات کو بدلنا اور مختلف غدوں سے حاصل ہونے والے ہارمون اور سفید گلبول کے ذریعہ ضرر رساں جراثیم سے مقابلہ جو بدن کو منظم رکھنے اور اس کی حیات کو باقی رکھنے کے لئے نمایاں کام انجام دیتے ہیں۔

یہ سب کی سب خداوند متعال کی نشانیاں ہیں، اور یہ عجیب نظام ہے کہ سیکڑوں سال گزرنے کے بعد ہزاروں دانشمند اس نتیجہ تک نہیں پہنچ سکے کہ یہ تمام امور کس کے وسیلہ سے برقرار ہیں۔ ہر خلیہ اپنے چھوٹے سٹم کے ساتھ کسی نہ کسی هدف کے تحت اور خلیوں کا ہر دستہ ایک ایسے عضو کو تشکیل دیتا ہے جو خود باهدف نظام ہے اور ایسے سیکڑوں سٹم اپنی پیچیدگیوں کے ساتھ پورے ایک بدن

پر حاکم ہیں، سلسلہ یہیں پر تمام نہیں ہوتا بلکہ موجودات کے اندر ایسے ہزاروں اور لاکھوں سسٹم ایسی بے کراں ہستی کو تشکیل دیتے ہیں جسے جہان طبیعت کا نام دیا جاتا ہے جو نظم و کمال کے ساتھ حکیم واحد کے ہاتھوں جاری و ساری ہیں۔ اور یہ بات واضح و روشن ہے کہ علم و دانش جتنا بھی پیشرفت اور ترقی کرے گا اتنے ہی حکمت الہی کے اسرار و رموز آشکار ہوتے جائیں گے اور یہی نشانیاں پاک نفس اور صاف طبیعت والوں کے لئے کافی ہیں۔

سوالات

- ۱۔ خدا شناسی کی مختلف راہیں اور خصوصیات بیان فرمائیں؟
- ۲۔ خدا شناسی کا آسان راستہ کیا ہے؟ اور اس کی خصوصیات کیا ہیں؟
- ۳۔ موجودات عالم کی باہد ف نشانیاں، بظ و تفصیل سے بیان کریں؟
- ۴۔ دلیل نظم کی منطقی شکل بیان کریں؟

ساتواں درس

واجب الوجود کا اثبات

مقدمہ

ہم نے گذشتہ دروس میں اس بات کی طرف اشارہ کیا کہ اسلامی فلاسفہ اور متکلمین نے خدا کے وجود کے ثابت کرنے کے لئے بہت سے دلائل اور براہین ذکر کئے ہیں جو فلسفہ و کلام کی بیٹکانوں میں موجود ہیں، ہم ان تمام براہین میں سے ایک ایسے برہان کو بیان کریں گے کہ جسے سمجھنے کے لئے معمولی مقدمات کی ضرورت ہے، اور جس کا سمجھنا آسان ہے۔ لیکن یہ مطلب واضح رہے کہ یہ دلیل صرف خدا کے وجود کو (واجب الوجود) ہونے کے اعتبار سے ثابت کرتی ہے یعنی وہ ایسا موجود ہے کہ جس کا وجود ضروری اور کسی پیدا کرنے والے سے بے نیاز ہے، اور ہم بقیہ صفات (ثبوتیہ و سلبیہ) جیسے علم و قدرت جسم کا نہ ہونا، زمان و مکان سے بے نیاز ہونا وغیرہ کو دوسرے دلائل کے ذریعہ ثابت کریں گے۔ متن برہان۔ کوئی بھی موجود عقلی، فرض کی بنیاد پر یا واجب الوجود ہے یا ممکن الوجود، ان دو صورتوں سے خارج نہیں ہے لہذا تمام موجودات کو ممکن الوجود نہیں کہا جاسکتا،

اس لئے کہ ممکن الوجود کے لئے علت کا ہونا ضروری ہے اور اگر تمام علتیں ممکن الوجود ہوں اور یہ سب کی سب کسی دوسری علت کی محتاج ہوں تو پھر کبھی کوئی موجود متحقق نہیں ہو سکتا، یا ایک دوسری تعمیر کے مطابق علتوں کا تسلسل محال ہے لہذا مجبوراً علتوں کا تسلسل ایک ایسے موجود پر تمام ہونا چاہیے کہ جو کسی دوسرے موجود کا معلول نہ ہو یعنی وہ واجب الوجود ہو۔ یہ دلیل اثبات خدا کے لئے تمام دلیلوں میں ہر ایک سے آسان ہے جو چند عقلی مقدمات پر مشتمل ہے، جسے سمجھنے کے لئے کسی بھی حسی اور تجربی مقدمہ کی ضرورت نہیں ہے، لیکن چونکہ اس دلیل میں فلسفی مفہیم اور اصطلاحات کا استعمال ہوا ہے، لہذا بہتر ہے کہ ان اصطلاحات اور مقدمات کہ جن سے یہ دلیل مرتب ہوئی ہے وضاحت کر دی جائے۔

امکان اور وجوب

ایک معمولی قضیہ آسان ہونے کے باوجود، دو اساسی مضموم (موضوع و محمول) سے تشکیل پاتا ہے، جیسے یہ قضیہ ۲۴۹۲۴۹ خورشید منور ہے، خورشید کے منور ہونے پر دلالت کرتا ہے اس میں ۲۴۹۲۴۹ خورشید، موضوع اور ۲۴۹۲۴۹ منور، محمول ہے۔ موضوع کے لئے محمول کا ثابت ہونا تین حالتوں سے خارج نہیں ہے یا محال ہے جیسے یہ کہا جائے ۲۴۹۲۴۹ تین کا عدد چار کے عدد سے بڑا ہے، یا ضروری ہے جیسے یہ جملہ ۲۴۹۲۴۹ دو چار کا نصف ہے، یا پھر نہ ہی محال ہے اور نہ ہی ضروری جیسے کہ ۲۴۹۲۴۹ خورشید ہمارے سروں پر پہنچ چکا ہے، منطقی اصطلاح کے مطابق صورت اول میں نسبت قضیہ وصف ۱۲۴۹۲۴۹، اور دوسری صورت میں وصف ۲۴۹۲۴۹ ضرورت، یا ۲۴۹۲۴۹ وجوب، اور تیسری صورت میں وصف ۱۲۴۹۲۴۹ مکان، ۱۲۴۹۲۴۹ اپنے خاص مضامین، سے متصف ہے۔

لیکن چونکہ فلسفہ میں (وجود) کے سلسلہ میں بحث کی جاتی ہے اور جو، شئ متنع و محال ہو کبھی بھی وجود خارجی سے متصف نہیں ہو سکتی، لہذا فلاسفہ نے موجود کو فرض عقلی کی بنیاد پر واجب الوجود اور ممکن الوجود میں تقسیم کر دیا ہے، واجب الوجود یعنی ایک ایسا موجود جو خود بخود وجود میں آجائے اور کسی دوسرے وجود کا محتاج نہ ہو، لہذا ایسا موجود ہمیشہ ازلی و ابدی ہوگا اس لئے کہ کسی چیز کا معدوم ہونا اور کسی زمانہ میں نہ ہونا، اس بات کی دلیل ہے کہ اس کا وجود خود سے نہیں ہے بلکہ موجود دہونے کے لئے اسے کسی دوسرے موجود کی ضرورت ہے جو اس کے متحقق اور موجود ہونے کی شرط ہے یا اس کے فاقد ہوتے ہی اس کا مفقود ہونا ضروری ہے اور ممکن الوجود یعنی ایک ایسا موجود کہ جس کا وجود خود سے نہ ہو بلکہ اسے موجود ہونے کے لئے کسی دوسرے موجود کی ضرورت ہو۔ یہ تقسیم جو فرض عقلی کی بنیاد پر کی گئی ہے ایک ایسے وجود کی نفی کرتی ہے کہ جو متنع الوجود بالضرورة ہو، لیکن یہ اس بات پر دلالت نہیں کرتی کہ خارجی موجودات ممکن الوجود ہیں یا واجب الوجود یا دوسرے الفاظ کے مطابق اس قضیہ کا صادق ہونا تین صورتوں میں تصور کیا جاسکتا ہے، ایک یہ کہ ہر موجود واجب الوجود ہو، دوسرے یہ کہ ہر موجود ممکن الوجود ہو، تیسرے یہ کہ بعض

موجودات ممکن الوجود اور بعض واجب الوجود ہوں، پہلے اور تیسرے فرض کی بنیاد پر واجب الوجود کا پایا جانا ثابت ہے لہذا اس فرضیہ کے سلسلہ میں تحقیق کرنا ہوگی کہ کیا ممکن ہے کہ تمام موجودات ممکن الوجود ہوں یا ایسا ہونا غیر ممکن ہے؟ اس فرضیہ کو باطل کرنے کے ذریعہ واجب الوجود کا وجود بطور قطعی ثابت ہو سکتا ہے، اگرچہ وحدت اور بقیہ صفات کو ثابت کرنے کے لئے دوسرے دلائل کی ضرورت ہے۔

لہذا دوسرے فرضیہ کو باطل کرنے کے لئے ایک دوسرے مقدمہ کو اس برہان میں شامل کرنا ہوگا، اور وہ یہ ہے کہ تمام موجود کا ممکن الوجود ہونا محال ہے، لیکن چونکہ یہ مقدمہ بدیہی اور آشکار نہیں ہے لہذا اس طرح اسے ثابت کرنے کی کوشش کی گئی کہ ممکن الوجود کو علت کی ضرورت ہے اور علتوں میں تسلسل محال ہے لہذا اس صورت میں علتوں کے تسلسل کو ایک ایسے موجود پر ختم ہونا ہوگا کہ جو کسی دوسری علت کا محتاج نہ ہو یعنی واجب الوجود ہو ہمیں سے فلسفی مفاہیم کا سلسلہ شروع ہوتا ہے کہ جس کی وضاحت کرنا نہایت ضروری ہے۔

علت اور معلول

اگر کوئی موجود کسی دوسری موجود کا محتاج ہو، اور اس کا وجود دوسرے کے وجود پر منحصر ہو تو اسے فلسفہ کی اصطلاح میں محتاج موجود کو ۲۴۹۲۴۹ معلول، اور دوسرے کو ۲۴۹۲۴۹ علت، کہا جاتا ہے، لیکن علت کے لئے یہ ممکن ہے کہ وہ مطلقاً محتاج نہ ہو، بلکہ وہ خود بھی کسی دوسری علت کی طرف نسبت دیتے ہوئے معلول اور اس کی محتاج ہو، اگر علت کسی بھی نیاز مندی سے مبرا ہو تو اسے علت مطلق کہا جاتا ہے۔ یہاں تک ہم فلسفی اصطلاح علت و معلول اور ان کی تعریفوں سے آشنا ہوئے ہیں، اب اس کے بعد اس مقدمہ کی وضاحت ضروری ہے (کہ ہر ممکن الوجود کو علت کی ضرورت ہے) چونکہ ممکن الوجود کا وجود خود سے نہیں ہوتا لہذا وہ اپنے متحقق ہونے کے لئے کسی دوسرے موجود کا محتاج ہے، اس لئے کہ یہ قضیہ بدیہی اور آشکار ہے کہ ہر وہ محمول جسے موضوع کے لئے انتخاب کیا جاتا ہے یا تو وہ خود بخود (بالذات) ثابت ہے، یا کسی دوسرے کی وجہ سے (بالغیر) اس کا ثبوت ہے جیسے کہ

ایک شی یا تو خود بخود روشن ہے یا پھر کسی دوسری شی کی وجہ سے روشن ہوتی ہے، اور اس طرح ایک جسم یا تو خود بخود روغنی ہے یا پھر کسی دوسری شی کے ذریعہ اسے روغنی بنایا گیا ہے، لہذا یہ امر محال ہے کہ کوئی شینہ تو خود بہ خود روشن ہو، نہ ہی کسی شی کی وجہ سے روشن ہوئی ہو، در آں حالیکہ وہ روشن ہے، اسی طرح ایک جسم نہ خود بہ خود بالذات روغنی ہو اور نہ ہی کسی دوسری شی کی وجہ سے روغنی ہوا ہو، اور اس کے باوجود بھی روغنی ہو تو یہ محال ہے۔

پس ایک موضوع کے لئے وجود کا ثابت ہونا یا تو بالذات ہے یا بالغیر، اگر بالذات نہیں ہے تو ضرور بالغیر ہے، لہذا ہر ممکن الوجود جو خود بخود وجود سے متصف نہیں ہوا ہے وہ حتماً دوسری شی کے ذریعہ فیض وجود سے مستفیض ہوگا، پس یہ وہی مسئلہ حقیقت کہ جکوہم نے پہلے بیان کیا ہے کہ ہر ممکن الوجود علت کا محتاج ہے لیکن بعض لوگوں نے یہ گمان کر لیا ہے کہ اصل علت کا معنی یہ ہے کہ (ہر موجود علت کا محتاج ہے) لہذا ان لوگوں نے یہ اشکال کیا ہے کہ پھر خدا کے لئے بھی علت ہونی چاہیے، لیکن وہ لوگ اس نکتہ سے غافل ہیں کہ اصل علت (موجود) بطور مطلق نہیں ہے بلکہ اس کا موضوع (ممكن الوجود) اور (معلول) ہے یا دوسری تیسیر کے مطابق ہر موجود محتاج علت کا محتاج ہے نہ ہر موجود۔

علتوں کے تسلسل کا محال ہونا

اس مقدمہ میں وہ آخری برہان جس کا استعمال ہوا ہے وہ یہ ہے کہ علتوں کا سلسلہ ایک ایسے موجود پر تمام ہو جو خود کسی کا معلول نہ ہو اس لئے کہ علتوں کا یہ نہایت تسلسل محال ہے اور اس طرح واجب الوجود کا وجود ثابت ہو جاتا ہے علت خود بخود موجود ہے اور کسی دوسرے وجود کی محتاج نہیں۔ فلاسفہ نے تسلسل کو باطل کرنے کے لئے متعدد دلیلیں پیش کی ہیں لیکن حقیقت تو یہ ہے کہ علتوں کے سلسلہ میں تسلسل کا باطل ہونا آٹکا رہے جو ایک معمولی فکدے سے سمجھ میں آ جاتا ہے، یعنی چونکہ وجود معلول علت سے وابستہ اور اسی کے ذریعہ قائم ہے، اگر یہ فرض کر لیں کہ اس کی معلولیت عمومی ہے تو اس صورت میں کوئی موجود وجود میں نہیں آسکتا، اس لئے کہ چند وابستہ موجودات کا ان کے مقابل موجود کے وجود ہونے کے بغیر فرض کرنا معقول نہیں ہے۔

آپ یہ فرض کریں کہ دوڑ کے میدان میں ایک ٹیم طے کی جانے والی مسافت کے آغاز میں کھڑی ہے، اور سب کے سب دوڑنے کے لئے بالکل آمادہ ہیں، لیکن ہر ایک کا یہی ارادہ ہے کہ جب تک دوسرا نہیں دوڑتا وہ بھی نہیں دوڑے گا، یہ ارادہ اگر واقعاً عمومیت سے متصف ہو تو پھر ان میں سے کوئی بھی دوڑنے کے لئے قدم نہیں اٹھا سکتا، اسی طرح اگر ہر موجود کا وجود میں آنا دوسرے موجود کے وجود میں آنے پر منحصر ہو تو پھر کبھی بھی کوئی موجود وجود میں نہیں آ سکتا، لہذا خارجی موجودات کا وجود میں آنا، اس بات کی علامت ہے کہ کوئی بے نیاز او غنی موجود ہے۔

تقریر برہان

گذشتہ بیان کئے گئے مقدمات کی روشنی میں ایک بار پھر اسی برہان کا تکرار کرتے ہیں ہر وہ چیز جسے موجود کہا جاسکتا ہو وہ دو حال سے خارج نہیں، یا تو اس کے لئے وجود ضروری ہے یعنی وہ خود بخود موجود ہے کہ جسے اصطلاح میں (واجب الوجود) کہا جاتا ہے یا پھر اس کے لئے وجود کی ضرورت نہیں ہے بلکہ وہ کسی دوسرے وجود کی برکت سے عالم وجود میں آیا ہے تو اسے اصطلاح میں (ممكن الوجود) کہا جاتا ہے اور یہ بات روشن ہے کہ جس چیز کا وجود محال ہو اس کا موجود ہونا غیر ممکن اور کسی بھی صورت میں اسے موجود کا نام نہیں دیا جاسکتا لہذا ہر موجود یا واجب الوجود ہے یا ممکن الوجود۔

مفہوم (ممكن الوجود) میں غور و فکر کرنے کے بعد یہ معلوم ہوتا ہے کہ جوشی بھی اس مفہوم کی مصداق بنے وہ علت کی محتاج ہوگی، اس لئے کہ جب کوئی موجود خود بخود موجود میں نہ آیا ہو تو مجبوراً کسی دوسرے موجود کے ذریعہ وجود میں آیا ہے جیسا کہ ہر وہ وصف جو بالذات نہ ہو تو اس کا بالغیر ہونا ضروری ہے اور قانون علیت کا مفاد بھی یہی ہے کہ ہر وابستہ اور ممکن الوجود، کسی نہ کسی علت کا محتاج ہے کیا یہ کہنا درست ہے کہ بے علت خدا پر اعتقاد رکھنا قانون علیت کو توڑنا ہے! اور اگر ہر ممکن الوجود علت کا محتاج ہو تو کسی بھی حال میں کوئی موجود محقق نہیں ہو سکتا، یہ فرض بالکل اسی طرح ہے جس میں ہر فرد اگر اپنے اقدام کو دوسرے کے آغاز پر

مشروط کر دے تو پھر کسی قسم کا کوئی اقدام وقوع پذیر نہیں ہو سکتا، لہذا خارجی موجودات کا وجود اس بات کی دلیل ہے کہ کوئی واجب الوجود موجود ہے۔

سوالات

- ۱۔ امکان اور وجوب کی اصطلاح کو منطقی اور فلسفی اعتبار سے بیان کریں؟
- ۲۔ واجب الوجود اور ممکن الوجود کی تعریف کریں؟
- ۳۔ تقسیم عقلی کی بنیاد پر واجب الوجود اور ممکن الوجود کی کتنی صورتیں فرض کی جاسکتی ہیں؟
- ۴۔ علت اور معلول کی تعریف کریں؟
- ۵۔ اصل علیت کا مفاد کیا ہے؟
- ۶۔ کیوں ہر ممکن الوجود کے لئے علت کی ضرورت ہے؟
- ۷۔ کیا اصل علیت کا تقاضہ یہ ہے کہ خدا کے لئے بھی کسی علت کا ہونا ضروری ہے؟ کیوں؟
- ۸۔ کیا بدون خالق خدا پر اعتقاد اصل علیت کا نقض کرنا ہے؟
- ۹۔ علتوں کے درمیان تسلسل کے محال ہے، بیان فرمائیں؟
- ۱۰۔ اس برہان کی شکل منطقی کو بیان کریں اور واضح کریں کہ اس سے کون سا مطلب ثابت ہوتا ہے؟

آٹھواں درس

خدا کی صفات

مقدمہ

گذشتہ دروس میں ہم نے اس بات کو واضح کر دیا ہے کہ فلسفی دلائل کا نتیجہ ایک ایسے موجود کا ثابت کرنا ہے جو بعنوان (واجب الوجود) ہے اور دوسرے دلائل کے ذریعہ اس کے سلبی اور ثبوتی صفات کو ثابت کیا جاتا ہے تاکہ خداوند عالم اپنے مخصوص صفات کے ذریعہ مخلوقات کے دائرے سے الگ ہو کر پہچانا جائے، اس لئے کہ معرفت کے لئے صرف واجب الوجود کی حیثیت سے جاننا کافی نہیں ہے، کیوں؟ اس لئے کہ ممکن ہے کہ کوئی شخص یہ خیال کرے کہ مادہ یا انرجی (قوت و طاقت) بھی واجب الوجود کا مصداق بن سکتے ہیں، لہذا اس کی سلبی صفات ثابت ہونا چاہیے تاکہ اس طرح یہ معلوم ہو جائے کہ واجب الوجود کی ذات، ان صفات سے منزہ ہے جو مخلوقات میں پائی جاتی ہیں اور اس کی صفات مخلوقات پر صادق نہ آسکتی اسی طرح اس کی صفات ثبوتیہ کا بھی ثابت ہونا ضروری ہے تاکہ یہ ثابت ہو جائے کہ وہ لائق پرستش و عبادت ہے، اور دوسرے عقائد، نبوت، معاد اور فروع کے اثبات کا راستہ آسان ہو جائے۔

گذشتہ برہان و دلیل سے یہ ثابت ہو گیا کہ واجب الوجود کو علت کی ضرورت نہیں ہے، بلکہ وہ ممکنات کے لئے خود علت ہے، یا دوسری تعبیر کے مطابق واجب الوجود کے لئے دو صفت ثابت ہیں ایک یہ کہ وہ ہر شے سے بے نیاز ہے، اس لئے کہ اگر اس میں معمولی سے احتیاج بھی پائی گئی تو وہ جس شے کا محتاج ہوگا وہ شے اس کی علت بن جائے گی، کیونکہ بخوبی ہمیں معلوم ہے کہ (فلسفی اصطلاح) میں علت کے معنی یہی ہیں کہ تمام موجودات اس کے محتاج ہوں اور دوسرے یہ کہ ممکن الوجود شے اس کی طرف نسبت دیتے ہوئے معلول ہیں، اور اس کی ذات تمام اشیاء کی پیدائش کی سب سے پہلی علت ہے۔ ان دو نقطوں کے بعد ان کے لوازمات

کو بیان کرنے کے ساتھ ساتھ، صفات سلبیہ اور صفات ثبوتیہ کو پیش کریں گے، البتہ انھیں ثابت کرنے کے لئے فلسفی اور کلامی کتابوں میں متعدد دلیلیں ذکر کی گئیں ہیں، اسی لئے ہم یہاں صرف یہاں بات کو آسانی سے سمجھنے کے لئے اور سلسلہ کلام کو ربط دیتے ہوئے انھیں دلائل کو ذکر کریں گے جو گذشتہ برائین سے مربوط ہوں۔

خدا کا ازلی و ابدی ہونا

اگر کوئی موجود کسی دوسرے موجود کا معلول اور اس کا محتاج ہو تو پھر اس کا وجود اسی کا تابع کہلائے گا اور علت کے جاتے ہی اس کا وجود مٹ جائے گا، یا دوسرے الفاظ میں یہ کہا جائے کہ کسی بھی موجود کا معدوم ہو جانا، اس کے ممکن الوجود ہونے کی علامت ہے، اور چونکہ واجب الوجود کا وجود خود بخود ہوتا ہے اور وہ اپنے وجود میں کسی کا محتاج نہیں ہوتا ہے لہذا وہ ہمیشہ ہمیشہ باقی بھی رہے گا۔ اس طرح واجب الوجود کے لئے دو صفتیں اور ثابت ہوتی ہیں، ایک اس کا ازلی ہونا، یعنی گذشتہ ادوار میں بھی تھا، اور دوسرا ابدی ہونا یعنی وہ مستقبل میں بھی باقی رہے گا، اور کبھی کبھی ان دونوں اصطلاحوں کو ایک کلمہ (سرمدی) کے تحت بیان کیا جاتا ہے۔ لہذا ہر وہ موجود جس میں سابقہ عدم یا امکان زوال ہو وہ کبھی بھی واجب الوجود نہیں ہو سکتا لہذا اس طرح سے تمام مادی تھنایا کے واجب الوجود ہونے کا مفروضہ باطل ہو جاتا اور اس کا باطل ہونا بہت زیادہ واضح و روشن ہے۔

صفات سلبیہ

واجب الوجود کے لوازمات میں سے ایک صفت بساطت اور اس کا مرکب نہ ہونا ہے، اس لئے کہ ہر مرکب شے کا اس کے اجزا کی جانب محتاج ہونا واضح ہے، جبکہ واجب الوجود ہر قسم کی احتیاج سے مبرا ہے۔ اور اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ واجب الوجود کے اجزا بالفعل نہیں ہیں بلکہ ایک لکیر کے ضمن میں دو لکیروں کا فرض کرنا ہے، تو یہ فرض بھی باطل ہے، اس لئے کہ وہ چیز جو بالقوہ اجزا کی مالک ہو وہ عقلاً تجزیہ کے قابل ہوگی، اگرچہ وہ خارج میں متحقق نہ ہو اور تجزیہ کے ممکن ہونے کا مطلب تمام امکان کا زائل ہونا ہے، چنانچہ اگر ایک میٹر لمبی لکیر کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا جائے تو اس کے بعد وہ ایک میٹر لمبی لکیر نہیں رہ سکتی، اور یہ مطلب

ہمیں پہلے معلوم ہو چکا ہے کہ واجب الوجود کے لئے زوال نہیں ہے۔ اور چونکہ بالفعل اجزا سے مرکب ہونا اجسام کا خاصہ ہے، لہذا اس سے یہ مطلب بھی واضح جاتا ہے کہ کوئی بھی جسمانی موجود واجب الوجود نہیں ہو سکتا یا ایک دوسری تعمیر کے مطابق اس کے ذریعہ خدا کا مجرد ہونا اور جسمانی نہ ہونا ثابت ہو جاتا ہے، نیز یہ مطلب بھی روشن ہو جاتا ہے کہ ذات خداوند متعال کو آنکھوں سے نہیں دیکھا جاسکتا اور ظاہری وسائل سے محسوس نہیں کیا جاسکتا، اس لئے کہ محسوس ہونا اجسام و جسمانیات کے خواص میں سے ہے جسمانیات کی نفی کے ذریعہ اجسام کے اپنے تمام خواص جیسے مکان و زمان سے متعلق ہونا بھی واجب الوجود سے سلب ہو جاتا ہے، اس لئے کہ مکان اس کے لئے متصور ہے جس میں حجم و امتداد ہو، اسی طرح ہر وہ شے جس میں زمانہ پایا جاتا ہو وہ محضہ اور امتداد زمانہ کے لحاظ سے قابل تجزیہ ہے اور یہ بھی ایک قسم کا امتداد اور اجزا بالقوہ کی ترکیب ہے، لہذا خدا کے لئے مکان و زمان کا تصور باطل ہے اور کوئی بھی مکان و زمان سے متصف موجود واجب الوجود نہیں ہو سکتا۔

سرا انجام، واجب الوجود سے زمان کی نفی کے ذریعہ حرکت و تغیر اور محال (کمال کی طرف جانے) کا تصور بھی باطل ہو جاتا ہے، اس لئے کہ زمان کے بغیر کوئی بھی حرکت اور تغیر غیر ممکن ہے۔ لہذا وہ لوگ جو خدا کے لئے مکان، جیسے عرش کے قائل ہوئے ہیں، یا اس سے حرکت اور آسمان سے نزول کی نسبت دی ہے یا اسے آنکھوں سے قابل دید سمجھا ہے یا اسے قابل تغیر اور حرکت جانا ہے، دراصل ان لوگوں نے خدا کو بخوبی درک نہیں کیا ہے۔ کئی طور پر ہر وہ منہوم جو کسی بھی انداز میں نقص، محدودیت یا احتیاج پر دلالت کرے خدا کے لئے متفی ہے، اور صفات سلویہ کا مطلب بھی یہی ہے۔ موجودات کو وجود بخشنے والی علت۔ گذشتہ دلیل کے ذریعہ جو مطلب واضح ہو چکا ہے وہ یہ ہے کہ واجب الوجود کمالات کی پیدائش کا سبب ہے، اب اس کے بعد اس مطلب کے دوسرے پہلو کے سلسلہ میں بحث کریں گے۔ پہلے مرحلہ میں علت کی اقام کی ایک مختصر وضاحت کرنے کے

^۱ مکان رکھنا، آسمان سے نازل ہونا اور آنکھوں سے دیکھائی دینے کا عقیدہ بعض اہل سنت کا ہے، تغیر و تکامل کا نظریہ فلاسفہ غرب کی ایک جماعت کا ہے جن میں سے ہگل، برگسون اور ویلیام جیمز ہیں، لیکن یہ معلوم ہونا چاہیے کہ تغیر اور حرکت کی نفی کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ ساکن ہے بلکہ اس کی ذات کے ثبات کے معنی میں ہے اور ثبات، تغیر کی نقیض ہے، لیکن سکون حرکت کے مقابلہ میں عدم ملکہ ہے، اور اس چیز کے علاوہ کہ جس میں حرکت کی قابلیت ہو کسی دوسری شے کے لئے نہیں بولا جاتا

بعد علتیت الہی کی خصوصیات بیان کریں گے۔ علت اپنے عام معنی میں ہر اس موجود کے لئے بولا جاتا ہے جو کسی دوسرے موجود سے وابستہ اور اس کے مد مقابل ہو، یہاں تک کہ یہ شروط اور مقدمات کو بھی شامل ہے اور خدا کے علت نہ رکھنے کے معنی یہ ہیں کہ وہ کسی بھی موجود سے وابستہ نہیں ہے، یہاں تک کہ اس کے لئے کسی قسم کی شرط یا معدی کا تصور نہیں کیا جاسکتا۔

لیکن مخلوقات کے مقابلہ میں خدا کے علت ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہ خلقت کو وجود بخشنے والا ہے، جو علت فاعلی کی ایک خاص قسم ہے، اس مطلب کی وضاحت کے لئے ہم مجبور ہیں کہ علت کی اقام کو اجالا بیان کریں، اور اس کی تفصیلی وضاحت کو فلسفی کتابوں کے حوالہ کرتے ہیں۔ ہمیں یہ بخوبی معلوم ہے کہ ایک سہرے کے اگنے اور بڑھنے کے لئے مناسب ج، زمین، خاکہ آب و ہوا وغیرہ کی ضرورت ہے، اور یہ بھی طبعی ہے کہ اسے کوئی زمین میں بوئے، اور اس کی آبیاری کرے، مذکورہ علت کی تعریف کے مطابق جو کچھ ذکر کیا گیا وہ سہرے کے رشد و نمو کی علتیں ہیں۔

ان مختلف علتوں کو مختلف نظریات اور عقائد کے تحت چند اقسام میں تقسیم کیا جاسکتا ہے جیسے علتوں کا وہ مجموعہ کہ جس کا وجود معلول کے لئے ہمیشہ ہونا ضروری ہے (علت حقیقی) اور علتوں کا وہ مجموعہ کہ جس کی بقا، معلول کی بقا کے لئے لازم نہیں ہے (جیسے سہرہ کے لئے کسان) (علت اعدادی) یا (معدات) کہا جاتا ہے، اسی طرح جانشین پذیر علتوں کو (علت جانشینی) اور بقیہ علتوں کو (کلت انحصاری) کا نام دیا جاتا ہے۔

لیکن ایک علت اور بھی ہے جو ان تمام علتوں سے متفاوت ہے جسے سہرہ کی رشد کے لئے ذکر کیا گیا ہے، جسے بعض نفسانی قضایا میں ملاحظہ کیا جاسکتا ہے، جب انسان اپنے ذہن میں کسی کی صورت کو خلق کرتا ہے یا کسی امر کے انجام دینے کا ارادہ بناتا ہے تو اس کے ساتھ فوراً ہی ایک نفسانی اثر بنام (صورت ذہنی) اور (ارادہ) متحقق ہوتا ہے کہ جس کا وجود، نفس کے وجود سے وابستہ ہے اسی وجہ سے اسے اس کا معلول مانا جاتا ہے، لیکن معلول کی یہ قسم ایسی ہے کہ جو اپنی علت سے کسی بھی اعتبار سے مستقل و بیز نیاز نہیں

^۱ علل اعدادی کو کہا جاتا ہے۔

ہے اور وہ کبھی بھی اس سے جدا ہو کر مستقل نہیں رہ سکتی، اس کے علاوہ نفس کی فاعلیت صورت ذہنی یا ارادہ کی طرف نسبت دیتے ہوئے ان شرائط سے مشروط ہے کہ جس کی وجہ سے نقص، محدودیت اور ممکن الوجود ہونا لازم آتا ہے، لہذا جہان کے لئے واجب الوجود کی فاعلیت قضایا ئے ذہنی کے لئے نفس کی فاعلیت سے بالاتر ہے کہ جس کی نظیر تمام فاعلوں میں نہیں ملتی اس لئے کہ وہ کسی بھی احتیاج کے بغیر اپنے اس معلول کو وجود میں لاتا ہے کہ جس کی تمام ہستی اس سے وابستہ ہے۔

وجود بحثی والی علت کی خصوصیات

اب تک جو کچھ ہم نے بیان کیا ہے اس کے مطابق وجود آفرین علت (وجود بحثی والی علت) کی چند خصوصیات بیان کی جاسکتی ہیں۔ ۱۔ علت وجود آفرین کو اپنے معلولات کے تمام کمالات سے بخوا حسن واکمل متصف ہونا ضروری ہے تاکہ وہ ہر موجود میں اس کی ظرفیت کے مطابق اضافہ کر سکے برخلاف علت ۲۴۹۲۴۹ مادی، و علت ۲۴۹۲۴۹ معدی، کہ وہ فقط اپنے معلولات میں تغیر و تحول ایجاد کرتی ہے، اس کے لئے لازم نہیں ہے وہ ان تمام کمالات کے مالک ہوں جیسے کہ خاک کے لئے یہ لازم نہیں ہے کہ اس میں سبزہ کی تمام خصوصیات ہوں یا ماں باپ اپنی اولاد کی خصوصیات سے متصف ہوں، لیکن وجود آفرین خدا کا اپنی باطت کے باوجود تمام کمالات وجودی سے متصف ہونا ضروری ہے۔

۲۔ علت وجود آفرین اپنے معلول کو عدم سے وجود میں لاتا ہے اور اس کی خلقت کے ساتھ اس میں کسی قسم کی کوئی کمی وقع نہیں ہوتی، لیکن فاعل طبعی کا حال بالکل اس سے متفاوت ہے کہ جن کا کام صرف معلول کے میں تغیر ایجاد کرنا اور قوت و طاقت صرف کرنا ہے اور اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ مخلوقات کی خلقت سے واجب الوجود سے کوئی چیز کم ہو جاتی ہے تو اس کا مطلب یہ

^۱ یہ معلوم ہونا چاہیے کہ مخلوقات کے کمالات کے حاصل ہونے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ان کے مفاہیم (جیسے مفہوم جسم و انسان) بھی خدا پر قابل صدق ہوں، اس لئے کہ ایسے مفاہیم محدود اور ناقص موجودات پر دلالت کرتے ہیں، اسی وجہ سے خدا پر قابل صدق نہیں ہیں کہ جو بے نہایت کمالات کا مالک ہے لہذا جو کچھ بھی بعض اہل سنت کے متکلمین سے نقل ہوا ہے کہ عالم اپنی بقا میں خدا کا محتاج نہیں ہے، یا بعض اقوال جو غریبی فلسفہ سے نقل ہوئے ہیں کہ جہان طبیعت کی مثال ایک گھڑی کی طرح ہے ہمیشہ کے لئے اس میں چابی بھر دی گئی ہے جسے اپنی حیات کو جاری رکھنے کے لئے خدا کی ضرورت نہیں ہے یہ سب کچھ حقیقت کے برخلاف ہے بلکہ جہان ہستی ہمیشہ پر دور اور تمام حالات میں خدا کی محتاج ہے، اور اگر وہ (حق تعالیٰ) ایک لحظہ کے لئے بھی افاضہ ہستی سے نظر پھیر لے، تو اس کا وجود مٹ جائیگا۔

ہے کہ ذات الہی میں تجزیہ پذیری ممکن ہے جبکہ اس کا باطل ہونا ثابت ہو چکا ہے۔ ۳۔ علت وجود آفرین ایک حقیقی علت ہے جس کا معلول کی بقا کے لئے باقی رہنا ضروری ہے لیکن علت اعدادی میں معلول کی بقا، علت کی بقا سے وابستہ نہیں ہے۔

سوالات

- ۱۔ صفات خدا کی پہچان کیوں ضروری ہے؟
- ۲۔ گذشتہ برہان سے کیا نتیجہ حاصل ہوتا ہے؟
- ۳۔ خدا کے ازلی و ابدی ہونے کو ثابت کریں؟
- ۴۔ کس طرح ذات خدا کے بیٹھ ہونے اور اجزا بالفعل و بالقوہ سے مبرا ہونے کو ثابت کیا جاسکتا ہے؟
- ۵۔ خدا کے جہانی نہ ہونے کی دلیل کیا ہے؟
- ۶۔ کیوں خدا کو دیکھا نہیں جاسکتا؟
- ۷۔ کس دلیل کی بنیاد پر خدا مکان و زمان نہیں رکھتا؟
- ۸۔ کیا حرکت و سکون کو خدا سے نسبت دی جاسکتی ہے؟ کیوں؟
- ۹۔ علت کی قسمیں بیان کریں؟
- ۱۰۔ علت وجود آفرین کی خصوصیات کی شرح بیان کریں؟

نواں درس

صفات ذاتیہ

مقدمہ

ہمیں یہ معلوم ہے کہ خداوند عالم علت وجود آفرین کائنات ہے، جس میں تمام کمالات جمع ہیں اور موجودات میں پائی جانے والی تمام صفتیں اور کمالات اسی کی ذات سے وابستہ ہیں، لیکن بندوں میں کمالات کے افاضہ سے اس کے اندر کوئی کمی وقع نہیں ہوتی، تقریب ذہن کے لئے اس مثال کا سہارا لیا جاسکتا ہے، کہ استاد اپنے شاگرد کو جو کچھ اپنے علم سے فائدہ پہنچاتا ہے اس کی وجہ سے استاد کے علم میں کوئی کمی وقع نہیں ہوتی، البتہ خدا کی جانب سے وجود اور وجودی کمالات کا افاضہ اس مثال سے کہیں زیادہ بالاتر ہے، شاید اس ضمن میں سب سے واضح تعمیر یہ ہو کہ عالم ہستی ذات مقدس الہی کا جلوہ ہے، جسے اس آیت کریمہ سے استفادہ کیا جاسکتا ہے، (اللہ نُورُ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ^۱)، خدا تو سارے آسمان اور زمین کا نور ہے۔

الہی کمالات کے لامتناہی ہونے کے پیش نظر ہر وہ مفہوم جو نقص و محدودیت سے پاک ہو اور کمال ہونے پر دلالت کرتا ہو اسے خدائے وحدہ لا شریک کے لئے استعمال کیا جاسکتا ہے، جیسا کہ قرآنی آیات اور ائمہ معصومین کی طرف سے صادر ہونے والی احادیث، ادعیہ، اور مناجاتوں میں نور، کمال، جمال، محبت اور بھت جیسے مفہیم استعمال ہوئے ہیں، لیکن جو کچھ فلسفہ و کلام کتابوں میں صفات الہی کے عنوان سے ذکر کیا گیا ہے، ان کی دو قسمیں ہیں، (صفات ذاتیہ اور فعلیہ) لہذا پہلے مرحلہ اول میں اس تقسیم کی وضاحت کے بعد، ان میں سے اہم ترین صفات کے سلسلہ میں بحث کریں گے۔

^۱ سورۃ نور، آیت/۳۵.

صفات ذاتیہ اور فعلیہ

وہ صفات جسے خدا کی ذات سے نسبت دی جاتی ہے وہ یا تو وہ مفہیم میں جو ذات احدیت میں موجودہ کمالات سے حاصل ہوتے ہیں جیسے حیات، علم اور قدرت، یا پھر وہ مفہیم ہیں جو عبد اور معبود کے درمیان رابطہ سے حاصل ہوتے ہیں جیسے خالقیت، رازقیت لہذا پہلی قسم کو صفات ذاتیہ اور دوسری قسم کو صفات فعلیہ کہا جاتا ہے۔ صفات کی ان دو قسموں میں فرق یہ ہے کہ پہلی قسم میں، خدا ان صفات کے لئے عینی مصداق ہے لیکن دوسری قسم میں خالق و مخلوق کے درمیان موجودہ نسبت کی حکایت ہے، ذات الہی اور مخلوقات دو طرفہ حیثیت سے پہچانے جاتے ہیں، جیسے کہ صفت خالقیت مخلوقات کی ذات، وجود خدا سے وابستگی کی بنا پر اخذ ہوتی ہے اور اس نسبت کی تشکیل اس کی دو طرفہ، خدا، و مخلوق سے ہوتی ہے خارج میں ذات مقدس الہی اور مخلوقات کے علاوہ کسی تیسری شے کا کوئی وجود نہیں ہے۔

البتہ خداوند متعال خلقت کی قدرت سے متصف ہے لیکن (قدرت) اس کی ذاتی صفات میں سے ہے اور ۲۴۹۲۴۹ خلق کرنا، ایک ایسا مفہوم ہے جو اضافی ہونے کے ساتھ مقام فعل سے ظہور میں آتا ہے، اسی وجہ سے (خالقیت) کا شمار صفات فعلیہ میں کیا جاتا ہے، مگر یہ کہ (خلق پر قادر) ہونے کے معنی لئے جائیں تو اس صورت میں اس کی بازگشت بھی صفت قدرت کی طرف ہوگی۔ حیات و علم اور قدرت خدا کی معم ترین صفات ذاتیہ میں سے ہیں۔

لیکن اگر سمیع و بصیر بہ معنی، سنی اور دیکھی جانے والی چیزوں کا علم رکھنے والا ہو، یا سمع و ابصار کے معنی میں ہوں تو ان صفات کی بازگشت علیم و قدیر ہے اور اگر ان صفات کا مطلب بالفعل دیکھنا اور سننا ہو جو سنی اور دیکھی جانے والی اشیا اور سننے اور دیکھنے والوں کے درمیان موجودہ رابطہ سے حاصل ہوتے ہیں تو انھیں صفات فعلیہ میں سے شمار کیا جائے گا، جیسا کہ کبھی (علم) بھی اسی عنایت کے لئے استعمال ہوتا ہے اور اسے (علم فعلی) کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ بعض متکلمین نے کلام اور ارادہ کو بھی صفات ذاتیہ میں سے شمار کیا ہے کہ جن کے سلسلہ میں آئندہ بحث کی جائے گی۔

صفات ذاتیہ کا اثبات

قدرت و حیات اور علم الہی کو ثابت کرنے کے لئے سب سے آسان راستہ یہ ہے کہ جب ان مفاہیم کو مخلوقات کے سلسلہ میں استعمال کیا جاتا ہے تو یہ اوصاف اس کے کمالات پر دلالت کرتے ہیں، لہذا ان صفات کی علت یعنی ذات الہی میں، بطور کامل ہونا ضروری ہے، اس لئے کہ مخلوقات میں پائی جانے والی تمام صفات و کمالات خدا کی طرف سے ہیں لہذا عطا کرنے والے کے پاس ایسے اوصاف ہونا ضروری ہیں تاکہ وہ دوسروں کو عطا کر سکے، اس لئے کہ یہ ممکن نہیں ہے کہ حیات عطا کرنے والا خود حیات سے سرفراز نہ ہو یا مخلوقات کو علم و قدرت عطا کرنے والا خود جاہل و ناتواں ہو لہذا مخلوقات میں مشاہدہ ہونے والے کمالات اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ خدا بھی ان کمالات کا بغیر کسی کمی و کسر کے حامل ہے یا دوسری تعمیر کے مطابق خدا لاقتناہی علم و قدرت اور حیات کا مالک ہے اب اس کے بعد ان صفات کی وضاحت کرتے ہیں۔

حیات

حیات کا مفہوم دو طرح کی مخلوقات کے لئے استعمال کیا جاتا ہے ایک سبزہ اور گھاس پھوس جن میں رشد و نمو کی صلاحیت ہوتی ہے، دوسرے حیوان اور انسان کہ جو ارادہ اور شعور سے متصف ہیں لیکن پہلا معنی، نقص و احتیاج کا مستلزم ہے اس لئے کہ رشد و نمو کا لازمہ یہ ہے کہ موجود اپنے آغاز میں اس کمال سے عاری ہو بلکہ خارجی عوامل کے نتیجہ میں حاصل ہونے والے تغیرات سے آہستہ آہستہ کمالات کا مالک بن جائے، اور ایسا امر خدا سے منسوب نہیں کیا جاسکتا، جیسا کہ صفات سلیبہ میں گذر چکا ہے۔

لیکن حیات کا دوسرا معنی، ایک کمالی مفہوم ہے، ہر چند اس کے امکانی مصادیق نقص کے ہمراہ ہیں لیکن پھر بھی اس کے لئے لاقتناہی مقام فرض کیا جاسکتا ہے کہ جس میں کسی قسم کی کوئی محدودیت اور نقص کا شائبہ نہ ہو، جیسا کہ مفہوم وجود اور مفہوم کمال میں بھی ایسا ہی ہے۔ حیات اپنے اس معنی میں کہ جو علم اور فاعلیت ارادی کا ملازم ہے یقیناً وجود غیر مادی ہوگا اگرچہ حیات کو مادی امور یعنی جاندار کے لئے استعمال کیا جاتا ہے، لیکن اصل میں وہ ارواح کی صفت ہے اور بدن کا روح سے رابطہ ہونے کی وجہ سے حیات

کو بدن سے متصف کیا جاتا ہے یا دوسرے الفاظ میں یہ کہ جس طرح امتداد، شئی جہانیت کا لازمہ ہے، حیات بھی وجود مجرد (غیر جہانی) کا لازمہ ہے لہذا اس طرح حیات خدا پر ایک اور دلیل ایک دلیل متحقق ہو گئی اور وہ یہ ہے کہ ذات مقدس الہی مجرد اور غیر جہانی ہے جیسا کہ گذشتہ دروس میں اسے ثابت کیا جا چکا ہے اور ہر موجود مجرد، حیات سے سرفراز ہے، لہذا اس طرح خدا متعال بھی ذاتاً حیات کا مالک ہے۔

علم

علم کا مفہوم تمام مفہیم میں ہر ایک سے زیادہ واضح و روشن ہے، لیکن مخلوقات کے درمیان اس کے مصداقی محدود اور ناقص ہیں، لہذا ان خصوصیات کے ساتھ یہ خدا پر قابل اطلاق نہیں ہے لیکن جیسا کہ پہلے اشارہ کیا جا چکا ہے کہ عقل میں اتنی توانائی ہے کہ وہ اس مفہوم کمالی کے لئے ایک ایسے مفہوم کا انتخاب کرے کہ جس میں کسی قسم کی کوئی محدودیت اور نقص نہ ہو بلکہ عالم ہونا اس کی عین ذات ہو، علم خدا کے ذاتی ہونے کے یہی معنی ہیں۔

خدا کے علم کو متعدد راستوں سے ثابت کیا جاسکتا ہے، ایک وہی راستہ ہے کہ جس کی طرف تمام صفات ذاتیہ کے اثبات کے لئے اشارہ کیا جا چکا ہے، یعنی چونکہ مخلوقات کے درمیان علم پایا جاتا ہے لہذا خالق کی ذات میں اس کی کامل صورت کا ہونا ضروری ہے۔ دوسرا راستہ دلیل نظم کی مدد سے حاصل ہوتا ہے وہ یہ کہ ایک مجموعہ جس قدر نظم و ضبط کا حامل ہوگا اتنا ہی اس کے ناظم کے علم پر دلالت کرے گا، جس طرح سے کہ ایک علمی کتاب یا خوبصورت شعر یا کوئی نقاشی (آرٹ) وجود بخشنے والے کے ذوق اور اس کے علم و دانش پر دلالت کرتے ہیں اور کبھی بھی کوئی عاقل یہ تصور نہیں کر سکتا کہ ایک فلسفی یا کوئی علمی کتاب کسی جاہل یا نادان شخص کے ہاتھوں لکھی گئی ہوگی لہذا کیسے یہ تصور کیا جاسکتا ہے کہ ایسا نظم یافتہ جہان کسی جاہل موجود کا خلق کردہ ہے؟ تیسرا راستہ نظریہ جو ہے مقدمات فلسفی (غیر بدیہی) کے ذریعہ حاصل ہوتا ہے جیسے یہ قاعدہ کہ ہر موجود جو مستقل ہو اور مجرد عن المادہ ہو وہ علم سے متصف ہوگا جیسا کہ یہ امر اس سے مربوط کتابوں میں ثابت کیا جا چکا ہے۔

علم الہی کی طرف توجہ دینا خود سازی کے ۲۹۲ باب میں غیر معمولی اہمیت کا حامل ہے اور اسی وجہ سے قرآن کریم میں اس کی طرف بار بار اشارہ کیا گیا ہے۔ (يَعْلَمُ خَائِنَةَ الْأَعْيُنِ وَمَا تُخْفِي الصُّدُورُ)۔ خدا خائن آنکھوں اور دل کے رازوں سے آگاہ ہے۔

قدرت

وہ فاعل کہ جو امور کو اپنے ارادہ سے انجام دیتا ہے اس کے لئے کہا جاتا ہے کہ وہ اپنے امور میں صاحب ”قدرت“ ہے، لہذا قدرت یعنی فاعل مختار کا ہر اس امر کو انجام دینے کا ارادہ کہ جس کا اس سے صادر ہونے کا امکان ہے، جو فاعل جس قدر مرتبہ وجودی کی رو سے کامل ہوگا اس کی قدرت بھی اتنی ہی وسیع ہوگی، پس جو فاعل اپنے کمال میں لائق ہی ہو اس کی قدرت بھی بے نہایت ہوگی۔ (ان اللہ علی کل شیء قدير^۱)۔ خداوند عالم ہر چیز پر قادر ہے۔

اس مقام پر چند نکات کی طرف اشارہ کرنا لازم ہے۔ ۱۔ جو امر قدرت سے متعلق ہوگا اس میں امکان تحقق کا ہونا ضروری ہے، لہذا جو شئی اپنی ذات کے اعتبار سے محال ہو وہ قدرت کا متعلق نہیں بن سکتی، اور خدا کا صاحب قدرت ہونے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ خدا اپنی مثل بھی خلق کر سکتا ہے (اس لئے کہ خدا خلق نہیں کیا جاسکتا) یا دو کا عدد دو ہوتے ہوئے تین سے بڑا ہو جائے یا ایک فرزند کو فرزند ہوتے ہوئے باپ سے پہلے خلق کر دے۔

۲۔ ہر کام کے انجام دینے کی قدرت کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ ان سب کو انجام دے، بلکہ وہ جسے چاہے گا انجام دے گا، اور جسے چاہے گا انجام نہیں دے گا حکیم خدا، حکیمانہ فعل کے علاوہ کوئی اور فعل انجام نہیں دے سکتا اگرچہ وہ غیر حکیمانہ امور کے انجام دینے پر بھی قادر ہے انشاء اللہ آئندہ دروس میں حکمت خدا کے سلسلے میں مزید وضاحت کی جائے گی۔

^۱ سورۃ غافر، آیت / ۱۹۔

^۲ سورۃ بقرہ آیت / ۲۰، اور دوسری آیات۔

۳۔ قدرت کے جو معنی بیان ہوئے ہیں اس میں اختیار کے معنی بھی ہیں، خدا جس طرح بے نہایت قدرت کا مالک ہے اسی طرح لامحدود اختیارات سے سرفراز ہے، اور کوئی خارجی عامل اسے کسی عمل کے لئے زبردستی یا اس سے قدرت کو چھین لینے کی طاقت نہیں رکھتا اس لئے کہ ہر موجود کی قدرت اور اس کا وجود خود اسی کا مرہونِ منت ہے، لہذا وہ کبھی بھی اس طاقت کے مقابلہ میں مغلوب نہیں ہو سکتا کہ جسے اس نے دوسروں کو عطا کیا ہے۔

سوالات

- ۱۔ خدا کے لئے کن مفاہیم کو استعمال کیا جاسکتا ہے؟
- ۲۔ صفات ذاتیہ و فعلیہ کی تعریف کریں اور ان دونوں کے درمیان کا فرق بیان کریں؟
- ۳۔ صفات ذاتیہ کو ثابت کرنے کے لئے ایک کلی ضابطہ کیا ہے؟
- ۴۔ حیات کتنے معانی میں استعمال ہوتا ہے اور کون سے معنی کا استعمال خدا کے لئے درست ہے
- ۵۔ حیات الہی پر خاص دلیل کیا ہے؟
- ۶۔ علم الہی کو تینوں راستوں (طریقوں) سے ثابت کریں؟
- ۷۔ مفہوم قدرت کو بیان کریں اور خدا کی نامحدود قدرت کو ثابت کریں؟
- ۸۔ کون سی چیزیں قدرت سے متعلق نہیں ہوتیں؟
- ۹۔ کیوں خدا ناپسند امور کو انجام نہیں دیتا؟

۱۰۔ خدا کے مختار ہونے کا مطلب کیا ہے؟

دسواں درس

صفات فعلیہ

مقدمہ

جیسا کہ گذشتہ دروس میں بیان کیا جا چکا ہے کہ صفات فعلیہ یعنی وہ مفاہیم جو ذات الہی اور اس کی مخلوقات کے درمیان پائے جانے والے رابطہ سے حاصل ہوتے ہیں کہ جن میں طرفین خالق و مخلوق ہیں، جیسے کہ خلق کرنے کا مفہوم مخلوقات کا، خدائے متعال سے وابستہ ہونے کی وجہ سے حاصل ہوتا ہے، لہذا اس اگر اس رابطہ کا لحاظ نہ کیا جائے تو یہ مفہوم حاصل نہیں ہو سکتا۔ خالق و مخلوق کے درمیان لحاظ کیا جانے والا رابطہ غیر محصور ہے، لیکن پھر بھی اس کی دو قسمیں کی جا سکتی ہیں، پہلی قسم وہ روابط ہیں جو مستقیماً خالق و مخلوق کے درمیان ملاحظہ کئے جاتے ہیں جیسے ایجاد، خلق اور ابداع وغیرہ، اور دوسری قسم ان روابط کی ہے جو چند دوسرے روابط کے ذریعہ وجود میں آتے ہیں جیسے کہ رزق، اس لئے کہ پہلے مرحلہ میں روزی سے فائدہ اٹھانے والا جن چیزوں کو بہ عنوان رزق استعمال کرتا ہے اسے ملاحظہ کیا جائے، اور پھر اسے میا اور عطا کرنے والے کو مد نظر رکھا جائے، یا پھر ایک ایسے رابطہ کو ملاحظہ کیا جائے جو خالق و مخلوق کے درمیان پائے جانے والے چند روابط پر مترتب ہوتے ہوں جیسے مغفرت کہ جو ربوبیت تشریف الہی اور خدا کی جانب سے احکامات کے صادر ہونے اور پھر بندہ کے عصیان (گناہ) کرنے پر منحصر ہے۔

نتیجہ: صفات فعلیہ کو حاصل کرنے کے لئے خالق و مخلوق کے درمیان مقایسہ اور خالق و مخلوق کے درمیان موجودہ رابطہ کا لحاظ کرنا ہوگا تاکہ ان روابط کے ذریعہ ایک مستقل مفہوم وجود میں آئے اس وجہ سے ذات مقدس الہی خود بخود اور ان روابط کے لحاظ کئے بغیر صفات فعلیہ سے متصف نہیں ہو سکتی لہذا صفات ذاتیہ اور صفات فعلیہ کے درمیان بنیادی فرق یہی ہے۔ البتہ جیسا کہ پہلے ذکر کیا جا چکا ہے کہ یہ امکان ہے کہ اگر صفات فعلیہ کو ان کے بادی اور نفا کے تحت ملاحظہ کیا جائے تو اس صورت میں ان سب کو

صفات ذاتیہ کی طرف لوٹنا ہوگا، جیسا کہ اگر خالق یا خلاق کو اس معنی میں لیا جائے کہ جس میں خلق کی قدرت ہو تو اس کی بازگشت صفت ۲۴۹۲۴۹ قدرے کی طرف ہوگی یا اگر صفت ۲۴۹۲۴۹ سمیع اور بصیر کو بصرات و مسموعات کے جاننے والے کے معنی میں لیا جائے تو اس کی بازگشت ”علیم“ کی طرف ہوگی۔ اسی طرح وہ بعض مفہیم جنہیں صفات ذاتیہ میں شمار کیا جاتا ہے انہیں ایک اضافی اور فعلی معنی میں ملاحظہ کیا جائے تو اس صورت میں ان کا شمار صفات فعلیہ میں ہوگا جیسے کہ مفہوم علم قرآن میں متعدد مقامات پر بطور صفات فعلی استعمال ہوا ہے وہ ہم نکتہ جسے یہاں بیان کرنا ضروری ہے وہ یہ ہے کہ جب خدائے متعال اور مادی موجودات کے درمیان رابطہ تصور کیا جاتا ہے اور اس طرح خدا کے لئے صفات فعلی حاصل ہوتے ہیں تو یہ صفات اس رابطہ کے طرف موجودات مادی سے تعلق رکھنے کی وجہ سے قید زمانی و مکانی سے منوب ہوتے ہیں اگرچہ اس رابطہ کی پہلی طرف یعنی خدا ایسے قیود اور حدود سے منزہ ہے۔ جیسے کہ رزق خدا سے لطف اندوز ہونے والے کا عمل ایک خاص زمان و مکان میں واقع ہوتا ہے لہذا یہ قید روزی سے مستفیض ہونے والے سے متعلق ہوگی نہ روزی عطا کرنے والے سے اس لئے کہ ذات الہی ہر قسم کے زمان و مکان سے مستغنی ہے۔ یہ نکتہ ایک ایسا وسیلہ ہے کہ جس کے ذریعہ ان صفات اور افعال الہی کو حل کیا جاسکتا ہے کہ جن کی وجہ سے مستحکمین کے درمیان شدید اختلاف ہے۔

خالقیت

واجب الوجود کے اثبات کے بعد ممکن الوجود کی خلقت کی پہلی علت کے عنوان سے اور اس مطلب کے پیش نظر کہ تمام ممکن الوجود اپنی ہستی میں اس کے محتاج ہیں واجب الوجود کے لئے صفت خالقیت اور ممکن الوجود کے لئے مخلوقیت کا مفہوم حاصل ہوتا ہے مفہوم خالق جو اس رابطہ کے ذریعہ وجود میں آتا ہے علت وجود آفرین اور موجد (ایجاد کرنے والا) سے مساوی ہے اور تمام ممکن الوجود اور ضرورت مند موجودات اس رابطہ کے ایک طرف ہونے کی وجہ سے صفت مخلوقیت سے متصف ہوتے ہیں۔ لیکن کبھی

^۱ سورہ بقرہ آیت / ۱۸۷، ۲۳۵ سورہ انفال - آیت / ۶۶ سورہ فتح - آیت / ۱۸، ۲۷ سورہ آل عمران - آیت / ۱۴۰، ۱۴۲

کلمہ ”خلق“ محدود معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے اور تنہا وہی موجودات اس رابطہ کے طرف قرار پاتے ہیں کہ جو مادہ اولیہ سے خلق ہوئے ہیں اور ان کے مقابل میں مفہوم ”ابداع“ (ایجاد کرنا) ان موجودات کے لئے استعمال ہوتا ہے کہ جو مادہ اول سے مسبوق نہ ہو (جیسے مادہ اولیہ اور مجردات) اس طرح ایجاد کو خلق و ابداع میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ بہر حال خدا کے خلق کرنے کا مطلب اشیاء میں انسانوں کے تصرف اور انہیں بنانے کی طرح نہیں ہے کہ جس میں حرکت اور اعضاء بدن کے استعمال کی ضرورت پڑتی ہے، اور حرکت کو بعنوان ”فعل“ اور اس کے قضایا کو بعنوان ”نتیجہ فعل“ یاد کیا جاتا ہے اور ایسا بھی نہیں ہے کہ ”خلق کرنا“، یعنی ۲۴۹۲۴۹ فعل، ایک شے اور خلق کیا ہوا یعنی ۲۴۹۲۴۹ مخلوق، ایک دوسری شے ہو اس لئے کہ خدا، موجودات جہانی کے خواص سے منزہ ہے اگر خدا کے خلق کرنے کو مصداق عینی زائد فرض کر لیا جائے اس کی خلق کی ہوئی ذات پر، تو پھر اسے ایک ممکن الوجود اور خدا کی مخلوقات میں سے ایک مخلوق شمار کیا جائیگا، اور اس کے خلق کرنے گفتگو تکرار ہوگی بلکہ جیسا کہ صفات فعلیہ کی تعریف میں بیان ہوا کہ یہ صفات وہ مفاہیم ہیں کہ جو صفات خدا و خلق کے درمیان موجود نسبتوں کے ذریعہ حاصل ہوتے ہیں اور نسبتوں کا قیام عقل کی بنیاد پر ہے

ربوئیت

خالق و مخلوقات کے درمیان جن روابط کا لحاظ کیا جاتا ہے وہ یہ کہ مخلوقات اپنی آفرینش میں خدا کے محتاج ہونے کے علاوہ اپنی زندگی کے تمام مراحل میں اس سے وابستہ ہیں اور کسی بھی قسم کے استقلال سے عاری ہیں وہ جس طرح چاہے ان کے امور میں تصرف اور ان کے امور کی تدبیر کرے۔ جب اس رابطہ کو بصورت مکی تسلیم کر لیا گیا تو اس سے مفہوم ربوئیت اخذ ہونا لازم ہے کہ جس کا لازمہ امور کی تدبیر کرنا ہے اور اس کے بے شمار مصادیق میں جیسے حفاظت کرنا، زندہ کرنا، مار ڈالنا، روزی عطا کرنا، کمال عطا کرنا، راہنمائی کرنا، امر و نہی کرنا وغیرہ۔ ربوئیت کو دو حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے، ربوئیت تکوینی یعنی تمام موجودات کی احتیاجات کو برطرف کرنا اور ان کی دیکھ بھال کرنا، یعنی کہنا بہتر ہے کہ وہ پورے جہان کا چلانے والا ہے، لیکن ربوئیت تشریعی صرف باشعور اور

مختار موجودات سے مخصوص ہے، جیسے انبیاء کو مبعوث کرنا، آسمانی کتابوں کو نازل کرنا، وظائف کی تعین اور احکام و قوانین کے بیان کرنے جیسے امور کو شامل ہے۔ نتیجہ۔ ربوہیت مطلق الہی کا مطلب یہ ہے کہ مخلوقات اپنے تمام مراحل وجود میں خدا سے وابستہ ہیں، اور مخلوقات کی آپسی وابستگی کا سرا بھی واجب الوجود تک پہنچتا ہے، وہ وہی ہے جو اپنی بعض مخلوقات کے ذریعہ بعض کی ضرورتوں کو پورا کرتا ہے، اور دوسری پیدا کی ہوئی اشیاء کو اپنی مخلوقات کے لئے غذا بناتا ہے، اور اپنی باشعور مخلوقات کو باطنی عوامل (عقل اور حواس خمسہ) اور ظاہری عوامل (انبیاء، آسمانی کتب) کے ذریعہ ہدایت کرتا ہے اور مکلفین کے لئے احکام و قوانین وضع کرتا ہے۔ ربوہیت بھی خالقیت کی طرح ایک اضافی اور نسبتی مفہوم ہے، بس فرق اتنا ہے کہ مختلف موارد اور مقامات پر مخلوقات کے درمیان خاص اضافات و روابط ملاحظہ کئے جاتے ہیں، جیسا کہ مفہوم رزاقیت کے سلسلہ میں گذر چکا ہے۔ مفہوم خالقیت اور ربوہیت میں جب خوب غور و فکر کیا جائے تو ان کے درمیان نسبت اور اضافت سے یہ معلوم ہو جاتا ہے، کہ یہ دونوں ایک دوسرے کے متلازم ہیں، اس اعتبار سے محال ہے کہ جہان کا ۲۴۹۲۴۹ رب، اس جہان کے خالق کے علاوہ کوئی اور ہو، بلکہ وہی خدا، جو مخلوقات کو مختلف خصوصیات اور ایک دوسرے سے مرتبط و وابستہ خلق کیا ہے وہی ان کی حفاظت کرنے والا ہے، حقیقت میں، ربوہیت و تدبیر کا معنی و مفہوم مخلوقات کی تخلیقی کیفیت، اور ان کے آپسی ارتباطات و تعلقات سے اخذ ہوتا ہے۔

الوہیت

مفہوم ”الہ“ اور ”الوہیت“ کے سلسلہ میں صاحبان نظر کے درمیان شدید اختلاف ہے کہ جسے تفاسیر کی کتابوں میں بیان کیا گیا ہے لیکن جو بات ہمارے نزدیک قابل اہمیت ہے وہ یہ کہ ۲۴۹۲۴۹ الہ، بہ معنی لائق عبادت ہونا (عبادت و اطاعت کے لحاظ سے شائستہ و سزاوار ہونا) جیسے کہ ”کتاب“، وہ چیز جو لکھے جانے کے قابل ہو۔ اس معنی کو مد نظر رکھتے ہوئے الوہیت ایک ایسی صفت ہے کہ جس کے لئے اطاعت و عبادت کو بھی ملحوظ رکھنا ہوگا اگرچہ گمراہوں نے، اپنے لئے باطل خداؤں کا انتخاب کر لیا ہے، لیکن جو ۲۴۹۲۴۹ ذات، عبادت و اطاعت کیلئے شائستہ و سزاوار ہو وہی ۲۴۹۲۴۹ ذات، خالق و رب قرار پائے گی، اور یہ ایک

اعتقادی حصار ہے کہ جسے ہر شخص کے لئے ماننا ضروری ہے یعنی خدا کو واجب الوجود خالق اور صاحب اختیار ماننے کے علاوہ اسے اطاعت و عبادت کے لائق سمجھے اسی وجہ سے اس مفہوم کو اسلام کا شعار مانا گیا ہے (لا الہ الا اللہ)۔

سوالات

۱۔ صفات ذاتیہ اور فعلیہ کے ارتباط اور ان دونوں کا ایک ہی مفہوم میں جمع ہونے کی کیفیت بیان کریں؟

۲۔ کس اعتبار سے صفات فعلیہ، زمانی و مکانی قیود میں مقید ہو جاتے ہیں؟

۳۔ مفہوم خالقیت کی شرح پیش کریں اور ایجاد و ابداع کے ساتھ اس کے فرق کو بیان کریں؟

۴۔ کیوں خلق کرنے کے مفہوم کو مصداق عینی کے اعتبار سے زائد بر ذات مخلوق، تصور نہیں کیا جاسکتا؟

۵۔ مفہوم ربوبیت کو بیان کریں؟

۶۔ اقسام ربوبیت کی تشریح کریں؟

۷۔ خالقیت اور ربوبیت کے تلازم کو بیان کریں؟

۸۔ مفہوم الوہیت کا خالقیت اور ربوبیت کے ساتھ جو تلازم ہے اسے بیان کریں؟

گیارہواں درس

بقیہ صفات فعلیہ

مقدمہ

علم کلام میں متکلمین کے درمیان ارادۃ الہی اختلافی مسائل میں سے ایک مسئلہ ہے جسے مختلف پہلوؤں سے زیر بحث قرار دیا گیا ہے، کیا ارادہ کا تعلق صفات ذاتی سے ہے یا صفات فعلی سے؟ کیا قدیم ہے یا حادث؟ کیا واحد ہے یا متعدد؟ وغیرہ۔ یہ تمام بحثیں فلسفہ میں ارادہ اور ارادہ الہی کے خصوصیات سے ہونے والی بحثوں سے جدا ہے لہذا یہ بات روشن ہے کہ ایسی بحث کو اس کتاب میں ذکر کرنا مناسب نہیں ہے اسی وجہ سے پہلے ہم مفہوم ارادہ کی ایک مختصر وضاحت پیش کریں گے اور پھر ارادۃ الہی کے تحت بحث کا آغاز کریں گے۔

ارادہ

کلمہ ”ارادہ“ عرف میں کم از کم دو معنی میں استعمال ہوتا ہے، ایک محبت کرنا اور دوسرے کسی کام کو انجام دینے کا ارادہ کرنا۔ پہلا معنی دوسرے معنی کی بہ نسبت وسیع ہے اس لئے کہ یہ اشیاء خارجی اور دوسروں کے افعال کے ساتھ اپنے افعال کو پسند کرنے کو شامل بھی ہوتا ہے لیکن دوسرا معنی صرف شخص کے ذاتی افعال کو شامل ہوتا ہے۔ لیکن ارادہ اپنے پہلے معنی کے مطابق (محبت) اگرچہ انسان کے لئے ایک نفسانی کیفیت ہے، لیکن عقل عیب و نقص کو برطرف کر کے ایک عام مفہوم حاصل کر سکتی ہے کہ جسے جوہری موجودات کے ساتھ خدا پر بھی اطلاق کیا جاسکے، جیسا کہ علم کے ساتھ ہی ہوا ہے اسی وجہ سے حب (محبت) کو صفات ذاتیہ میں شمار کیا جاسکتا ہے جو کہ (خود اپنی ذات سے محبت الہی پر قابل) اطلاق ہے، لہذا اگر ارادہ الہی کا مطلب حب

^۱ جیسے کہ یہ آیہ شریفہ (تریدون عرض الدنيا والله يريد الآخرة) سورة انفال۔ آیت ۶۷/

کمال ہو تو یہ پہلے مرحلہ میں لا متناہی کمال الہی سے متعلق ہوتا ہے اور یہ بقیہ مراحل میں تمام موجودات کے کمالات پر صادق آتا ہے اس لئے کہ یہ اسی کے کمال کے آثار میں اس بنا پر اسے صفات ذاتیہ کا حصہ، قدیم، واحد اور عین ذات مقدس الہی مانا جاسکتا ہے۔ لیکن ارادہ بہ معنی کسی بھی امر کو انجام دینے کا قصد کرنا بغیر کسی شک کے صفات فعلیہ میں داخل ہے (جو امر حادث سے متعلق ہونے کی وجہ سے قیود زمان میں مقید ہے جیسا کہ قرآن میں وارد ہوا ہے کہ (اِنَّا اَمْرُهٗ اِذَا اَرَادَ شَیْءًا اَنْ یَّقُوْلَ لَہٗ کُنْ فَیَکُوْنُ) ترجمہ۔ اس کی شان تو یہ ہے کہ جب کسی چیز کو (پیدا کرنا) چاہتا ہے تو وہ کہہ دیتا ہے کہ ہو جا، تو فوراً ہو جاتی ہے لیکن خدائے متعال کا صفات فعلیہ سے متصف ہونے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ذات الہی میں کوئی تبدیلی واقع ہو یا کوئی صورت عرضی اس کے وجود میں ظاہر ہو، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ ذات الہی اور اس کی مخلوقات کے درمیان شرائط اور ایک خاص نظریہ کے تحت ایک نسبت محاذ کیا گیا ہو اور ایک خاص، مفہوم اضافی کو صفات فعلیہ عنوان سے اخذ کیا گیا ہو مفہوم ارادہ کے تحت اس رابطہ کو پیش نظر رکھا جاتا ہے کہ ہر مخلوق چونکہ صاحب کمال ہے اور اس کی خلقت میں مصلحت و حکمت کار فرما ہے۔

اس لئے خلق ہوئی ہے، لہذا اس کا ایک خاص زمان و مکان اور کیفیت میں واقع ہونا، علم خدا اور محبت الہی سے متعلق ہے کہ جس کو اس نے اپنے ارادے سے پیدا کیا ہے نہ یہ کہ کسی نے اس کو مجبور کیا ہے، جب اس رابطہ کا محاذ کیا جاتا ہے تو ایک مفہوم اضافی اور نسبتی بنام ”ارادہ“ حاصل ہوتا ہے، جو شئی محدود سے تعلق کے اعتبار سے کچھ حدود و قیود کا حامل ہے اور یہ وہی مفہوم اضافی ہے جو حدوث و کثرت سے متصف ہے اس لئے کہ اضافت تابع طرفین ہے اور ان دونوں طرفوں میں سے کسی ایک کا حدوث اور کثرت سے متصف ہونا اوصاف کا، اضافت کی طرف سرایت کرنے کے لئے کافی ہے۔

حکمت

جو وضاحت ارادہ الہی کے تحت پیش کی گئی اس کے مطابق یہ بات روشن ہو گئی کہ یہ ارادہ یونہی، کسی بھی شئی کے ایجاد سے متعلق

نہیں ہوتا، بلکہ جوشی بھی ارادۃ الہی کے متعلق بنتی ہے، اس میں خیر اور کمال کی حکمت پائی جاتی ہے۔ اور چونکہ مادیات کا تزام بعض کا بعض دوسرے کے ذریعہ نقصان کا موجب ہوتا ہے محبت الہی کا کمال کے سلسلہ میں تقاضا یہ ہے کہ ان سب کی پیدائش اس طرح ہو کہ انہیں زیادہ سے زیادہ خیر و کمال مل سکے، ایسے روابط کو میزان پر قرار دینے سے مفہوم ”مصلحت“ سمجھ میں آتا ہے، وگرنہ مصلحت مخلوقات کے پائے جانے کے سلسلہ میں کوئی مستقل امر نہیں ہے کہ جو ان کی پیدائش میں براہ راست اثر انداز ہو، چہ جائے کہ وہ ارادہ الہی میں اثر گذار ہو۔

نتیجہ: افعال الہی اس کے صفات ذاتیہ، جیسے علم و قدرت خیر و کمال سے محبت، جیسی چیزوں سے مترشح ہوتا ہے اور ہمیشہ، کسی مصلحت کے پائے جانے ہی کی صورت میں متحقق ہوتا ہے، تاکہ زیادہ سے زیادہ کمال و خیر حاصل ہو سکے، لہذا ایسے ارادہ کو ”ارادۃ حکیمانہ“ کا نام دیا جاتا ہے اور یہیں سے مقام فعل میں خدا کے لئے ایک دوسری صفت بنام ”حکیم ہونا“ سمجھ میں آتا ہے، اور بقیہ صفات فعلیہ کی طرح اس کی بھی بازگشت صفات ذاتیہ کی طرف ہوتی ہے۔

البتہ یہ بات روشن ہے کہ مصلحت کی خاطر کسی امر کو انجام دینے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ مصلحت خدا کے لئے علت غائی ہو، بلکہ وہ ایک فرعی ہدف ہے لیکن امور کو انجام دینے میں علت غائی، وہی اس کا ذاتی، ولا اتنا ہی کمال سے محبت کرنا ہے جو ضمناً اس کے آثار یعنی موجودات کے کمالات سے متعلق ہے،

لہذا اس مقام پر یہ کہنا درست ہے کہ افعال الہی کے لئے علت وہی علت فاعلی ہے، اور خدا زائد بر ذات کسی ہدف کا حامل نہیں ہے، لیکن یہ مطلب اس بات کا منافی نہیں ہے کہ موجودات کا کمال اور خیر ایک فرعی ہدف ہے، اور اسی کو قرآن نے بھی بیان کیا ہے اس لئے کہ قرآن کریم نے افعال الہی کے لئے ایسی علتوں کو بیان کیا ہے کہ جن میں سے ہر ایک کی بازگشت، مخلوقات کے خیر

وکمال کی طرف ہے، جیسے کہ امتحان و آزمائش، بہترین امور کا انتخاب کرنا، خدا کی بندگی کرنا، اور رحمت خاص سے مستعم ہونا انسان کی خلقت کے اہداف میں سے ہے کہ جن میں سے ہر ایک بالترتیب دوسرے والے کے لئے مقدمہ ہے۔

کلام الہی

خدا کی ذات سے نسبت دئے جانے والے مفہیم میں سے ایک مفہوم، تکلم ہے اور ہمیشہ کلام الہی کے سلسلہ میں متکلمین کے درمیان بحث ہوتی رہی ہے، یہاں تک کہ یہ بھی کہا گیا ہے کہ ”علم کلام“ کا کلام نام سے شرت پانا اس وجہ سے ہے کہ اس علم کے اصحاب (علماء متکلمین) کلام الہی کے تحت بحث کرتے ہیں، اشاعرہ اسے صفات ذاتیہ میں سے اور معتزلہ صفات فعلیہ میں سے شمار کرتے ہیں، ان دو گروہوں کے درمیان شدید اختلاف کا باعث یہی مسئلہ قرار پایا قرآن مجید، کلام الہی ہے، ایسی صورت میں یہ مخلوق (حادث) ہے یا غیر مخلوق (یعنی قدیم) اس سلسلہ میں بڑی بحثیں ہوئی ہیں، بسا اوقات اسی موضوع کی وجہ سے ایک دوسرے کو کافر کہا گیا۔

صفات ذاتیہ اور فعلیہ کی بیان کی گئی تعریفوں کے پیش نظریہ اس مسئلہ کو بہ آسانی درک کیا جاسکتا ہے کہ تکلم فعل کی صفات میں سے ہے کہ جسے وجود بخشے کے لئے ایک مخاطب کی ضرورت ہے تاکہ کہنے والے کے مقصود کو آواز یا مکتوب یا اپنے ذہن میں کسی مفہوم یا کسی اور راستہ کے ذریعہ درک کیا جاسکے، درحقیقت یہ مفہوم اس رابطہ کے ذریعہ حاصل ہوتا ہے جو خدا کسی حقیقت کو اپنے بندہ کے لئے آشکار کرنا چاہتا ہے اور بندہ میں اس حقیقت کے درک کرنے کی طاقت پائی جاتی ہے مگر یہ کہ تکلم کے لئے کوئی دوسرے معنی فرض کر لئے جائیں جیسے تکلم پر قادر ہونا یا تکلم کے معنی و مفہوم جاننا تو پھر اس صورت میں اس صفت کی بازگشت بھی صفات ذاتیہ کی طرف ہوگی، جیسا کہ اس طرح کی باتیں صفات فعلیہ میں گذر چکی ہیں۔ لیکن قرآن خطوط یا الفاظ یا ذہنوں میں موجودہ مفہیم یا ایک نورانی حقیقت اور مخلوقات سے مجرد کے معنی سے عبارت ہے، مگر یہ کہ کوئی علم الہی کو بعنوان حقیقت قرآن سمجھے تو اس صورت میں اس کی

^۱ ر جوع کریں، سورہ ہود آیت ۷ سورہ ملک آیت ۲ سورہ کہف آیت ۷ سورہ ذاریات آیت ۵۷ سورہ ہود آیت ۱۰۸ سورہ جاثیہ آیت ۲۳ سورہ آل عمران آیت ۱۵ سورہ توبہ آیت ۷۲۔

باز گشت صفت ذاتی ”علم“ کی طرف ہوگی لیکن ایسی تاویلیں عرف کے محاوروں کے خلاف ہیں لہذا ان سے اجتناب کرنا بہتر ہے۔

صدق

کلام الہی، اگر امر و نہی کی صورت میں بہ طور انشا ہو تو یہ بندوں کے عملی وظائف کو معین کرتا ہے اور اس میں کسی قسم کے صدق و کذب سے متصف کرنے کا کوئی مقام نہیں ہے لیکن اگر کلام الہی حقائق یا گزشتہ اور آئندہ حوادث کے سلسلہ میں بصورت اخبار ہو تو صدق سے متصف ہے جیسا کہ قرآن کریم میں وارد ہوا ہے۔ (وَمَنْ أَصْدَقُ مِنَ اللَّهِ حَدِيثًا^۱)۔ اور خدا سے بڑھ کر بات میں سچا کون ہو گا؟ اور اس صورت میں کوئی بھی انھیں قبول نہ کرنے پر کسی بھی قسم کا عذر پیش نہیں کر سکتا۔ یہ صفت جہان بینی کے فرعی مسائل آئیڈیالوجی کے بہت سے مسائل کو ثابت کرنے کے لئے ایک قسم کے استدلال (نقلی اور تعبیدی) سے متصف ہے۔

اس صفت کو ثابت کرنے کے لئے جو عقلی دلائل پیش کئے جاسکتے ہیں وہ یہ ہیں کہ کلام الہی ربوبیت الہی کی شان، جہان و انسان کی تدبیر، مخلوقات کی ہدایت اور علم و حکمت کی بنیاد پر صحیح شناخت کو مخاطبین کے لئے فراہم کرنے کا ایک وسیلہ ہے اور اگر واقع سے کسی قسم کی مخالفت کا امکان ہو تو اس کا کوئی اعتبار نہ ہوگا اس لئے کہ نقض غرض کی وجہ سے حکمت الہی کے خلاف تصور کیا جائے گا۔

^۱ سورہ نساء، آیت/۸۷

سوالات

- ۱۔ ارادہ الہی کس معنی میں صفات ذاتیہ اور کس معنی میں صفات فعلیہ میں شمار ہوگا؟
- ۲۔ مفہوم ارادہ کو بعنوان صفت فعلی جلوہ دینے کے لئے خالق و مخلوق کے درمیان کس رابطہ کا لحاظ کرنا ضروری ہے؟
- ۳۔ ارادہ الہی کس طرح حدوث و کثرت سے متصف ہے؟
- ۴۔ حکمت الہی کو بیان کریں؟
- ۵۔ مفہوم مصلحت کس طرح حاصل ہوتا ہے؟
- ۶۔ کس معنی میں مخلوقات کی مصلحتہ خیر اور اس کے کمال کو خلقت کا ہدف مانا جائے؟
- ۷۔ کلام الہی کی شرح پیش کریں؟
- ۸۔ خداوند متعال کے صادق ہونے پر عقلی دلیل بیان کریں؟

بارہواں درس

انحراف کے اسباب کی تحقیق

مقدمہ

پہلے درس میں اس مطلب کو واضح کر دیا گیا ہے کہ جہان بینی (خدا کی معرفت) کو بہ اعتبار کلی دو حصوں (الہی اور مادی) میں تقسیم کیا جاسکتا ہے، اور ان کے درمیان مہم ترین اختلاف قادر و علیم پروردگار کے وجود کا مسئلہ ہے کہ جسے ثابت کرنے کے لئے ایک طرف الہی جہان بینی ایک بنیادی اصل کے عنوان سے تاکید کرتی ہے اور مادی جہان بینی اس کا سرے سے انکار کرتی ہے۔

گذشتہ دروس میں اس کتاب کی گنجائش کے مطابق وجود خدا کے اثبات، صفات ثبوتیہ اور سلبیہ، صفات ذاتیہ و فعلیہ کے تحت گفتگو کی جا چکی ہے اب اس کے بعد اس اعتقاد کے استحکام نیز مادی جہان بینی کے نقد کے لئے ایک مختصر بحث کا آغاز کرتے ہیں تاکہ الہی جہان بینی کے مقصود کے اثبات کے علاوہ مادی جہان بینی کا بطلان ثابت ہو جائے۔ لہذا پہلے ہم توحید سے انحراف اور اتحاد کی جانب میلان کے اسباب بیان کریں گے اور پھر مادی جہان بینی کے اہم ترین نقطہ ضعف کی جانب اشارہ کریں گے۔

انحراف کے اسباب

اتحاد کی داستان تاریخ بشر میں بہت قدیمی ہے، اگرچہ ہمیشہ انسانی معاشرے میں، جہاں تک تاریخ نے بیان کیا ہے۔ خدا پر اعتقاد اور ایمان رکھنے والوں کی مثالیں زمانہ قدیم سے بے شمار ہیں، لیکن اس کے باوجود انہیں لوگوں کے درمیان ملحد گروہوں کی ٹولیاں بھی نظر آتی ہیں، لیکن اٹھارہویں صدی سیورپ میں بے دینی اور اتحاد کا ایک مستقل رواج شروع ہوا اور آہستہ آہستہ پورے جہان میں یہ مرض پھیل گیا۔ اگرچہ یہ طرز تفکر کلیسا اور مسیحیت کی ضد میں اٹھا تھا لیکن اس کی موجوں نے تمام ادیان و مذاہب کو اپنی لپیٹ میں لے لیا، اور مغرب سے صنعت و مکنا لوجی کے ہمراہ بے دینی کا یہ نظریہ دوسری سرزمینوں کی طرف بڑھتا چلا گیا، اور اس آخری

صدی میں اس فکر نے، انکار اقتصادی، اجتماعی اور مارکیٹ کے سایہ میں تمام ممالک کو اپنی لیٹ میں لے لیا اور اس طرح انسانیت کے لئے ایک خطرناک صورت پیدا ہو گئی۔ اس منحرف عقیدہ کی پیدائش اور اس کے رواج پانے میں بے شمار اسباب و عوامل کار فرما ہیں، اگر ہم ان سب عوامل کی تحقیق کرنا چاہیں، تو تنہا انہیں کے لئے مستقل کتاب کی ضرورت ہے لیکن بطور کلی ان عوامل میں سے صرف تین کی جانب اشارہ کریں گے۔

۱۔ روحی اسباب: بے دینی اور اتحاد کی جانب بڑھتے ہوئے رجحانات کے اسباب ممکن ہے، لوگوں کے اندر موجود ہوں لیکن انسان اس کی طرف متوجہ نہ ہو جن میں سے اہم ترین راحت طلبی، عیش پرستی بے قید و بند، غیر ذمہ دارانہ زندگی گزارنا ہے۔ یعنی ایک طرف تحقیق کی زحمت (خصوصاً ان امور کے سلسلہ میں کہ جس میں مادی لذت کا وجود نہیں ہے) اس امر سے منع ہے کہ سست اور کاہل افراد تحقیق کے لئے آمادہ ہوں، اور دوسری طرف حیوانی آزادی سے لگاؤ، اور بنیئر مولیت و پابندی کے زندگی گزارنے کی تمنا ان کو الہی جان بینی کی طرف مائل ہونے سے روک دیتی ہے، اس لئے کہ الہی انکار کے قبول کرنے اور حکیم پروردگار پر ایمان رکھنے کہ جس کے ضمن میں متعدد عقائد جنم لیتے ہیں، ان سب کا لازمہ، تمام اختیاری افعال میں انسان کی مؤلیت پذیری ہے، اور ایسی مؤلیت کا تقاضا یہ ہے کہ بعض مقامات پر اپنی بعض خواہشات سے چشم پوشی کی جائے، اور ذمہ داریوں کو قبول کر لیا جائے، جبکہ عیاشی کے ساتھ ان ذمہ داریوں کا قبول کرنا سازگار نہیں ہے، اسی وجہ سے یہ حیوانی خواہش لاشعوری طور پر اس امر کا سبب بنتی ہے ان تمام مؤلیتوں (ذمہ داریوں) کو قبول نہ کیا جائے اور سرے سے خداوند عالم کے وجود ہی سے انکار کر دیا جائے۔ اتحاد اور بے دینی کی جانب میلانات کے اور دوسرے نفسیاتی عوامل بھی ہیں، جو بقیہ عوامل کے تعاقب میں ظاہر ہوتے ہیں۔

۲۔ اجتماعی اسباب: بعض معاشروں میں پیش آنے والے وہ غیر مطلوب حالات کہ جن کی پیدائش میں دینی رہبروں کا خاص کردار ہوتا ہے، ایسے حالات میں بہت سے لوگ جو تفکر عقلی کے اعتبار سے ضعیف ہوتے ہیں اور مسائل کے تجزیہ و تحلیل پر پوری طرح

^۱ استاد شہید مطہری نے اپنی کتاب (علل گرائش مادی گری) میں بعض اسباب و عوامل کا تذکرہ کیا ہے، اور اس پر روشنی ڈالی ہے۔

قادر نہیں ہوتے، اور حوادث کے اسباب سمجھنے میں بھی ضعیف ہیں، حوادث کو دین اور اس کے رہبروں کی دخالت کا نتیجہ سمجھتے ہیں، اور یہ اعتقاد پیدا کر لیتے ہیں کہ دینی اعتقادات ہی ایسے نامطلوب حالات کو وجود میں لانے کا اصلی سبب ہیں، اسی بنا پر وہ دین و مذہب سے بیزار ہو جاتے ہیں ایسے نمونے یورپ کے اجتماعی زندگی جو عہد رنسانس میں پیش آئے ملاحظہ کئے جاسکتے ہیں، کلیسا کے سایہ میں مذہبی، حقوقی اور سیاسی عنوانات کے تحت پادریوں کی ناشائستہ حرکات مسیحیت سے بیزاری بلکہ دین و دینداری سے بطور کلی قطع تعلق ہونے کا سبب بنے۔ دینی رہبروں کے لئے ایسے اسباب کا جاننا نہایت ضروری ہے، تاکہ وہ اپنے مقام کی حاسیت اور اپنی ذمہ داری کی عظمت کو درک کر سکیں، اور انھیں بخوبی معلوم ہو جائے کہ ان کی معمولی ایک غفلت پورے معاشرے کی بد بختی اور گمراہی کا سبب بن سکتی ہے۔

۳۔ فکری اسباب: یعنی وہ ثبات جو ایک شخص کے ذہن میں آتے ہیں یا دوسروں کی زبانی سنتا ہے، استدلال اور قوت عاقلہ کے ضعیف ہونے کی وجہ سے انھیں دفع کرنے کی قوت نہیں رکھتا اور کم و بیش وہ ان ثبات سے متاثر ہو جاتا ہے، یا کم از کم اس کا ذہن مضطرب و پریشان ہو جاتا ہے جو (جان بینی الہی) کے سلسلہ میں یقین و اطمینان پیدا کرنے سے مانع ہے۔ ان عوامل کو بھی دو فرعی حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے جیسے وہ ثبات جو حس گرائی پر مبنی ہیں۔

وہ ثبات جو عقیدہ کے فاسد ہونے کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں وہ ثبات جو کمزور طریقہ استدلال، اور غلط تہوں کا نتیجہ ہوتے ہیں، وہ ثبات جو ناگوار حوادث کی وجہ سے ذہنوں میں خطور کرتے ہیں کہ جن کے لئے یہ تصور کیا جاتا ہے کہ وہ حکمت خداوند اور عدل الہی کے خلاف ہیں، اسی طرح وہ علمی تیوریاں جو عقائد دینی کے خلاف ہیں، اور ان کی وجہ سے شہم پیدا ہوتا ہے، نیز وہ ثبات جو مقررات و احکام دینی سے وابستہ ہیں، بالخصوص مسائل حقوقی و سیاسی کے شعبہ میں۔ اور کبھی کبھی دو یا چند عوامل مجموعاً طور پر شک و تردید یا انکار اور اتحاد کا سبب ہوتے ہیں جس کے نتیجہ میں شخص نفسانی مرض (فکری و سواس) میں گرفتار ہو جاتا ہے اور پھر کسی بھی دلیل و برحان کے قبول کرنے سے انکار کرنے لگتا ہے، اس مرض میں مبتلا انسان، اپنے ہی عمل کی صحت میں شک کرنے لگتا

ہے اور اس کے صحیح ہونے کا اطمینان نہیں کر پاتا، دیوں بار اپنا ہاتھ دھوتا ہے لیکن پھر بھی اس کی طہارت میں شک کرتا ہے جبکہ وہ پہلی ہی مرتبہ میں پاک ہو چکا ہے یا وہ سرے سے نجس ہی نہیں ہے۔

انحرافی اسباب کا سد باب: انحراف کے اسباب کے مختلف ہونے کی وجہ سے ان میں سے ہر ایک سے مقابلہ کرنے کے لئے ایک خاص روش، موقع و محل اور مخصوص شرائط کی ضرورت ہے، جیسے روحی و اخلاقی اسباب کا علاج صحیح تربیت اور اس راستہ میں موجود موانع کو برطرف کرنے کے ذریعہ کیا جائے جیسا کہ ہم نے پہلے، دوسرے اور تیسرے درس میں ۲۴۹۲۴۹ دین میں تحقیق کی ضرورت اور اس سے سہل انگاری کے نقصانات میں بیان کر چکے ہیں۔ اسی طرح اجتماعی اسباب کے برے اثرات کو روکنے کے لئے ایسے اسباب و عوامل کی روک، تھام کے علاوہ دینداروں کے اخلاق و کردار کے ناٹائیتہ ہونے اور دین کے صحیح نہ ہونے کے درمیان فرق کرنا ہوگا، بہر حال روحی و اجتماعی عوامل کی طرف توجہ دینے کی وجہ سے کم از کم ایسے منحرف کرنے والے اسباب کی تاثیر سے انسان محفوظ رہتا ہے۔

اسی طرح فکری اسباب کی بری تاثیر سے محفوظ رہنے کے لئے مناسب طریقہ اختیار کرنا ہوگا لہذا فاسد عقائد کو صحیح عقائد سے جدا کرنا ہوگا، اور دینی عقائد کو ثابت کرنے کے لئے غیر منطقی اور ضعیف استدلالوں سے پرہیز کرنا ہوگا اور یہ بھی آشکار کرنا ہوگا کہ دلیل کا ضعیف ہونا، مدعی کے نادرست ہونے کی دلیل نہیں ہے۔ اب یہ بات روشن ہے کہ انحراف کے تمام عوامل کے سلسلہ میں تحقیق و جستجو اور ان میں سے ہر ایک سے مقابلہ کے لئے مناسب راہ کا بیان کرنا ہماری بحث کے دائرے سے خارج ہے، اسی وجہ سے احادی کی طرف میلانات کے فکری اسباب اور اس ضمن میں موجود شبہات کے جواب پر اکتفا کرتے ہیں۔

سوالات

۱۔ مادی جہان بینی پر تشقید اور اس کے ضمن میں تحقیق کرنے کا فائدہ کیا ہے؟

۲۔ قرن اخیر میں الحاد کی طرف بڑھتے ہوئے رجحانات کیوں پیدا ہوئے؟

۳۔ دین سے منحرف ہونے کے روحی اسباب کیا ہیں؟

۴۔ دین سے انحراف کے اجتماعی عوامل کیا ہیں؟

۵۔ فکری اسباب اور اس کی فروعات کو بیان کریں؟

۶۔ فکری وسواس کیسے وجود میں آتے ہیں؟

۷۔ انحراف کے اسباب سے مقابلہ کرنے کا راستہ کیا ہے؟

تیرہواں درس

چند شبہات کا حل

نامحسوس موجودہ پر اعتقاد

خدا شناسی کے ضمن میں ایک معمولی شبہ یہ ہے کہ کس طرح ایک ایسے موجود پر ایمان لایا جاسکتا ہے کہ جو قابل درک نہیں ہے اور نہ ہی اسے حس کیا جاسکتا ہے؟ شبہ ہمیشہ ان لوگوں کے ذہنوں میں اٹھتا ہے کہ جو قوی فکر کے مالک نہیں ہیں، لیکن ایسے دانشور بھی ہیں کہ جنہوں نے اپنے تفکر کی بنیاد ”اصالت حس“ پر قائم کی ہے اور نامحسوس موجود سے انکار ہے یا کم از کم اسے یقینی معرفت سے بعید سمجھا ہے۔ اس شبہ کا جواب یہ ہے کہ ادراکات حسی کو جسم و جہانیاں سے بدن کو مس کرنے کے ذریعہ حاصل کیا جاتا ہے اور ہمارے حواس میں سے ہر حس اپنی موقعیت اور خاص شرائط کے تحت مادی موجودات کو درک کرتی ہے اور جس طرح آنکھ سے سننے یا کان سے دیکھنے کی توقع باطل ہے اسی طرح یہ انتظار بھی باطل ہے کہ ہمارے حواس تمام موجودات کو درک کر لیں گے۔ ایک تو یہ کہ مادی موجودات کے درمیان ایسی بھی چیزیں موجود ہیں جو حس کے دائرے سے باہر ہیں جس طرح کہ ہمارے حواس (ULTRA-VIOLET) (اور INFRA-RED) کے انوار اور الیکٹرومیک و غیرہ امواج کو درک کرنے سے عاجز ہے۔ دوسرا یہ کہ ہم بہت سے حقائق کو ظاہری حواس کے علاوہ دوسری راہوں سے درک کرتے ہیں، اور ان کے وجود کا یقینی اعتقاد حاصل کر لیتے ہیں جبکہ وہ حس کی قدرت سے باہر ہیں، جیسے کہ ہم خود اپنے ذر، ارادہ، محبت اور دوسری صفات سے آگاہ ہیں، اور ان کے وجود پر پورا ایمان بھی رکھتے ہیں، حالانکہ یہ روحی آثار خود روح کی طرح حس کے دائرے سے باہر ہیں، اس کے علاوہ خود ادراک ایک غیر عادی اور نامحسوس امر ہے۔ لہذا حواس کے ذریعہ کسی چیز کا درک نہ ہونا نہ تھا اس کے نہ ہونے کی دلیل نہیں بن سکتا بلکہ اسے بعید بھی نہیں کہا جاسکتا۔ خدا پر ایمان رکھنے کے سلسلہ میں جل اور خوف کا کردار۔ جامعہ شناسوں کی طرف سے دوسرا

شبہ جو پیش کیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ خدا پر اعتقاد رکھنا، خوف و خطر کی وجہ سے ہے بجلی یا زلزلہ یا اسی طرح کے اور دوسرے خطرات کی وجہ سے یہ تصور وجود میں آیا ہے دراصل بشر نے اپنی روحی اطمینان کی خاطر (العیاذ باللہ) ایک خیالی موجود بنام ”اللہ“ کو مانا ہے اور اس کی عبادت میں مشغول ہے، اسی وجہ سے خطرات کے مقابلہ میں محافظت کا امکان جس قدر بڑھتی جاتی ہے یا خطرات، حوادث کے اسباب و علل جیسے آسمان ہوتے جاتے ہیں ویسے اسی اعتبار سے خدا پر ایمان ضعیف ہوتا جاتا ہے۔ مارکیسم نے اس شبہ کو اپنی کتابوں میں بعنوان ”علم جامعہ شناسی“ کے نتائج کے تحت بڑی آب و تاب کے ساتھ بیان کیا ہے جسے غیر مطلع لوگوں کو دھوکا دینے کا ایک بہترین وسیلہ تصور کیا جاتا ہے اس شبہ کے جواب میں یہ کہنا بہتر ہے کہ سب سے پہلے یہ شبہ تھا ایک مفروضہ ہے جسے بعض جامعہ شناسوں نے پیش کیا ہے اور اس کے صحیح ہونے پر کسی بھی علمی دلیل کا وجود نہیں ہے۔

دوسرے، اس زمانہ میں بہت بڑے بڑے مفکرین تھے جو ہر ایک سے زائد حوادث کے علل و اسباب سے آگاہ تھے اور خدائے حکیم پر مضبوط عقیدہ رکھتے تھے اور اب بھی اسی عقیدہ ہاتی میں، ایسا ہرگز نہیں ہے کہ خدا پر ایمان رکھنا خوف و جہل کا نتیجہ ہے۔

تیسرے، اگر بعض حوادث سے خوف یا اس کے و اسباب سے نا آگاہی ہی خدا پر ایمان رکھنے کا سبب ہے تو اس کا مطلب یہ ہر گز نہیں ہے کہ وجود خدا خوف و جہل کا نتیجہ ہے جس طرح سے کہ بہت سے روحی اثرات جیسے لذت طلبی اور شہرت طلبی وغیرہ... علمی و فنی اور فلسفی انکشافات کا سبب ہے، لیکن یہ ان کے اعتبار کو خدشہ دار نہیں کرتا۔ چوتھے: اگر بعض لوگوں نے خدا کو، اس عنوان سے پہچانا ہے کہ وہ مہول العلۃ حوادث کو وجود بخشنے والا ہے یہاں تک کہ اگر علل و اسباب کے آشکار ہونے کی وجہ سے ان کے ایمان میں کمی وقع ہوگئی ہے تو یہ خدا پر اعتقاد کے معتبر نہ ہونے کی دلیل نہیں ہو سکتی بلکہ یہ سب کچھ ان کے ایمان کے ضعیف ہونے کی علامت ہے، اس لئے کہ جہانی حوادث کی بہ نسبت خدا کا علت قرار دیا جانا، اسکی طبعی علتوں کے اثر انداز ہونے کی

^۱ جیسے انشٹن، کرسی وریس والکسیس کارل اور دوسرے برجستہ مفکرین کہ جنہوں نے وجود کے اثبات کے لئے مقالہ تحریر کئے جن میں سے بعض مقالے جات کو کتاب ”اثبات وجود خدا“ میں جمع کیا گیا ہے۔

نہایت کے اعتبار سے علت خدا کے عرض میں وقع نہیں ہے بلکہ ایک ایسی علت ہے جو ہر ایک کو شامل ہوتی ہے، اور تمام مادی وغیر مادی علتوں کے پہچاننے یا نہ پہچاننے میں اس کے طول میں موثر ہے، اور اس کی نفی و اثبات کے لئے کسی بھی قسم کی تاثیر سے عاری ہے۔^۱

کیا قاعدہ علیت ایک قاعدہ کلی ہے

ثبوت میں سے ایک شبہ جسے مغربی دانشمندیوں نے بیان کیا ہے یہ ہے کہ اگر اصل علیت کلیت سے متصف ہے تو پھر خدا کے لئے بھی علت کا ہونا ضروری ہے، حالانکہ اس کے لئے فرض یہ ہے کہ اس کے لئے کوئی علت نہیں ہے لہذا بے علت خدا کو ماننا قانون علیت کا نقض کرنا اور عدم کلیت پر دلیل ہے، اور اگر قاعدہ علیت کی کلیت کو نہ مانیں تو پھر واجب الوجود کو ثابت کرنے کے لئے اس قاعدہ و قانون سے استفادہ نہیں کر سکتے، اس لئے کہ یہ ممکن ہے کہ کوئی یہ کہے کہ اصل مادہ یا انرجی خود بخود علت کے بغیر وجود میں آگیا ہو، اور اس میں ہونے والے تغیرات کی وجہ سے تمام موجودات ظہور میں آئے ہیں۔ یہ شبہ بھی جیسا کہ ساتویں درس میں اشارہ کیا جا چکا ہے، قاعدہ علیت کے تحت کی گئی غلط تفسیر کا نتیجہ ہے، یعنی ان لوگوں نے یہ تصور کر لیا ہے کہ اس قاعدہ کا مفاد یہ ہے کہ (ہر شے موجود علت کی محتاج ہے) جبکہ اس کی صحیح تفسیر یہ ہے کہ (ہر ممکن الوجود یا وابستہ موجود علت کا محتاج ہے) یہ ایک استثنائنا پذیر قاعدہ کلی ہے، لیکن یہ فرضیہ کہ اصل مادہ یا انرجی علت کے بغیر وجود میں آجائے اور اس میں ہونے والے تغیرات کی وجہ سے یہ جہان خلق ہو جائے، اشکالات و اعتراضات سے خارج نہیں ہے، جسے ہم آئندہ دروس میں بیان کریں گے۔

علوم اجتماعی کے نتائج

ایک شبہ یہ ہے کہ جہان و انسان کے پیدا کرنے والے وجود پر اعتقاد رکھنا جدید علوم کی رو سے سازگار نہیں ہے مثلاً میکسٹری میں یہ بات مسلم ہے کہ مادہ اور انرجی ہمیشہ ثابت ہیں لہذا کوئی بھی شے عدم سے وجود میں نہیں آتی اور کوئی موجود بھی پوری طرح فنا نہیں

^۱ آئندہ دروس میں مزید وضاحت آئے گی۔

ہوتا حالانکہ خدا پر عقیدہ رکھنے والوں کا یہ کہنا ہے کہ اس نے مخلوقات کو عدم سے بہستی کی صورت میں وجود بخشا ہے۔ اسی طرح بیالوجی میں یہ ثابت ہو چکا ہے کہ زندہ موجودات بے جان موجودات سے متولد ہوتے ہیں اور آہستہ آہستہ انہیں کمال حاصل ہوتا ہے، یہاں تک کہ انسان وجود میں آتا ہے حالانکہ خدا پر ایمان رکھنے والوں کا عقیدہ ہے کہ اس نے ہر ایک کو جداگانہ خلق کیا ہے۔ جواب میں یہ کہنا بہتر ہے کہ پہلے یہ کہ مادہ ۱ اور انرجی کی بقا کا قانون ایک علمی اور تجربی قانون کے عنوان سے تھا ان موجودات کے لئے ثابت ہے کہ جو قابل تجزیہ ہیں، لہذا اس کے ذریعہ اس فلسفی مسئلہ کو حل نہیں کیا جاسکتا، کہ مادہ یا انرجی ازلی و ابدی ہیں یا نہیں؟

دوسرے یہ کہ مجموعی اعتبار سے مادہ، انرجی کا ثابت ہونا اور اس کی ہیئگی سے تعلق رکھنا کسی خالق سے بے نیازی کی دلیل نہیں ہے بلکہ دنیا و جہان کی عمر جس قدر بھی طولانی ہوگی اس خالق کی ضرورت اتنی ہی زیادہ ہوگی، اس لئے کہ معلول کے لئے علت کی احتیاج کا معیار اس کی ذاتی وابستگی اور اس کا ممکن ہونا ہے نہ یہ کہ وہ حادث ہے اور محدودیت (قید) زمانی سے متصف ہے۔ ایک دوسری تعمیر کے مطابق مادہ اور انرجی جہان کی علت مادی کو تشکیل دیتے ہیں، نہ علت فاعلی کو بلکہ وہ خود علت فاعلی کے محتاج ہیں۔

تیسرے مادہ و انرجی کے ثابت ہونے کا لازمہ یہ نہیں ہے کہ نئے موجودات وجود میں نہ آئیں اور ان میں کمی یا زیادتی واقع نہ ہو، بلکہ بعض موجودات جیسے روح، عقل ارادہ وغیرہ مادہ اور انرجی کی قسم سے نہیں ہیں، کہ جس کی کمی یا زیادتی، مادہ اور انرجی کے قانون بقا سے منافات رکھے۔ چوتھے: فرضیہ بحال جسے ابھی تک پوری طرح علمی حلقے میں اعتبار نہیں ملا ہے اور جسے بہت سے مفکرین نے رد کیا ہے، خدا پر اعتقاد رکھنے سے منافات نہیں رکھتا، اور حد اکثر زندہ موجودات کے درمیان صرف علت اعدادی کو ثابت کرتا ہے نہ یہ کہ خدا سے اس کے رابطہ کی نفی کرتا ہے، جس کی دلیل یہ ہے کہ اسی فرضیہ کے بہت سے طرفدار آج بھی اور گذشتہ ادوار میں جہان و انسان کے پیدا کرنے والے پر ایمان رکھتے تھے اور رکھتے آئے ہیں۔

سوالات

- ۱۔ حس گرائی اور نامحس امور کے انکار پر کیا اشکالات ہیں؟
- ۲۔ وہ اشکالات کیا ہیں جو بعض ماہر سماجیات کے فرضیہ پر وارد ہوئے ہیں جو اس بات کے قائل ہیں کہ وجود خدا کا نظریہ انسان کے خوف و جہل کا نتیجہ ہے؟
- ۳۔ کیا وجود خدا پر ایمان رکھنے کا عقیدہ علییت کی کلیت سے منافات رکھتا ہے؟ کیوں؟
- ۴۔ کیا مادہ اور انرجی کی بقا کا قانون پروردگار عالم پر اعتقاد رکھنے سے منافات رکھتا ہے؟ کیوں؟
- ۵۔ کیا فرضیہ تکامل وجود خدا پر ایمان رکھنے کے عقیدہ کو باطل قرار دیتا ہے؟ کیوں؟

چودھواں درس

مادی جہان بینی اور اس پر تنقید

مادی جہان بینی کے اصول

مادی جہان بینی کے لئے درج ذیل اصول فرض کئے جاسکتے ہیں پہلی اصل: ہستی جو مادہ اور مادیات کے ہم پلہ و مساوی ہے اور اسی چیز کو موجود کا نام دیا جاسکتا ہے کہ جو یا تو مادہ اور حجم سے متصف ہونے کے علاوہ ابعاد ثلاثہ (طول، عرض، عمق) سے متصف ہو، یا مادہ کے خواص میں سے اس کا شمار ہو اور اسی ضمن میں مادہ بھی قابل تقسیم اور کیمیت کا حامل ہے لہذا اسی اصل کی بنیاد پر خدا کے وجود کا ایک غیر مادی اور طبیعت سے بلند موجود ہونے کے عنوان سے انکار کر دیا جاتا ہے۔ دوسری اصل: مادہ ازلی و ابدی نیز نا قابل خلق ہے اور کسی علت کا محتاج بھی نہیں ہے اور اصطلاح فلسفی کے مطابق ”واجب الوجود“ ہے۔

تیسری اصل: اس جہان کے لئے علت غائی اور کسی ہدف کا تصور نہیں کیا جاسکتا اس لئے کہ کسی باشعور فاعل کا وجود نہیں ہے کہ جس کے لئے ہدف کا تصور کیا جائے۔

چوتھی اصل: اس جہان کے موجودات (اصل مادہ کے علاوہ) مادہ کے ذرات کا ایک دوسرے پر اثر انداز ہونے کی وجہ سے وجود میں آئے ہیں، اسی وجہ سے گذشتہ موجودات کو آنے والے موجودات کے لئے شرط اور علت اعدادی مانا جاتا ہے، اور مادیات کے درمیان اکثر ایک قسم کی فاعل طبیعی کو قبول کیا جاتا ہے، جیسے کہ درخت کے پھل کے لئے فاعل طبیعی یا بیالوجی اور کمپوٹر کے اثرات کو خود اسی کی طرف نسبت دی گئی ہے، پھر کسی بھی موجود کے لئے فاعل الہی اور ہستی بخش کی ضرورت نہیں ہے۔ مذکورہ

^۱ مفہوم مادہ اور اس کی تعریف سے زیادہ آشنا ئی کے لئے ۲۴۹۲۶۹ پاسداری از سنگربائی آئیڈیا لوجیک،، جہان بینی مادی ص ۲۹۷، ۲۹۲ اور آموزش فلسفہ ج ۲، ص ۱۴۱ اکتالیسویں درس کی طرف رجوع کریں۔

اصول کے علاوہ اصل پنجم کا اضافہ کیا گیا ہے جو معرفت شناسی سے مربوط ہے بلکہ ایک طرح سے تمام اصول پر مقدم ہے اور وہ یہ ہے کہ صرف اسی شناخت کو معتبر مانا جاسکتا ہے کہ جو تجربہ حسی کے نتیجہ میں حاصل ہو، اور چونکہ حسی تجربہ صرف مادہ اور مادیات کے وجود کو ثابت کرتے ہیں لہذا کسی بھی شے کا وجود غیر قابل قبول ہے۔ لیکن اس اصل پنجم کا باطل ہونا گذشتہ درس میں بیان کیا جا چکا ہے اسے دوبارہ بیان کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے، بلکہ بقیہ چار اصول کے سلسلہ میں گفتگو جاری رہے گی۔

پہلی اصل

مادی جان بینی میں اس اصل کا ثار بنیادی اصول میں کیا جاتا ہے لیکن یہ اصل بے بنیاد دعوے کے علاوہ کچھ نہیں ہے، اور ماوراء طبعیت کے انکار کے لئے کسی بھی قسم کے برہان و دلیل قائم نہیں کی جاسکتی، بالخصوص مائریالٹی معرفت شناسی کے ذریعہ کہ جس کی بنیاد اصالت حس و تجربہ پر قائم ہے، ماوراء طبعیت کی نفی پر دلیل لانا غیر ممکن ہے، اس لئے کہ یہ بات بخوبی روشن ہے کہ کوئی بھی ۲۴۹۲۴۹۲ حس تجربی، اپنے حدود یعنی مادہ اور مادیات سے ہٹ کر کسی شے کی نفی یا اثبات کا فریضہ انجام نہیں دے سکتی، حس گرائی کی منطق کی بنا پر حد اکثر جو مطلب ثابت کیا جاسکتا ہے۔

وہ یہ ہے کہ ۲۴۹۲۴۹ حصہ تجربی، سے ماوراء طبیعت کو ثابت نہیں کیا جاسکتا، لہذا اس صورت میں کم از کم اس کے موجود ہونے کا احتمال باقی رہ جاتا ہے، اور جیسا کہ ہم نے پہلے بھی اشارہ کیا ہے کہ انسان بہت سے غیر مادی موجودات کو جو مادہ کی خصوصیات کی حامل نہیں ہیں منجملہ روح کو، اپنے علم حضوری کے ذریعہ درک کر لیتا ہے، اس کے علاوہ بھی مجردات کے اثبات میں بے شمار دلیلیں فلسفی کتابوں میں ذکر کی گئیں ہیں^۲۔ موجود مجرد یعنی روح کے شواہد میں سے روئے صادقہ، مرتاضوں کے خارق عادات امور اور

۱ اس سلسلہ میں مزید اصلاح کے لئے آئیٹیا لوجی تطبیقی کے اٹھویں درس سے سولہویں درس تک، اور آموزش فلسفہ کے تیرہویں درس سے اٹھارہویں درس تک کا مطالعہ کیا جائے۔

۲ نمونہ کے لئے آموزش فلسفہ ج ۲، چوالیسویں درس سے انچاسویں درس کا مطالعہ کریں۔

انبیاء، ائمہ عظیم السلام اور اولیاء الہی کے معجزات و کرامات میں بسر حال خدا کے وجود اور اس کے جہانی نہ ہونے پر جو دلائل قائم کئے گئے ہیں اس اصل کے بطلان کے لئے کافی ہیں^۱۔

دوسری اصل

اسی اصل میں مادہ کے ازلی اور ابدی ہونے پر تاکید اور پھر یہ نتیجہ حاصل کیا گیا ہے کہ وہ خلق کئے جانے سے مستغنی ہے۔ لیکن مادہ کا ازلی اور ابدی ہونا، علمی اور تجربی دلائل کے ذریعہ یہ بات قابل اثبات نہیں ہے اس لئے کہ تجربہ کا دائرہ محدود ہے اس لئے کہ کوئی بھی تجربہ زمان و مکان کے اعتبار سے جہان کے بے نہایت ہونے کو ثابت نہیں کرتا۔

تیسری اصل

تیسری اصل جہان کے ہدف مند ہونے کا انکار ہے جس کے نتیجہ میں خالق کے منکر ہونے کا لازمہ پیش آتا ہے، لہذا خدا کے وجود کے ثابت ہونے کے ساتھ یہ اصل بھی باطل ہو جاتی ہے، اس کے علاوہ یہ سوال باقی ہے کہ ایک عقل مند انسان اس منظم جہان کو دیکھتے ہوئے کس طرح اس کے بے هدف ہونے کو مان سکتا ہے جبکہ اس میں نہایت نظم و ضبط کے علاوہ بے شمار آثار و فوائد رونما ہیں۔

چوتھی اصل

چوتھی اصل مادی موجودات میں علیت کو منحصر سمجھنا ہے، لیکن اس اصل پر بے شمار اعتراضات ہیں جن میں سے مهم ترین اعتراضات درج ذیل ہیں۔ پہلے یہ کہ اس اصل کی بنیاد پر اس جہان بینی میں کسی نئے موجود کا وجود میں آنا غیر ممکن ہے، حالانکہ ہم برابر عالم انسان اور حیوانات میں نئے موجودات کی پیدائش کے شاہد ہیں، کہ جن میں سے مهم ترین حیات، شعور، عواطف، احساسات

^۱ کتاب (نقدی فشرده بر اصول مارکسیسم) میں دوسرے درس کی طرف رجوع کریں۔

^۲ اسی کتاب کے ساتویں اور آٹھویں درس کا مطالعہ کیا جائے اسی طرح کتاب آموزش فلسفہ کے باسٹھویں اور ترسٹھویں درس کا مطالعہ کیا جائے۔

اور مادہ کا ازلی ہونا اس بات کا لازمہ نہیں ہے کہ وہ خالق سے بے نیاز ہے جس طرح سے کہ ایک ازلی مکینکی حرکت کا فرض، ازلی قوت محرک کا لازمہ ہے نہ یہ کہ وہ قوت محرک سے بے نیاز ہے۔
مادہ کا خلق ہونے سے مستغنی ہونا، واجب الوجود ہونے کے مساوی ہے، اور ہم نے آٹھویں درس میں اس بات کو ثابت کر دیا ہے کہ مادہ کا واجب الوجود ہونا محال ہے۔

اور انکار ہیں۔ مائریلیٹوں کا کہنا ہے کہ یہ موجودات مادہ کے خواص کے علاوہ کچھ اور نہیں ہیں۔ تو ان کے جواب میں ہم یہ کہیں گے کہ امتداد اور تقسیم پذیری مادہ اور مادیات کی خصوصیات میں سے ہے جبکہ یہ خصوصیات ان کے وجود میں نہیں پائی جاتیں۔ اور وہ موجودات جنہیں مادہ کے خواص کے نام سے یاد کیا جاتا ہے بے شک یہ خواص بے جان مادہ میں نہیں پائے جاتے یا ایک دوسری تیسیر کے مطابق مادہ ایک مدت تک ان خواص سے عاری ہے اور ایک مدت کے بعد وہ ان سے متصف ہو جاتا ہے، پس وہ موجودات جنہیں خواص مادہ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے اسے بھی کسی خالق کی ضرورت ہوگی جو اسے مادہ کی صورت میں وجود بخشنے اور یہ وہی علت ہے کہ جسے علت ایجادی اور ہستی بخش کہتے ہیں۔

اس قول کے تحت ایک دوسرا اعتراض یہ ہے کہ اس قول کی بنیاد پر تمام موجودات کا وجود میں آنا جبری ہے، اس لئے کہ مادہ کی تاثیر اور اس کے تاثرات میں انتخاب و اختیار کا کوئی وجود نہیں ہے، اور اختیار سے انکار خلاف وجدان ہونے کے علاوہ تمام معنوی و اخلاقی اقدار کے منافی ہونے کے ساتھ ساتھ ہر قسم کی ذمہ داریوں سے انکار کا ہے اور ظاہر ہے کہ معنوی اقدار اور ذمہ داری سے انکار کے نتیجے میں انسانی زندگی میں کس طرح کے اثرات مرتب ہوں گے؟

(وہ سب عیاں ہیں) آخر کار، مادہ کے واجب الوجود نہ ہونے کی صورت میں جیسا کہ ثابت ہو چکا ہے، کسی نہ کسی علت کی ضرورت ہوگی، اور یہ علت کبھی بھی علت طبعی اور علت اعدادی نہیں ہو سکتی، اس لئے کہ روابط تنہا مادیات میں ایک دوسرے کے ساتھ متصور ہیں، لیکن تمام مادہ کا، علت کے ساتھ اس طرح کے رابطہ ہونے کا تصور نہیں کیا جاسکتا، لہذا جو علت بھی مادہ کو وجود بخشنے کی وہ علت ایجادی اور موراہادی ہوگی۔

سوالات

۱۔ مادی جہان بینی کے اصول بیان کریں؟

۲۔ مادہ اور مادی شی کی تعریف کریں؟

۳۔ پہلی اصل پر ہونے والے اشکالات کو بیان کریں؟

۴۔ دوسری اصل پر ہونے والے اشکالات کو بیان کریں؟

۵۔ تیسری اصل پر تنقید کریں؟

۶۔ چوتھی اصل پر ہونے والے اشکالات کو بیان کریں؟

پندرہواں درس

ماٹریالیسم ڈیالیکٹک اور اس پر تنقید

ملیکنی اور ڈیالیکٹک ماٹریالیسم

ماٹریالیسم کی مختلف شاخیں ہیں، کہ جن میں سے ہر ایک اپنے انداز میں کائنات اور اس کی اشیاء کی پیدائش کو بیان کرتا ہے لیکن عصر جدید کے آغاز میں ان لوگوں نے جہان کے موجودات کی پیدائش کو ملیکنی حرکت کی بنیاد پر مفاہیم فیزک نیوٹنی کے ذریعہ بیان کرنے کی کوشش کی ہے، اور ہر اس حرکت کو قوت محرکہ کا معلول سمجھا ہے کہ جو خارج سے جسم متحرک میں داخل ہوئی ہے، ایک اور تعمیر کے مطابق وہ لوگ اس جہان کو ایک عظیم گاڑی کی طرح تصور کرتے ہیں کہ جس میں قوت محرکہ ایک حصہ سے دوسرے حصہ میں منتقل ہوتی ہے اور اس طرح یہ عظیم گاڑی حرکت میں آجاتی ہے۔ یہ فرضیہ (ماٹریالیسم ملیکنی) کے نام سے مشہور ہوا ہے مختلف جہت سے اس نظریہ کے ضعیف ہونے کی وجہ سے، مخالفین کی جانب سے شدید مخالفت کا سامنا کرنا پڑا، منجملہ یہ کہ اگر ہر حرکت، قوت خارجی کا معلول ہے تو اس صورت میں جہان کے مادہ اول کے لئے بھی، کسی قوت کو فرض کرنا ہوگا کہ جو خارج سے اس کے جسم میں داخل ہوئی ہو اور اس امر کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا، باوراء مادہ ایک قوت کو قبول کرنا ہوگا کہ جو کم از کم عالم مادہ میں پہلی حرکت کا عامل بنی ہو۔

دوسرا نقطہ ضعف یہ ہے کہ ملیکنی قوت کے ذریعہ صرف وضعی اور انتقالی حرکات کی توجیہ کی جاسکتی ہے حالانکہ تمام موجودات جہان کو مکانی تغیرات میں منحصر نہیں سمجھا جاسکتا، لہذا موجودات جہان کی پیدائش میں کسی اور موجود کو عامل ماننا پڑے گا۔ ان اعتراضات کے سامنے ملیکنی ماٹریالیسم کی ناتوانی سبب بنی، کہ وہ لوگ اس جہان کی پیدائش کے لئے کسی دوسرے عامل کی تلاش شروع کریں لہذا انہوں نے بعض حرکات کو بصورت ڈینامیکی تفسیر کی، اور مادہ کے لئے ایک قسم کی خود تحرکی کا نظریہ تسلیم کر لیا۔ مکتب ماٹریالیسم

ڈیالٹیک کے نظریہ کی بنیاد رکھنے والے منجملہ (مارکس و انگلس ہگل) میں کے انھوں نے مادی موجودات کے باطنی تضاد کو عامل حرکت کے عنوان سے پہنچانے کی کوشش کی ہے، اور اصول مادہ کا ابدی اور خلق ہونے سے مبرا ہونا، موجودات کا ایک دوسرے پر اثر انداز ہونا اور اجتماعی حرکت کو قبول کرنے کے علاوہ اپنے فرضیہ کو ثابت کرنے کے لئے جدید اصول پیش کئے۔

قاعدہ تضاد کی تغیرات کو کیفی تغیرات میں تبدیل کرنا قاعدہ نفی نفی یا (طبیعت میں تحقیق و جستجو کا قانون) اب اس کے بعد ہم ان تینوں اصل کو بیان کریں گے اور اس پر ہونے والے اعتراض کو ذکر کریں گے۔ ۲۹۲۴۹ قاعدہ تضاد، مائریلیسم ڈیالٹیک کے مطابق ہر موجود دو ضدوں سے مرکب ہے (فعال و غیر فعال) (THESE ANTI THESE) (موجودات میں تضاد کا پایا جانا حرکت کا سبب ہے، یہاں تک کہ غیر فعال غالب ہو جاتا ہے اور ایک دوسرا موجود جو (انقلاب) (CENTTHESE) کے نام سے وجود میں آتا ہے، جیسے انڈا جو اپنے آغاز میں ایک لطفہ ہوتا ہے کہ جو آہستہ آہستہ رشد کرتا ہے اور ایک مدت کے بعد ایک بچہ جو بہ صورت انقلاب (CENTTHESE) ہے وجود میں آتا ہے۔

فیزیک میں مثبت اور منفی تضاد کا ایک نمونہ ہے جس طرح سے کہ جمع و تفریق ابتدائی ریاضیات میں تضاد کا ایک نمونہ ہے، اور کال ریاضی میں جمع اور تفریق تضاد کا ایک نمونہ ہے یہ کیفیت موجودات اجتماعی اور تاریخی میں بھی قابل مشاہدہ ہے مثلاً دولت مندوں کے مقابلہ میں فقراء غیر فعال) (ANTI THESE میں جو آہستہ آہستہ رشد کرتے ہیں اور دو لتمدنوں کے مقابلہ میں کامیاب ہو جاتے ہیں اس طرح دو لتمدنوں کے مقابلہ میں انقلاب (CENTTHESE) فقراء کی جماعت بصورت سویا لٹی اور کمیونسٹی وجود میں آ جاتی ہے۔

منقید

آغاز سخن میں اس نکتہ کی طرف توجہ رہے کہ دو مادی موجود کا اس طرح اکٹھا ہونا کہ ایک دوسرے کی تضعیف کا سبب بنے، یا ایک دوسرے کی نابودی کا درپے ہو، اس مطلب کو ہر ایک نے قبول کیا ہے جیسا کہ اس کی مثال آگ اور پانی کے اکٹھا ہونے کی صورت

میں دی جاتی ہے لیکن یہ قاعدہ کلیہ نہیں ہے اور اسے تمام موجودات پر صادق آنے والے قاعدہ کے عنوان سے نہیں مانا جاسکتا، اس لئے کہ اس ضمن میں سیکڑوں مثالیں موجود ہیں۔ دوسرے یہ کہ بعض مادی موجودات میں تضاد کا پایا جانا، اس تناقض و تضاد سے کہ جو منطق و فلسفہ کی کتابوں میں ذکر ہوئے ہیں، اور جن کا محال ہونا بدیہی ہے کسی بھی حال میں کوئی ربط نہیں ہے، اس لئے کہ (موضوع واحد) میں اجتماعِ ضدین کو محال سمجھا گیا ہے اور جو مثالیں بیان کی گئیں ہیں ان میں موضوع واحد نہیں ہے، اور مارکسٹوں نے ضدین کے تحت جو مثالیں (اجتماع جمع و تفریق میں) پیش کی ہیں ان کو بیان کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے اسی طرح ان پیگنویوں کو ذکر کرنے کی بھی کوئی ضرورت نہیں ہے جو نظام سرمایہ داری سے متصف ممالک میں حکومت و کارگر کے قیام میں بیان کی گئی ہیں۔ تیسرے یہ کہ اگر ہر موجود دو ضدوں کا مجموعہ ہو تو ان میں فعال اور غیر فعال کے لئے بھی ایک دوسری ترکیب کو فرض کرنا پڑے گا، اس لئے کہ وہ بھی ایک موجود ہیں، اور اصل مذکور کی بنیاد پر ان کا بھی دو ضدوں سے مرکب ہونا ضروری ہے، اس طرح ہر محدود موجود کا بے نہایت تضاد سے مرکب ہونا لازم آتا ہے۔

لیکن وہ باطنی تضاد جسے عامل حرکت کے عنوان سے پہنچوایا گیا ہے اور اس طرح ملیکنی مائریالیسم کے نقطہ ضعف کو ختم کرنے کی کوشش کی گئی ہے، اس پر ہونے والے اعتراضات میں سے ایک معمولی اعتراض یہ ہے کہ اس فرضیہ کے لئے کسی بھی علمی دلیل کا وجود نہیں ہے اس کے علاوہ خارجی قوت کے ذریعہ وجود میں آنے والی ملیکنی حرکت سے کسی بھی حال میں انکار نہیں کیا جاسکتا، لیکن فوئبال کی حرکت کو اس کے داخلی تضاد کا نتیجہ سمجھنا باطل ہے۔

قاعدہ ہش

چونکہ جان میں ہونے والے تغیرات تدریجی اور ایک سمت میں رواں نہیں ہیں، اور بعض اوقات ایسے موجودات میں وجود پائے جاتے ہیں کہ جو گذشتہ موجودات سے کسی بھی صورت میں مشابہ نہیں ہوتے اور انہیں گذشتہ حرکت کی ایک کڑی نہیں مان سکتے لہذا مارکسٹوں نے ایک دوسری اصل بنام ”ہش“ یا بنام (تغیرات کمی) (مقداری) سے تغیرات کیفی میں متقل ہو جانا) کا سہارا

لیا اور اس طرح بیان کرنے کی کوشش کی، کہ تغیرات کمی جب ایک معین حد تک پہنچ جاتی ہے تو وہ تغیری کیفی کی پیدائش کا سبب بن جاتی ہے جس طرح سے کہ جب پانی کی حرارت ایک معین مقدار تک پہنچ جائے تو وہ پانی بخار میں تبدیل ہو جاتا ہے یا جب ایک درجات حرارت میں اپنی معین مقدار کو پہنچ جائے تو وہ پگھل جاتی ہے اسی طرح جب ساج میں اختلافات شدید ہو جائے تو انقلاب وجود میں آ جاتا ہے۔

منقید

پہلے تو یہ کہ کسی بھی حال میں کیمیت کیفیت میں نہیں بدلتی، ہاں اتنا ضرور ہے کہ کسی خاص موجود کی پیدائش میں ایک معین کیمیت کے وجود کی ضرورت ہے، جیسے پانی کا درجہ حرارت، بخار میں تبدیل ہمیں ہوتا بلکہ پانی کے بخار میں تبدیل ہونے کے لئے ایک معین مقدار میں حرارت کا پایا جانا ضروری ہے۔ دوسرے یہ کہ، ضروری نہیں ہے کہ یہ کیمیت لازم، سابقہ کیمیت میں بالترتیب اضافہ کی وجہ سے ہے، بلکہ سابقہ کیمیت میں کمی واقع ہونے کے سبب جدید کیمیت کے وجود میں آنے کا امکان ہے، جیسے کہ بخار کا پانی میں تبدیل ہونا حرارت کے کم ہونے پر مشروط ہے۔

تیسرے یہ کہ کیفی تغیرات ہمیشہ ناگہانی نہیں ہیں، بلکہ بہت سے مقامات پر تدریجی ہوتے ہیں، جیسا کہ موم اور شیشہ کا پگھلنا تدریجی ہے۔ ہاں جس حقیقت کو یہاں مانا جاسکتا ہے وہ یہ ہے کہ بعض طبعی موجودات کے متحقق ہونے کے لئے ایک کیمیت کا ہونا ضروری ہے، لیکن کیمیت کا کیفیت میں تبدیل، کیمیت میں تدریجی اعتبار سے اضافہ کا لازم ہونا اور تمام کیفی تغیرات کے لئے ایسی کلیت کو تسلیم کر لینا، کسی بھی حال میں قابل قبول نہیں، لہذا قانون جہان شمول بنام (تغیرات کمی سے تغیرات کیفی میں منتقل ہو جانے) کا کوئی وجود نہیں ہے۔

قاعدہ نفی نفی

قاعدہ نفی نفی کا مطلب کہ جسے کبھی قانون تکامل ضدین یا جتھو طبیعت کا نام دیا جاتا ہے یہ ہے دیا لکھی تحولات اور تغیرات میں ہمیشہ فعال (THESE) کے ذریعہ غیر فعال (ANTI THESE) کی نفی کی جاتی ہے اور خود بخود غیر فعال انقلاب (CENTTHESE ANTI THESE) کے ذریعہ متفی ہو جاتا ہے، جیسا کہ گھاس دانہ کی نفی کرتی ہے اور خود وہ گھاس نئے دانوں کے وجود میں آ جانے کی وجہ سے متفی ہو جاتی ہے، اسی طرح نطفہ انڈے کی نفی کرتا ہے اور وہ خود پوزہ کے ذریعہ متفی ہو جاتا ہے، یعنی ہر آنے والا وجود گذشتہ موجود کی بہ نسبت کامل تر ہوتا ہے اور اس اصل قاعدہ کی اہمیت اسی نکتہ میں پوشیدہ ہے کہ یہ (تغیرات کی کیفیت کو آشکار کرتی ہے، اور تغیرات کو کمال کی جانب رواں دواں ہونے کی طرف تاکید کرتی ہے۔

منقید

اس امر میں کوئی شک نہیں ہے کہ ہر تغیر و تحول کے بعد سابقہ حالت متغیر ہو جاتی ہے اور ایک جدید شکل اختیار کر لیتی ہے اور اگر قاعدہ نفی نفی کو اسی معنی میں لیا جائے تو پھر اس کے معنی لوازم تغیر کے بیان کرنے کے علاوہ کچھ اور نہیں ہیں لیکن اس اصل کے لئے جن تفسیروں کو ذکر کیا گیا ہے وہ بہت حرکت اور اس کے بھکالی (بہ تدریج کامل) ہونے کو بیان کرنے والی ہیں لہذا اس کے مطابق یہ کہنا بہتر ہے کہ جان کے تمام تغیرات کا مطلب یہ ہے کہ ہر ہونے والا وجود گذشتہ موجود سے کامل ہونا چاہیے، لیکن یہ امر قابل قبول نہیں ہے، کیا ۲۴۹۲۴۹ یورنیم، شعاعوں کے اثر سے سرب میں تبدیل ہونے کی وجہ سے کامل ہو جاتی ہے؟ کیا پانی بخار میں بدل جانے کے بعد تکامل یافتہ ہو جاتا ہے؟ یا بخار کے پانی میں بدل جانے کی وجہ سے اسے کمال مل جاتا ہے؟ کیا جو درخت خشک ہو جاتے ہیں اور ثمر دینے کی قوت کھوب ٹپختے ہیں وہ راہ کمال کی طرف گامزن ہیں؟ ان تمام شواہد کے ہوتے ہوئے صرف بعض موجودات کے سلسلہ میں قانون تکامل کو مانا جاسکتا ہے، لیکن تمام موجودات کے لئے ایک ہی قانون ہونے کے عنوان سے اسے تسلیم نہیں کیا جاسکتا۔ آخر کار اس امر کی طرف اشارہ کرنا ضروری ہے کہ اگر بالفرض ان تمام اصول (قواعد) کا کھی ہونا مان

لیا جائے تو یہ علوم طبعی میں ثابت شدہ قوانین موجودات کی پیدائش کی کیفیت ہی کو بیان کر سکتے ہیں، لیکن جہاں میں قانون کلی کے ثابت ہونے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ موجودات علت جہاں آفرین سے بے نیاز ہوں، اور جیسے کہ ہم سابق میں بیان کر چکے ہیں کہ مادہ اور مادیات ممکن الوجود ہیں، لہذا ان کا واجب الوجود کا محتاج ہونا ضروری ہے۔

سوالات

- ۱۔ مائریا لیسم ڈیالیکٹی اور ملیکنی کے درمیان موجود فرق کی وضاحت کریں؟
- ۲۔ قاعدہ تضاد کی شرح پیش کریں اور اس پر ہونے والے اشکالات ذکر کریں؟
- ۳۔ قاعدہ جہش اور اس پر ہونے والے اشکالات ذکر کریں؟
- ۴۔ قاعدہ نفی نفی کو بیان کرتے ہوئے اس پر تنقید کریں؟
- ۵۔ کیا ان قواعد کے کلی ہونے کی صورت میں انکا جہاں کے خالق سے بے نیاز ہونا ثابت ہوتا ہے؟ کیوں؟

سولہواں درس

خدا کی لائیت

مقدمہ

گذشتہ دروس میں وجود خدا کی ضرورت کو ثابت کیا جا چکا ہے، اور آخر کے چند دروس میں مادی جہان بینی کے تحت بحث گذر چکی ہے، اس نظریہ کے تحت تحقیق و جستجو سے یہ پہلو روشن ہو گیا، کہ علت (خدا) کے بغیر جہان کو فرض کرنا، نامعقول اور غیر قابل قبول ہے۔ لیکن اب اس کے بعد، ہم توحید کے سلسلہ میں بحث کریں گے اور مشرکین کے غلط عقائد کو برملا کریں گے، لیکن سوال یہ ہے کہ شرک آمیز عقائد انسانوں کے درمیان کیسے رائج ہوئے، اس سلسلہ میں ماہر سماجیات کے نظریات مختلف ہیں، لیکن ان تمام نظریات میں سے کوئی بھی نظریہ قابل اعتماد دلائل سے متصف نہیں ہے، اس ضمن میں شاید یہ کہنا درست ہو کہ آسمانی اور زمینی موجودات میں تنوع و اختلاف شرک آمیز عقائد میں مبتلا ہونے کا سبب بنا، اس طرح ان لوگوں نے ہر موجود کے لئے ایک خاص خدا کو فرض کر لیا، اچھائیوں اور برائیوں کے لئے الگ الگ خدا کے ہونے پر اعتقاد پیدا کر لیا، اور اس طرح ان لوگوں نے جہان کے لئے دو خدا فرض کر لئے۔

اس کے علاوہ چونکہ زمینی حوادث میں جب آفتاب، مانتاب اور ستاروں کی دخالت کو مشاہدہ کیا تو ان کے ذہنوں میں یہ خیال آیا کہ یہ چاند سورج اور ستارے زمینی موجودات کی بہ نسبت ربوبیت سے متصف ہیں، اور چونکہ اپنی طبیعت میں کسی معبود کی پرستش کو لمس کرتے تھے لہذا ان لوگوں نے اپنے خیالی معبودوں کے لئے بت بنائے، اور ان کی پرستش میں مشغول ہو گئے، اس طرح بتوں کو ضعیف انجھار سے متصف لوگوں کے درمیان اصالت مل گئی، اور پھر ہر قبیلہ نے اپنے توہمات کی بنیاد پر بتوں کی عبادت کے لئے قوانین وضع کر لئے تاکہ ایک طرف خدا پرستی کی حس کی تسکین ہوتی رہے اور دوسری طرف اپنی نفسانی خواہشات کو تقدس کا لباس عطا کر

سکیں، اور انھیں مذہبی شکل و صورت دے کر اپنی مراد حاصل کر لیں، اسی وجہ سے آج بھی بت پرستوں کے درمیان ناچتا بگانا، شراب نوشی اور شہوت رانی، مذہبی رسومات کے تحت رائج ہے۔ مذکورہ تمام عوامل کے علاوہ سب سے مهم وجہ وقت کے ظالموں اور جباروں کی خود خواہی اور تکبر جیسے عوامل سبب بنے، کہ وہ اپنا مقصد حاصل کرنے کے لئے سادہ لوح افراد کے انخار سے فائدہ اٹھائیں، لہذا اپنی قدرت و حدود سلطنت کو وسعت دینے کے لئے شرک آلود عقائد کی بنیاد ڈالی، اور اس کی ترویج کرتے رہے اور اپنے لئے ایک قسم کی ربوبیت کے قائل ہو گئے اور اس طرح طاغوتوں کی پرستش مذہبی مراسم کا جز ثار کی جانے لگی کہ جس کی مثالیں ہند، چین، ایران اور مصر کے علاوہ دوسرے ممالک میں بھی قابل مشاہدہ ہیں۔

بہر حال شرک آلود ادیان مختلف اسباب و علل کی وجہ سے وجود میں آئے ہیں جنہوں نے دین الہی کے سایہ میں انسان کے نکال اور کامیابی کے راستہ میں بڑے موانع ایجاد کئے، اسی وجہ سے انبیاء الہی کی تبلیغ کا ایک عظیم حصہ، شرک اور شرک آلودہ افراد سے مقابلہ کے لئے مخصوص تھا۔ لہذا شرک آلود عقائد کی بنیاد، جہانی حوادث کے مقابلہ میں خدا کے علاوہ کسی دوسرے موجود کی ربوبیت کے اعتقاد پر استوار ہے، یہاں تک کہ بہت سے مشرکین اس جہان کے خالق کی، یگانگی کے قائل تھے اور خالقیت میں توحید کو قبول کرتے تھے، لیکن وہ اس سے کم مرتبہ دوسرے درجہ کے سدا کے بھی قائل تھے جو ان کے اعتقاد کے مطابق بطور مستقل اس جہان کو چلانے والے ہیں، اور خالق جہان کو خداؤں کا خدا اور رب الارباب کا نام دیتے تھے۔

لیکن یہ کم درجہ والے خدا کہ جس کے اختیار میں کائنات کا نظام ہے بعض لوگوں کے گمان کے مطابق فرشتے ہیں کہ جنہیں مشرکین عرب خدا کی بیٹیاں کہا کرتے تھے، لیکن بعض لوگوں کے خیال کے مطابق جنات ہیں، یا ستاروں کی روہیں یا گذشتہ لوگوں کی روہیں یا پھر نامرئی موجودات ہیں ہم نے دسویں درس میں اشارہ کر دیا ہے کہ حقیقی خالقیت اور ربوبیت کو ایک دوسرے سے جدا نہیں کیا جاسکتا، لہذا خدا کی خالقیت کو قبول کرتے ہوئے کسی دوسری کی ربوبیت کو قبول کرنا درست نہیں ہے اور جو لوگ اس طرح کے عقیدے رکھتے ہیں وہ اس تناقض سے بے خبر ہیں، لہذا ان کے عقائد کو باطل کرنے کے لئے اتنا ہی کافی ہے کہ اسکے تناقض کو

بیان کر دیا جائے۔ خدا کی یکتائی کے اثبات میں مختلف دلیلیں فلسفی اور کلامی کتابوں میں موجود ہیں، لیکن ہم یہاں پر صرف انہیں دلائل کو پیش کریں گے کہ جو ربوبیت میں یگانگت کو مبراہ راست ثابت کرتے ہوں اور مشرکین کے عقائد کو باطل کرتے ہوں۔ خدا کی لٹائیت پر برہان و دلیل۔ اگر اس جہان کے لئے دو یا دو سے زائد خداؤں کے فرض کو تسلیم کر لیا جائے تو چند حال سے خالی نہیں یا یہ کہ اس جہان کی تمام مخلوقات، ان تمام خداؤں کی مخلوق اور معلول قرار پائے گی یا یہ کہ مخلوقات کے مجموعوں، میں سے ہر مجموعہ، مفروض خداؤں میں سے کسی ایک کی مخلوق اور معلول ہو گا یا یہ کہ یہ تمام موجودات، تنہا ایک خدا کی خلق کردہ اور بقیہ خدا مدبر کی حیثیت سے ہوں گے۔

لیکن ایک موجود کے لئے چند خداؤں کا ہونا محال ہے، اس لئے کہ دو یا چند خالقوں (علت جہان آفرین) کا کسی موجود کو خلق کرنے کا مطلب یہ ہے کہ ان خداؤں میں سے ہر ایک، کسی ایک وجود کا افاضہ کرے، جس کے نتیجہ میں متعدد وجود خلق ہو جائیں گے، حالانکہ ہر موجود کے لئے صرف ایک ہی وجود ہے، وگرنہ ایک موجود نہیں رہ سکتا۔

لیکن دوسرا فرض یہ کہ ان خداؤں میں سے ہر ایک، کسی ایک مخلوق یا مخلوقات کے کسی خاص مجموعہ کا خالق کہلائے تو اس کا لازمہ یہ ہو گا کہ ہر مخلوق اپنے خالق کی مدد سے قائم ہو اور کسی دوسری مخلوق کی محتاج نہ ہو مگر یہ احتیاج ایسی ہو جو اس کے خالق تک پہنچتی ہو اور تنہا وہی خدا اس مخلوق کی رسیدگی کرتا ہو، یا ایک دوسری تفسیر کے مطابق اس جہان کے لئے چند خداؤں کا فرض متعدد نظام کے موجود ہونے کا لازمہ ہے جو ایک دوسرے سے جدا ہیں، حالانکہ اس جہان میں صرف ایک ہی نظام ہے اور تمام موجودات ایک دوسرے سے مربوط ہیں، ایک دوسرے سے متاثر ہیں، ایک دوسرے کے محتاج ہیں، گذشتہ و آئندہ کے تمام موجودات میں ارتباط برقرار ہے، ہر موجود اپنے بعد آنے والے موجود کے لئے راستہ ہموار کرتا ہے پس وہ جہان جس میں صرف ایک ہی نظام برقرار ہے اور اس کے اجزا ایک دوسرے سے مربوط ہیں، اسے چند علتوں کا معلول (چند خداؤں کا خلق کردہ) نہیں قرار دیا جاسکتا۔ اور اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ تمام مخلوقات کا خالق ایک خدا ہے اور بقیہ خدا جہان کی تدبیر اور اس کی ہدایت کے عہدہ دار

میں، تو یہ فرض بھی صحیح نہیں ہو سکتا، اس لئے کہ ہر معلول اپنی پوری ہستی کے ساتھ علت وجود آفرین کے ذریعہ قائم ہے اور کوئی بھی مستقل موجود اس میں تصرف کی قدرت نہیں رکھتا بلکہ یہ تمام معلولات علت وجود آفرین کی طاقت و قدرت کے زیر سایہ میں اور تمام تاثیر اور اثر پذیر ہی اس کے اذن تکوینی کے ذریعہ انجام پاتے ہیں، اس بنا پر ان خداؤں میں سے کوئی بھی حقیقی رب نہیں ہو سکتا، اس لئے کہ رب کا مطلب یہ ہے کہ وہ اپنے مرہوب کی ذات میں بطور مستقل تصرف کرے جبکہ فرض یہ ہے کہ ایسے تصرفات مستقل نہیں ہیں، بلکہ یہ سارے تصرفات اسکی ربوبیت کے زیر سایہ اور اسی کی قدرت سے انجام پاتے ہیں اس طرح کے اختیارات و تصرفات، توحید (ربوبی) سے منافات نہیں رکھتے، جیسے کہ اگر خالقیت بھی اذن خدا سے ہو تو توحید خالقیت کے منافی نہیں ہے قرآن اور روایات میں بعض بندوں کے لئے ایسی خالقیت اور غیر استغالی ربوبیت ثابت ہے، جیسا کہ قرآن نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں فرمایا ہے۔

(وَإِذْ تَخْلُقُ مِنَ الطِّينِ كَهَيْئَةِ الطَّيْرِ بِإِذْنِي فَتَنْفُخُ فِيهَا فَتَكُونُ طَيْرًا بِإِذْنِي) اور جب تم میرے حکم سے مٹی سے پرندہ کی شکل بناتے اور پھر اس پر کچھ دم کرتے ہو اور وہ میرے حکم سے سچ مچ پرندے بن جاتے۔

اسی طرح ایک اور مقام پر فرمایا۔ (فَالْمَدَّ بَرَاتِ أَمْراً^۱) اور ان کی قسم جو زمین و آسمان کے درمیان تیرتے پھرتے ہیں۔ نتیجہ۔ جہان کے لئے چند خداؤں کا توہم، خدا کو مادی اور اعدادی علتوں سے قیاس کرنے کے ذریعہ وجود میں آیا ہے حالانکہ علت وجود آفرین کو ایسی علتوں سے تشبیہ نہیں دی جاسکتی، اور کسی بھی معلول کے لئے چند علت وجود آفرین یا رب یا مستقل مدبر فرض نہیں کیا جاسکتا۔ لہذا اس توہم کو دفع کرنے کے لئے پہلے علت وجود آفرین کے معنی اور پھر اس کی خصوصیات اور نوعیت میں خوب غور کرنا ہوگا، تاکہ معلوم ہو جائے کہ معلول واحد کے لئے چند علتوں کا تصور باطل ہے، اور پھر اس جہان کے انتظامات میں غور و فکر کرنا ہوگا تاکہ معلوم ہو جائے کہ ایسا منظم جہان چند خداؤں یا چند ارباب یا مستقل مدبروں کا خلق کردہ نہیں ہے۔ اس ضمن میں یہ بات بھی

^۱ سورۃ مائدہ۔ آیت / ۱۱۰

^۲ سورۃ نازعات۔ آیت / ۵

واضح ہوگئی، کہ خدا کے بعض شائستہ بندوں کے لئے ولایت تکوینی کو ماننا جبکہ مستقل خالقیت اور ربوبیت کے معنی میں نہ ہو تو، یہ توحید سے منافات نہیں رکھتا، جیسا کہ رسول اکرم ﷺ اور ائمہ علیہم السلام کی ولایت تشریعی الہی ربوبیت تشریعی سے کوئی منافات نہیں رکھتی، اس لئے کہ یہ خدا کی عطا کردہ اور اسی کے حکم سے ہے۔

سوالات

- ۱۔ شرک آلود عقائد کی پیدائش کے اسباب بیان کریں؟
- ۲۔ شرک سے آلود عقائد کی بنیاد کیا ہے؟
- ۳۔ خالقیت اور ربوبیت کے درمیان پائے جانے والے لازمہ کو بیان کریں؟
- ۴۔ کیوں ہر موجود کے لئے چند خالقوں کا فرض کرنا باطل ہے؟
- ۵۔ کیوں مخلوقات کے ہر مجموعہ کے لئے کسی ایک خالق کو فرض نہیں کیا جاسکتا؟
- ۶۔ اس امر میں کیا اشکال ہے کہ یہ جہان خدائے واحد کا خلق کردہ ہے اور اس کے لئے متعدد ارباب ہیں؟
- ۷۔ چند خداؤں کا توہم کہاں سے وجود میں آیا اور اسے دفع کرنے کا راستہ کیا ہے؟
- ۸۔ کیوں اولیاء الہی کے لئے ولایت تکوینی کا تصور خالقیت و ربوبیت میں توحید سے منافات نہیں رکھتا؟

سترہواں درس

توحید کے معانی

مقدمہ

کلمہ توحید لغوی اعتبار سے ”یگانہ اور یکتا“ کے معنی میں آیا ہے لیکن فلاسفہ، متکلمین، علماء اخلاق اور عرفاء کی نظر میں یہ متعدد معانی میں استعمال ہوتا ہے، اور ان معانی میں سے ہر ایک توحید پر دلالت کرتا ہے، جنہیں اقسام توحید یا ”مراتب توحید“ بھی کہا جاتا ہے، لیکن یہاں پر ان کا بیان کرنا ہمارے ہدف سے خارج ہے۔ اسی وجہ سے یہاں پر ہم اس بحث سے مناسب اصطلاحات کا ذکر کریں گے، ۱۔ تعدد کی نفی: توحید کی سب سے پہلی اور معروف اصطلاح خدا کی وحدانیت کا اعتقاد رکھنا ہے نیز شرک صریح کے مقابلے میں تعدد خدا کی نفی یعنی دو یا دو سے زائد خدا کے وجود سے انکار اس طرح سے کہ ہر ایک کا وجود مستقل اور ایک دوسرے سے علیحدہ ہو۔

۲۔ ترکیب کی نفی: دوسری اصطلاح اس معنی میں ہے، کہ اس کی احدیت نیز درون ذاتی کے اعتبار سے، اس کے بیلٹ ہونے کا اعتقاد رکھتا ہے یعنی ذات الہی، بالفعل اور بالقوہ اجزائے مرکب نہیں ہے۔ اس صفت کو زیادہ تر بصورت صفات سلیمہ بیان کیا جاتا ہے، جیسا کہ دسویں درس میں اشارہ کیا جا چکا ہے، اس لئے کہ ہمارا ذہن مفہوم ترکیب اور اس کے بطلان سے مفہوم بساطت کی بہ نسبت زیادہ آشنا ہے۔

۳۔ زائد بر ذات صفات کی نفی: تیسری اصطلاح ذات الہی کا صفات ذاتیہ کے ساتھ یگانگت اور صفات کے زائد بر ذات نہ ہونے کے معنی میں ہے، کہ جسے (توحید صفاتی) کہا جاتا ہے اور روایات میں ”نفی صفات“ کے عنوان سے ذکر کیا گیا ہے جبکہ اشاعرہ

صفات الہیہ کے زائد بر ذات اور قدامت ثانیہ ہونے کے قائل ہیں۔ توحید صفاتی کی دلیل یہ ہے کہ اگر تمام صفات الہی میں سے ہر ایک کے لئے جداگانہ و علیحدہ مصداق فرض کر لئے جائیں تو چند صورتوں سے خالی نہیں ہے، پہلی صورت، یا ان صفات کے مصداق ذات الہی میں یا داخل ہوں گے جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ ذات الہی کا اجزا سے مرکب ہونا لازم آئے گا کہ مرکب کہلائے، جس کو ہم پہلے ہی بیان کر چکے ہیں کہ ایسا ہونا محال ہے یا وہ مصداق ذات الہی سے جدا فرض کئے جائیں گے ایسی حالت میں یا تو وہ واجب الوجود ہوں گے یعنی وہ پیدا کرنے والے سے بے نیاز ہوں گے، یا وہ ممکن الوجود ہوں گے کہ جس کے لیے ایک خالق کا ہونا ضروری ہے، لیکن صفات واجب الوجود ہونے کا فرض تعدد ذات اور شرک صریح کا موجب ہے، اور ہم یہ تصور نہیں کر سکتے کہ کسی مسلمان کا عقیدہ ایسا ہوگا،

یا پھر صفات کا ممکن الوجود ہونے کا یہ مطلب ہے کہ خداوند عالم ان صفات سے عاری ہے مزید برآں، وہ ان صفات کو خلق کرے اور پھر ان سے متصف ہو جائے جیسے اگر وہ حیات نہیں رکھتا لیکن وہ ایک موجود بنام ”حیات“، خلق کرے، اور اس طرح وہ حیات کا مالک بن جائے اسی طرح اس کی دوسری صفات بھی فرض کر لی جائیں، حالانکہ یہ امر محال ہے کہ علت وجود آفرین مخلوقات کے کمالات کا حامل نہ ہو اور اس فرضیہ سے بدتر، تو یہ ہے کہ وہ اپنی مخلوقات کے ضمن میں علم و قدرت اور بقیہ صفات کمالیہ سے متصف ہو۔ اس فرضیہ کے بطلان کے بعد یہ ثابت ہو گیا کہ خداوند عالم کے صفات زائد بر ذات نہیں ہیں بلکہ وہ عین ذات ہیں اور وہ اسے مفہیم ہیں کہ عقل جس سے ایک مصداق بیٹا کہ جسے ذات مقدس الہی رہتے ہیں اخذ کرتی ہے۔

۴۔ توحید افغالی۔ فلاسفہ اور متکلمین کے نزدیک توحید کی چوتھی اصطلاح ”توحید افغالی“ ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ خدا اپنے امور کو انجام دینے میں نہ تو کسی شے کا محتاج ہے اور نہ ہی کسی بھی موجود میں اتنی استعانت ہے کہ وہ اس کے امور میں اس کی مدد کر سکے۔ یہ مطلب علت وجود آفرین کی خصوصیات یعنی ذات الہی کا تمام مخلوقات کے مقابلہ میں قیومت سے متصف ہونے کی طرف توجہ کے ذریعہ سمجھ میں آ جاتا ہے اس لئے کہ ایسی علت کا معلول اپنے تمام وجود کے ساتھ علت کے سہارے قائم ہوتا ہے اور بذات خود کسی

بھی قسم کے استقلال سے عاری نہیں ہے۔ ایک دوسری تعمیر کے مطابق جس کے پاس جو کچھ بھی ہے وہ خدا کا عطا کردہ ہے اور اسی کے دائرہ قدرت میں ہونے کے ساتھ اسی کی مالکیت حقیقی اور تکوینی کے زیر سایہ ہے، اور نیز خدا کی قدرت و مالکیت قدرت الہی کا ایک جز بلکہ اس کے طول میں سے ہے نہ یہ کہ اس کی قدرت خدا کی قدرت کے مد مقابل کسی مزاحمت کا باعث ہے، جیسے کہ ایک غلام کی مالکیت مولیٰ کی اعتباری مالکیت کے زیر سایہ ہوتی ہے ”العبد و مافیہ لمولاه“، لہذا کیسے ممکن ہے کہ خدا ان مخلوقات محتاج و ضرورت مند ہو جو خود اسی کے ذات سے وابستہ اور اسی کے ذریعہ قائم ہیں؟

۵۔ تاثیر استقلالی۔ توحید کی پانچویں اصطلاح اثر اندازی میں استقلال ہے یعنی مخلوقات اپنے امور میں ذات الہی سے بے نیاز نہیں ہیں، اور جو اثرات بھی ایک دوسرے پر ڈالتے ہیں وہ خدا کی دی ہوئی طاقت اور اس کی اجازت سے ہے درحقیقت جو ذات ہر شے سے بے نیاز ہو کر اپنے امور انجام دیتی ہے وہ ذات اقدس الہی ہے، دوسروں کی تاثیر اور فاعلیت، اسی کی تاثیر اور فاعلیت کے زیر سایہ ہے۔ اسی وجہ سے قرآن کریم، طبعی اور غیر طبعی فاعلوں (جیسے جن و انس اور ملک) کی نسبت خدا کی طرف دیتا ہے اور فرماتا ہے کہ بارش کا برسا، سبزہ کا اگنا اور درختوں کا پھل دینا یہ سب اسی کی طرف سے ہے اور اس بات کی تاکید کرتا ہے تاکہ لوگ اس بات کو درک کریں اور برابر خدا کی طرف متوجہ رہیں کہ امور کی نسبت خدا کی جانب تمام عوامل کی بہ نسبت قریب ہے تقریب ذہن کے لئے یہ مثال کافی ہے کہ اگر کسی محکمہ کا رئیس اپنے زیر دست خدمت گزاروں کو کسی امر کے انجام دینے کا فرمان صادر کرے جبکہ امور کا انجام دینا انھیں کاری گروں پر موقوف ہے لیکن کاریگروں کے ذریعہ انجام دیئے گئے امور کی نسبت محکمہ کے رئیس کی طرف دی جاتی ہے بلکہ عقلاً فرمان صادر کرنے والے کی طرف نسبت دینے کو قوی اور بہتر جانتے ہیں۔ فاعل تکوینی کے بھی مراتب میں اور چونکہ کسی بھی فاعل کا وجود ارادۃ الہی کے ذریعہ قائم ہے، بالکل اسی طرح کہ جیسے صورت ذنیہ کا

^۱ عرفاء ”توحید افعالی کو اس معنی میں استعمال کرتے ہیں۔

وجود، تصور کرنے والے کے ذریعہ قائم ہے ”وللہ المثل الاعلیٰ“، لہذا اگر کسی فاعل سے کوئی اثرات ظاہر ہوتے ہیں تو وہ خدا کے اذن اور اس کے ارادہ تکوینی کے سبب سے ہیں (ولاحول ولا قوۃ الا باللہ العلی العظیم)

دو مرتبے

توحیدِ افغالی کا نتیجہ یہ ہے کہ انسان خدا کے علاوہ کسی بھی موجود کو لائقِ عبادت نہ سمجھے، اس لئے کہ صرف انسان کا خالق اور اس کا رب لائق پرستش ہے اور بس، یا ایک دوسری تعمیر کے مطابق الویت، خالقیت اور ربوبیت کا لازمہ ہے۔ اس کے علاوہ انسان کا تمام اعتماد خدا پر ہونا چاہیے اور اپنے تمام امور میں اسی پر توکل کرنا چاہیے، اور صرف اسی سے مدد مانگنا چاہیے اور اس کے علاوہ کسی دوسرے کا خوف دل میں نہیں آنا چاہیے نہ کھائے یہاں تک کہ جب اس کی احتیاجات کو پورا کرنے والے اسباب کا وجود نہ ہو تو تب بھی ناامید نہ ہو اس لئے کہ خدا غیر عادی راہوں سے اس کی احتیاجات کو پورا کرنے کی قدرت رکھتا ہے۔ یہاں انسان اِنْ اَوْلِیَاءَ اللّٰہِ لَا خَوْفٌ عَلَیْہِمْ وَلَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ^۱۔ آگاہ ہو جاؤ اس میں شک نہیں کہ دوستانِ خدا (قیامت میں) نہ کوئی خوف ہوگا اور نہ وہ آزرده خاطر ہوں گے۔

(ایناک نُعبَدُ وَاِیْنَاکَ نَسْتَعِیْنُ) اس آیہ شریفہ میں یہ دو نتیجے موجود ہیں، جسے ہر مسلمان روزانہ کم از کم دس مرتبہ تلاوت کرتا ہے۔ شبہ کا جواب۔ اس مقام پر شاید ذہن میں یہ شبہ اٹھے کہ اگر توحیدِ کامل کا اقتضایہ ہے کہ انسان خدا کے علاوہ کسی دوسرے سے مدد طلب نہ کرے تو پھر اولیاءِ الہی سے بھی مدد طلب کرنا صحیح نہیں ہوگا۔

اس شبہ کا جواب یہ ہے کہ اگر اولیاءِ الہی سے تولی اسی عنوان کے تحت ہو کہ وہ خدا سے ماوراء ہو کے مستقل حیثیت سے مدد کرتے ہیں تو ایسا تولی توحید سے سازگار نہیں ہے، لیکن اگر اس عنوان کے تحت ہو کہ خدا نے انہیں اپنی رحمت تک پہنچنے کا وسیلہ اور بندوں کو ان کی طرف رجوع کرنے کا حکم دیا ہے تو یہ تصور نہ صرف یہ کہ توحید کے منافی نہیں ہے اس کا شمار عبادت و اطاعت

^۱ سورۃ یونس۔ آیت / ۶۲۔

خدا میں ہے، اس لئے کہ یہ توصل اسی ذات الہی کے اذن سے انجام دیا گیا ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ خدا نے کیوں ایسے وسائل بنائے؟ اور کیوں لوگوں کو ان سے توصل کا حکم دیا؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ تمام احکام حکمتوں پر مبنی ہیں جن میں سے بعض حکمتوں کو یہاں ذکر کیا جا رہا ہے۔ ۱۔ لائق بندوں کے مقام کو پہنچوانا۔

۲۔ لوگوں کو ان کے مقام تک لے جانے کے لئے انہیں شوق دلانا۔

۳۔ لوگوں کو اپنی عبادتوں پر مفرور ہونے اور اپنے آپ کو کمالات کے آخری مراتب پر فائز ہونے کے تصور سے روکنا وغیرہ، جیسا کہ وہ لوگ جو ائمہ علیم السلام سے توصل کے منکر تھے وہ اسی طرح کے تصورات کی وجہ سے گمراہ ہوئے ہیں جس کی مثالیں بے شمار ہیں۔

سوالات

۱۔ توحید کے لغوی اور اصطلاحی معنی بیان کریں؟

۲۔ توحید صفاتی کے لئے کیا دلیل ہے؟

۳۔ توحید افعالی کو کیسے ثابت کیا جاسکتا ہے؟

۴۔ تاثیر استقلال میں توحید بہ معنی یگانگت کی شرح پیش کریں؟

۵۔ وہ نتائج جو توحید کی آخری دو قسموں سے حاصل ہوتے ہیں وہ کیا ہیں؟

۶۔ کیا اولیاء سے توصل کرنا توحید سے منافات رکھتا ہے؟ کیوں؟

۷۔ کیوں خدا نے لوگوں کو اولیا سے توصل کا حکم دیا ہے اور اس کی حکمت کیا ہے؟

اٹھارہواں درس

جبر و اختیار

مقدمہ

جیسا کہ گذشتہ دروس میں اشارہ کیا جا چکا ہے کہ تاثیر استغالی میں توحید کا ثار عظیم معارف میں ہوتا ہے کہ جو انسانوں کی تربیت میں نمایاں کردار ادا کرتی ہے، اسی وجہ سے قرآن میں اس مطلب کی طرف بڑی تاکید ہوئی ہے، اور مختلف بیانات کے ذریعہ اس مطلب کو سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے، منجملہ تمام موجودات کا اذن و مشیت، ارادہ و قضاے الہی سے وابستہ ہونے پر ایمان لانا وغیرہ... لیکن اس مطلب کو سمجھنے کے لئے رشد فکری اور عقلی بالیدگی کے علاوہ صحیح تعلیم و تربیت کی ضرورت ہے، اسی وجہ سے وہ لوگ جو عقلی بالیدگی سے متصف نہیں تھے یا ان کی تعلیم میں نقص تھا یعنی جنہوں نے معصوم رہنماؤں، اور قرآن کے حقیقی مفسرین سے استفادہ نہیں کیا، انہوں نے، اس مطلب کو سمجھنے میں غلطی کی، اور یہ سمجھ بیٹھے کہ تمام اثرات اور علیت صرف اور صرف خدا سے وابستہ ہے نیز اسی سے مخصوص ہے اور قرآن کریم کی صریح آیات کے برخلاف انہوں نے اسباب و وسائط سے ہر قسم کی تاثیر اور علیت کی نفی کی ہے اور اس طرح ظاہر کرنے کی کوشش کی ہے کہ مثلاً الہی طریقہ کاریہ ہے کہ جب آگ کا موجود ہوگا تو اس کی حرارت بھی پائی جائے گی اسی طرح کھانا کھاتے وقت سیری اور پانی پیتے وقت سیرابی کا وجود ضروری ہے، وگرنہ ایسا نہیں ہے کہ آگ، حرارت پیدا کرنے میں موثر ہے یا کھانا اور پانی، سیری و سیرابی کے حاصل ہونے میں کوئی رول ادا کرتے ہیں۔

اس انحراف فکری کے برے نتائج اس وقت آشکار ہوتے ہیں کہ جب ہم ان نتائج کو انسان کے افعال اختیاری اور اس کی ذمہ داریوں کے تحت تجزیہ و تحلیل قرار دیتے ہیں اور اس کے سلسلہ میں تحقیق و جستجو کرتے ہیں، یعنی ایسی فکر کا نتیجہ یہ ہے کہ انسان کے تمام افعال خدا سے منسوب ہوں، اور ان امور کے تحت انسان کی فاعلیت سلب ہو جائے، لہذا اس صورت میں کوئی بھی اپنے عمل

کے مقابل میں ذمہ دار نہیں ٹھہر سکتا۔ ایک دوسری تعبیر کے مطابق اس کج اندیشی کا تباہ کن نتیجہ جبر ہے یعنی انسانوں کا اپنے اعمال کے سبب کسی بھی ذمہ داری سے بری ہونا ہے، جس کی وجہ سے تمام نظام، خواہ اخلاقی ہوں یا تربیتی، فردی ہوں یا اجتماعی، بلکہ تشریعی نظام تو سرے ہی سے باطل ہو جاتے ہیں، اس لئے کہ جب انسان اپنے امور میں اختیار کا مالک نہ رہا تو پھر اس کے لئے وظیفہ، تکلیف، امر، نہی، ثواب و عذاب وغیرہ کا کوئی مطلب ہی نہیں رہتا، بلکہ اس فکر کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ نظام تکوینی بے بنیاد ہو جائے گا۔ اس لئے کہ آیات قرآنی اور احادیث کے علاوہ ہر امین عقلی سے جو مطلب سمجھ میں آتا ہے وہ یہ ہے کہ جہان کی خلقت کا ہدف انسان کی کمالیت کے لئے راستہ ہموار کرتا ہے تاکہ یہ انسان اپنے اختیارات کے ذریعہ عبادت و اطاعت اور بندگی کے ذریعہ کمالات کے عظیم درجات اور قرب پروردگار کا مالک بن جائے، اور اس کے اندر پروردگار کی خصوصی رحمت کے مالک بننے کی صلاحیت پیدا ہو جائے لیکن اگر انسان تمام ذمہ داریوں سے بری ہو اور اسے کوئی اختیار نہ ہو تو وہ رضوان الہی، اور خدا کی جاودانی نعمتوں سے سرفرازی کا اہل نہیں ہو سکتا۔

اور اس طرح ہدف خلقت کا نقض ہونا لازم آئے گا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ خلقت کی مشینری ایک کھلونا بن جائے، اور پھر جبری انداز میں کچھ انسان خلق ہوں، اور چند حرکات و افعال کے نتیجہ میں بعض کو سزا اور بعض کو جزا دے دی جائے جبکہ ان امر کی انجام دہی میں سارا نقش اسی مشینری کا ہے اور انسان مجبور ہے۔ اس فکر کے پھیلنے میں مهم ترین عامل ظالم حکومتوں کے برے مقاصد ہیں، جو اپنے ناشائستہ امور کو اس فکر کے ذریعہ علمی جامہ پہناتے تھے، جو اس حربہ کو کمزوروں پر اپنی برتری کے لئے اور مظلوموں کے قیام کو دبانے کے لئے استعمال کرتے تھے، یقیناً ایسے نتائج کے پیش نظر، ملتوں کو خواب غفلت میں رکھنے کے لئے جبر کو ایک خطرناک سبب ماننا ہوگا۔ اس کے علاوہ وہ لوگ جو تھوڑا بہت اس نظریہ کے نقطہ ضعف سے آشنا تھے لیکن توحید کامل اور نفی جبر کے درمیان کوئی راہ حل نکالنے کی طاقت نہیں رکھتے تھے اور نہ ہی اہل یت علیم السلام کی تعلیمات سے استفادہ کرتے تھے، لہذا

^۱ ان آیات کی طرف مراجعہ کریں۔ سورۃ ہود آیت ۷ / سورۃ ملک آیت ۲ / سورۃ کہف آیت ۷ / سورۃ ذاریات آیت ۵۷ / سورۃ توبہ آیت /

تفویض کے قائل ہو گئے، اور انسان کے اختیاری افعال کو فاعلیت الہی کے دائرے سے خارج سمجھ بیٹھے اور اس طرح سے وہ اشتباہ میں مبتلا ہو گئے، اور یوں اسلام کے عظیم معارف اور اس کے فوائد سے محروم ہو گئے۔ لیکن وہ لوگ کہ جو ایسے عظیم معارف کو درک کرنے کی استعداد سے سرفراز تھے اور قرآن کے حقیقی مفسرین کی معرفت حاصل کر چکے تھے، وہ اس کج فکری سے محفوظ رہ گئے، اور چونکہ اپنی فاعلیت اختیاری کو اس قدرت کے سایہ میں دیکھا جسے خدا نے انہیں عطا کیا تھا لہذا اس قدرت کی وجہ سے حاصل ہونے والے افعال کی ذمہ داری قبول کر لی، اور اس کے علاوہ خدا کی جانب سے تاثیر استغالی کو درک کر لیا، اور اس طرح ایسے مفید نتائج کے حصول میں کامیاب ہو گئے۔

خاندان نبوت سے حاصل ہونے والی روایات میں اس بحث کے آثار ملتے ہیں، احادیث میں استطاعت جبر و تفویض کے عنوان کے تحت اور اس کے علاوہ اذن، مشیت، ارادہ، قضا و قدر الہی کے ابواب میں ذکر کیا گیا ہے۔ ان مطالب کے علاوہ بعض روایتوں میں ایسے لوگوں کو ان مسائل میں غور و فکر کرنے سے روکا گیا ہے کہ جو فکری اعتبار سے ضعیف ہیں تاکہ وہ گمراہ ہونے سے محفوظ رہیں۔ ہاں، جبر و اختیار کے مختلف اقسام میں کہ جن میں سے ہر ایک کے سلسلہ میں تحقیق و جستجو اس کتاب کے ہدف سے خارج ہے، لہذا اس موضوع کی اہمیت کی وجہ سے ان میں سے فقط بعض مسائل کو ذکر کریں گے اور ان لوگوں کو ہماری یہ تلقین ہے کہ جو مزید تحقیق کے خواہاں ہیں کہ وہ مبانی عقلی و فلسفی کو سمجھنے میں صبر سے کام لیں۔

اختیار کی وضاحت

ارادہ کی قوت، امور یقینی میں سے ہے کہ جو ہر انسان میں پائی جاتی ہے، اس لئے کہ ہر انسان خطا ناپذیر علم حضوری کے ذریعہ اسے اپنے وجود میں درک کرتا ہے، جیسا کہ اسی علم کے ذریعہ اپنی بقیہ روحی خصوصیات کا پتہ لگاتا ہے یہاں تک کہ علم حضوری ہی کے ذریعہ کسی امر کے سلسلہ میں شک کا بھی احساس کرتا ہے، اور اسے درک کرنے میں کوئی شک نہیں کرتا۔ اسی طرح انسان ایک معمولی توجہ کے ذریعہ اپنے وجود میں اس بات کا احساس کرتا ہے کہ وہ تکلم کر سکتا ہے یا نہیں، غذا تناول کر سکتا ہے یا نہیں، ہاتھوں کو حرکت

دے سکتا ہے یا نہیں۔ کسی بھی امر کو انجام دینے کا ارادہ بنانا کبھی نفسانی خواہشات کو پورا کرنے کے لئے ہوتا ہے جیسے کہ ایک بھوکا کھانا کھانے کا ارادہ کرتا ہے، یا ایک پیاسا پانی پینے کا ارادہ کرتا ہے اور کبھی عقلی آرزوؤں کو پورا کرنے اور انسانی خواہشات کو عملی جامہ پہنانے کے لئے ارادہ کیا جاتا ہے جیسے کہ ایک مریض اپنی سلامتی حاصل کرنے کے لئے تلخ دوائیں کھاتا کرتا ہے، اور لذیذ غذاؤں سے پرہیز کرتا ہے، یا ایک محقق اپنے مقصود کی تلاش میں مادیات سے چشم پوشی کرتا ہے اور بے شمار زحماتیں تحمل کرتا ہے یا ایک فداکار فوجی اپنے ہدف تک پہنچنے میں اپنی جان کو بھی قربان کر دیتا ہے۔

در اصل انسان کی عظمتوں کا اندازہ اس وقت لگتا ہے کہ جب مختلف خواہشیں جمع ہوں، اور اس کے بعد انسان، فناءل اخلاقی، کرامت نفسانی، اور قرب خداوندی و رضوان الہی کو حاصل کرنے کے لئے اپنی پست اور حیوانی خواہشات سے چشم پوشی کر لے، اس لئے کہ کوئی بھی عمل جس قدر دلچسپی اور کامل ارادہ سے انجام دیا جائے گا، اسی کے مطابق روحی تکامل یا منزل حاصل ہوگا، اور اسی اعتبار سے جزاء و سزا کا مستحق ہوگا۔ البتہ نفسانی خواہشات کے مقابل میں ٹھہرنے کی طاقت تمام انسانوں میں برابر نہیں ہے لیکن تمام انسانوں میں یہ (ارادہ) موبت الہی موجود ہے انسان اگر چاہے تو تمرین کے ذریعہ اسے قوی بنا سکتا ہے۔

لہذا ارادہ کے موجود ہونے میں کوئی شک نہیں ہے اور مختلف طرح کے شبہات ذہن میں پیدا ہونے کی وجہ سے ارادہ جیسے امر وجدانی کے سلسلہ میں شک و تردید نہیں ہونا چاہئے اور جیسا کہ ہم نے اشارہ کر دیا ہے کہ اختیار کا وجود ایک آشکار اصل کے عنوان سے تمام ادیان آسمانی، شرائع، اور تربیتی و اخلاقی نظاموں میں قبول شدہ ہے اور اس کے بغیر وظیفہ، تکلیف امر، نبی، جزا و سزا کا کوئی مطلب نہیں ہے۔ وہ امور جو اس حقیقت سے انحراف کا باعث ہوتے ہیں اور جبر سے لگاؤ کا سبب بنتے ہیں ہمیں ان کا جواب دینا ضروری تاکہ اس وسوسہ کا خاتمہ ہو جائے لہذا اس مقام پر چند شبہات کے جوابات پیش کئے جا رہے ہیں۔

ثبات کے جوابات

جبریوں کے معم ترین ثبات درج ذیل میں۔ ۱۔ انسان کا ارادہ باطنی میلانات کا نتیجہ ہے اور یہ میلانات نہ انسان کے اختیار میں ہیں اور نہ ہی ان کے ظہور میں کوئی خارجی عامل سبب بنا ہے، لہذا اس طرح اختیار اور انتخاب کا کوئی معنی باقی نہیں رہتا۔

۲۔ اس شبہ کا جواب یہ ہے کہ میلانات کا اٹھنا ارادہ کے بننے کا سبب ہے نہ یہ کہ کسی امر کو انجام دینے کے لئے کسی ارادہ کے وجود کا سبب ہے، جبر کا نتیجہ یہ ہے کہ جب خواہشات ظہور کریں تو مقاومت کی قوت سلب ہو جائے، حالانکہ بہت سے امور میں انسان شک کرتا ہے کہ اسے انجام دے یا نہ دے اور کسی بھی امر کو انجام دینے کے لئے غور و فکر کی ضرورت ہے جو کبھی سود و منفعت تو کبھی دشواری کا سبب ہے۔

۲۔ مختلف علوم میں یہ امر ثابت ہو چکا ہے کہ مختلف عوامل جیسے وراثت، (غذائیات اور دواؤں کے نتیجہ میں) غدد کے ترشحات، اجتماعی عوامل، انسان کے ارادہ کے موجود ہونے کا سبب بنتے ہیں، اور انسانوں کے اخلاق کا بدلنا انہیں عوامل کے اختلاف کا سبب ہے جیسا کہ دینی متون میں بھی اسی مطلب کی طرف تاکید کی جاتی ہے، لہذا انسانی افعال کو آزاد، ارادہ کا نتیجہ نہیں کہا جاسکتا۔ اس شبہ کا جواب یہ ہے کہ آذا ارادہ کو قبول کر لینے کا مطلب ان عوامل کی اثرگذاری کا منکر ہونا نہیں ہے، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان ان عوامل کے ہوتے ہوئے بھی مقاومت کر سکتا ہے اور مختلف خواہشات کے جمع کے دوران کسی ایک کا انتخاب کر سکتا ہے۔ البتہ یہ امر مسلم ہے کہ کبھی کبھی یہ عوامل انتخاب میں دشواری کا سبب بنتے ہیں لیکن اس کے باوجود مقاومت کرنا اور کسی ایک کا انتخاب کر لینا ہکمال میں تاثیر اور جزا کے مستحق ہونے کا سبب ہوتا ہے، جیسا کہ غیر معمولی ہجانات سزا کے کم ہونے اور جرم میں تخفیف کا باعث ہوتے ہیں۔

۳۔ خدا تمام موجودات منجملہ افعال انسان کے وقوع سے پہلے پوری طرح ان سے آگاہ ہے، اور علم الہی میں کسی قسم کی خطا کا کوئی امکان نہیں ہے، لہذا تمام حوادث، علم الہی کے مطابق واقع ہوتے ہیں، اور اس کے مخالف ہونے کا کوئی امکان نہیں ہے، لہذا اس مقام میں انسان کے ارادہ اور اختیار کا کوئی مطلب باقی نہیں رہتا۔ اس شبہ کا جواب یہ ہے کہ علم الہی ہر اس حادثہ سے متعلق ویسا ہی ہے جیسا کہ واقع ہونے والا ہے، اور انسان کے افعال اختیاری وصف اختیاریت کے ہمراہ خدا کے نزدیک معلوم ہیں پس اگر یہ افعال وصف جبریت کے ساتھ واقع ہوں تو علم الہی کے خلاف واقع ہوں گے۔

جیسے خدا کو معلوم ہے کہ فلاں شخص فلاں وقت میں ایک عمل کو انجام دینے کا ارادہ بنانے والا ہے اور اسے ضرور انجام دے گا، یہاں پر ہمارا مطلب یہ نہیں ہے کہ علم صرف وقوع فعل سے متعلق ہے بلکہ وہ ارادہ اور اختیار سے بھی مربوط ہے لہذا علم الہی انسان کے آزاد ارادہ اور اس کے اختیار سے کوئی منافات نہیں رکھتا۔ جبریوں کا ایک دوسرا شبہ قضا و قدر کے سلسلہ میں ہے ان کے اعتقاد کے مطابق انسان کے اختیار سے سازگار نہیں ہے اور ہم آئندہ دروس میں اس مطلب کے تحت گفتگو کریں گے۔

سوالات

- ۱۔ جبر کے رواج اور اس سے وابستہ ہونے کے اسباب کیا ہیں؟
- ۲۔ جبر سے وابستہ ہونے کے برے نتائج کیا ہو سکتے ہیں؟
- ۳۔ انسان کے ارادہ اور اختیار کی آزادی کی وضاحت کریں؟
- ۴۔ کیا باطنی میلانات اور ان کے وجود میں آنے کا سبب بننے والے عوامل انسان کے اختیار سے منافات رکھتے ہیں؟ کیوں؟
- ۵۔ وہ لوگ جو غیر معمولی ہجانات اور دشوار شرائط میں گرفتار ہو جاتے ہیں، انہیں اور دوسروں میں کیا فرق ہے؟

۶۔ کیا وراثت اور اجتماعی عوامل جبر کا سبب ہیں؟ کیوں؟

۷۔ کیا علم الہی انسان کے اختیار کی نفی کرتا ہے؟ کیوں؟

انیسواں درس

قضا و قدر کا مفہوم

کلمہ ”قدر“ کے معنی اندازہ اور کلمہ ”تقدیر“ کے معنی تولنا اور اندازہ لگانے کے ہیں اور کسی چیز کو ایک معین اندازے و پیمانے کے مطابق ساخت و ساز کے ہیں اور کلمہ ”قضا“ کے معنی انجام تک پہنچانے اور فیصلہ کرنے کے ہیں اور کبھی یہ دونوں کلمہ ایک ساتھ تقدیر کے معنی میں استعمال ہوتے ہیں۔ تقدیر الہی کا مطلب یہ ہے کہ خدا نے ہر شے کے لئے کم (مقدار) و کیف (حالت)، زمان و مکان کے اعتبار سے کچھ خاص حدود قرار دئے ہیں، جو تدریجی اسباب و عوامل کے ذریعہ پاتے ہیں اور قضا الہی کا مطلب یہ ہے کہ جب کسی شے کے مقدمات، اسباب و شرائط فراہم ہو جائیں تو وہ شے اپنے اختتام تک پہنچ جائے۔ اس تفسیر کے مطابق، مرحلہ تقدیر، مرحلہ قضا سے پہلے ہے، اور اس کے تدریجی مراتب میں، جو قریب، متوسط، بعد مقدمات کو شامل ہیں اور اسباب و شرائط کے بدلنے کے ساتھ یہ بھی بدل جاتے ہیں جیسے ایک جنین پہلے نطفہ پھر علقہ، پھر مضغہ یہاں تک کہ ایک کامل جنس کی صورت اختیار کر لیتا ہے جس میں زمانی و مکانی تشخصات بھی پیدا ہو جاتے ہیں، اب اس کا ایک مرحلہ میں ساقط ہو جانا، ۲۴۹، ۲۴۸ تقدیر میں تغیر سے تعمیر کیا جاتا ہے لیکن مرحلہ قضا ایک دفعی مسئلہ ہے جو اسباب و شرائط کے فراہم ہونے پر ہی منحصر ہے اس کے بعد اس کا پایا جانا حتمی، و ناقابل تبدل ہے (اِذَا قُضِيَ اَمْرًا فَانَّمَا يَقُولُ لَكَ كُنْ فَيَكُونُ)۔ جب وہ کسی امر کے بارے میں ٹھان لیتا ہے تو بس اس سے کہتا ہے کہ ہو جا، وہ ہو جاتا ہے لیکن جیسا کہ پہلے اشارہ کیا جا چکا ہے کہ کبھی قضا و قدر دونوں ایک ہی معنی میں استعمال ہوتے ہیں، اسی وجہ سے انھیں حتمی اور غیر حتمی حصوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے، یہی وجہ ہے کہ روایات اور دعاؤں میں قضا کو بدلنے والے اسباب میں سے ”صدقہ“، ماں باپ کے ساتھ نیکی، صلہ رحم، دعا وغیرہ کو بیان کیا گیا ہے۔

^۱ سورۃ آل عمران۔ آیت ۴۷، سورہ بقرہ۔ آیت ۱۱۷، سورۃ مریم۔ آیت ۳۵، سورۃ غافر۔ آیت ۶۸۔

قضا و قدر علمی و معنی

کبھی تقدیر اور قضا الہی، موجودات کی پیدائش کے لئے اسباب و شرائط اور مقدمات کے فراہم ہونے کے تحت، علم خدا کہ معنی میں آیا ہے اسی طرح ان امور کے حتمی وقوع ہو جانے کے سلسلہ میں یہ کلمات استعمال ہوتے ہیں جسے ”قضا و قدر علمی“ کا نام دیا جاتا ہے، اور کبھی موجودات کی پیدائش کے تدریجی مراحل اور ان کے عینی تحقق کو، خدا کی ذات سے نسبت دینے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے، جسے ”قضا و قدر عینی“ کا نام دیا جاتا ہے۔ آیات و روایات کی روشنی میں علم الہی ان تمام موجودات کو شامل ہوتا ہے کہ جو خارج میں موجود ہوتے ہیں اور وہ سب کے سب خدا کی ایک مخلوق ”لوح محفوظ“ میں درج ہیں، لہذا جو بھی خدا کی اجازت سے اس لوح محفوظ تک رسائی حاصل کر لے وہ گزشتہ اور آئندہ کے واقعات سے باخبر ہو جاتا ہے،

اس لوح محفوظ کے علاوہ دوسرے کم مرتبہ لوح محفوظ بھی ہیں جو واقعات کو ناقص اور حدود و شرائط کے ساتھ بیان کرتے ہیں لہذا جو بھی ان تک رسائی حاصل کر لے وہ واقعات کے سلسلہ میں اجمالی علم حاصل کر لیتا ہے، جو قابل تبدیل بھی ہیں، شاید یہ آیت انہیں دو قسموں کی طرف اشارہ کر رہی ہے (يُخَوِّلُ مَا يَشَاءُ وَيُثَبِّتُ وَعِنْدَهُ اُمُّ الْكِتَابِ) پھر اس میں سے خدا جس کو چاہتا ہے مٹا دیتا ہے اور جس کو چاہتا ہے باقی رکھتا ہے اس کے پاس اصل کتاب، لوح محفوظ موجود ہے۔

بہر حال قضا و قدر علمی کے اعتبار کے سلسلہ میں اس سے زیادہ مشکلات و دشواریاں نہیں ہیں جو ہم نے خدا کے علم ازلی ہونے کے بارے میں بیان کی ہیں، گزشتہ دروس میں علم الہی کے بارے میں جبریوں کے ثبات کے تحت گفتگو ہو چکی ہے اور ان کے ثبات کو کمزور اور ان کے بطلان کو واضح کیا جا چکا ہے لیکن قضا و قدر عینی پر اعتقاد کے سلسلہ میں جو مشکل ترین اعتراضات پیش کئے گئے ہیں ان کے جوابات دینا ضروری ہیں اگرچہ اس بابت تاثر استغلائی میں توحید کے مباحث کے درمیان ایک اجمالی جواب دیا جا چکا ہے۔

انسان کے اختیار سے قضا و قدر کا رابطہ

ہمیں یہ معلوم ہو گیا ہے کہ قضا و قدر عینی پر اعتقاد کا اقتضاء یہ ہے کہ موجودات کی پیدائش سے کمال تک بلکہ آخر عمر تک حتیٰ کہ الہی حکیمانہ تدبیر کے ذریعہ مقدمات بعیدہ کے فراہم ہونے پر ایمان لانا ہوگا اور پیدائش کے شرائط کے فراہم ہونے سے آخری مرحلہ تک ارادہ الہی سے وابستہ ہونے پر یقین کرنا ہوگا۔

لیکن موجودات کو اذن الہی اور اس کی مشیت سے نسبت دینا نہایت آسان ہے برخلاف اس کے آخری مرحلہ نیز قطعی ہونے کی نسبت قضا الہی کی طرف اس لئے کہ اس میں پیچیدگیاں بہت زیادہ ہیں، یہی وجہ ہے کہ یہ مسئلہ سب سے زیادہ متکلمین کی بحثوں کا مرکز بنا رہا ہے اس لئے کہ تقدیر کے بننے میں انسان کے مختار ہونے کے اعتقاد کو قبول کرنے کے ساتھ اس اعتقاد (قضا و قدر) کو ماننا اور اس پر ایمان لانا بہت مشکل ہے۔

اسی وجہ سے متکلمین کے ایک گروہ (اشاعرہ) نے چونکہ انسانی اعمال میں قضا الہی کے اثنا ب کا حامی تھا، لہذا جبر کا قائل ہو گیا، لیکن متکلمین کا دوسرا گروہ (معتزلہ) چونکہ جبر اور اس کے جبران ناپذیر نقصانات سے آگاہ تھا لہذا اسے قبول نہ کرتے ہوئے انسانی افعال میں قضا الہی کی ثنویت کا منکر ہو گیا، اور ان میں سے ہر ایک نے قرآنی آیات کی تفسیر اپنی رائے کے مطابق انجام دی اور مخالف آیتوں اور روایتوں کی تاویل کی جسے ہم نے مفصل جبر و تفویض کے سلسلہ میں لکھے گئے رسالہ میں پیش کیا ہے۔ لیکن اصل اعتراض یہ ہے کہ اگر واقعاً انسان کے افعال اختیاری ہیں اور وہ اپنے ارادہ میں مختار ہے تو اسے کس طرح ارادہ الہی اور اس کی قضا سے نسبت دی جا سکتی ہے؟ اور اگر اس کے افعال کی قضا الہی سے نسبت دی گئی ہے تو پھر کس طرح انسان سے نسبت دی جا

^۱ ارادہ اور قضا کا ایک دوسرے پر منطبق ہونا سورہ آل عمران کی آیت نمبر ۴۷ اور سورہ یس کی آیت نمبر ۸۳، کی تطبیق کے ذریعہ یہ مطلب روشن ہوجاتا ہے۔ ”إِنَّمَا أَمْرُهُ إِذَا أَرَادَ شَيْئًا أَنْ يَقُولَ لَهُ كُنْ فَيَكُونُ.“ یا ایک دوسری تعبیر کے مطابق جس طرح ہر موجود کا خدا کی مشیت اور اس کے ارادہ کی طرف نسبت دینا ضروری ہے اور اس کی اجازت کے بغیر کوئی وجود بھی موجود نہیں ہوسکتا، اسی طرح ہر شی کی پیدائش قضا و قدر الہی سے وابستہ ہے، اور اس کے بغیر کوئی بھی وجود اپنے حدود میں موجود نہیں رہ سکتا، لہذا اس نسبت کو بیان کرنا دراصل توحید کی تدریجی تعلیم یعنی تاثیر میں استقلال کے معنی میں ہے جو توحید کے عظیم مراتب میں سے ہے، اور جیسا کہ پہلے اشارہ کیا جاچکا ہے کہ انسانوں کی تربیت میں توحید کی یہ قسم عظیم اثرات کی حامل ہے۔

سکتی ہے؛ لہذا اس اشکال کو رفع کرنے کے لئے اور ان دونوں نسبتوں کو جمع کرنے کے لئے ایک علت کی طرف چند معلول کو نسبت دینے کے بارے میں ایک مختصر وضاحت پیش کریں گے تاکہ ان دونوں نسبتوں کی نوعیت معلوم ہو سکے۔

متعدد علتوں کے اثر انداز کی قسمیں

ایک موجود کی پیدائش میں چند علتوں کے اثر انداز ہونے کی چند صورتیں ہیں۔ ۱۔ چند علتیں ایک ساتھ اثر انداز ہوں جیسے کھج، پانی، ہوا، آفتاب جیسے اسباب مل کر سبزہ کے اگنے کا سبب بنتے ہیں۔

۲۔ چند علتیں نیابتاً ایک دوسرے کے بعد عمل کریں جیسے کہ ہوائی جہاز کے متعدد انجن یکے بعد دیگرے روشن ہوتے ہیں جس کی وجہ سے ہوائی جہاز برابر پرواز کرتا ہے

۳۔ چند علتوں کا آپس میں ایک دوسرے پر اثر انداز ہونا جیسے کہ متعدد گیند کا ایک دوسرے سے ٹکرانا، یا متعدد کاروں کا ایک ساتھ اکسڈنٹ، یا ارادہ کا موثر ہونا ہاتھ کی حرکت پر اور ہاتھ کی حرکت کا اثر انداز ہونا قلم کی حرکت پر اور قلم کی حرکت کا نتیجہ ایک نوشتہ کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے، اسی طرح تمام موجودات ایک دوسرے کی تاثیر کا نتیجہ ہیں۔

۴۔ متعدد عوامل کا ایک دوسرے پر اثر، جبکہ ہر ایک دوسرے سے مستقل ہو، یہ فرض گذشتہ فرض سے بالکل جدا ہے اس لئے کہ وہاں ہاتھ کی حرکت، ارادہ پر منحصر تھی اور قلم کی حرکت، ہاتھ کی حرکت پر منحصر تھی۔

ان تمام صورتوں میں چند علتوں کے ذریعہ ایک معلول کا وجود میں آنا لازمی ہے، لہذا فعل اختیاری میں ارادۃ الہی اور انسان کے ارادے کی تاثیر اسی قسم میں سے ہے، اس لئے کہ انسان اور اس کا ارادہ، ارادۃ الہی سے وابستہ ہے۔ لیکن وہ صورت کہ جس میں معلول واحد پر دو علتوں کا اجتماع غیر ممکن ہے، وہ دو ”ہستی بخش“ (وجود آفرین) علتوں کا اجتماع ہے یا ایسے دو علتوں کا اجتماع ہے کہ جو مانعہ الجمع، مستقل، اور ایک دوسرے کے بدلے اثر انداز ہوتے ہیں، جیسے کہ ایک ارادہ دو مزید فاعلوں سے وجود میں آئے

یا دو مشابہ موجود دو تامہ علتوں کا نتیجہ ہوں۔ شبہ کا جواب: گذشتہ توضیحات کی روشنی میں انسان کے افعال اختیاری کو خدا سے نسبت دینے کے علاوہ خود انسان سے نسبت دینے میں کوئی اشکال نہیں ہے، اس لئے کہ یہ نسبتیں آپس میں مزاحم نہیں ہیں، بلکہ ایک دوسرے کے طول میں ہیں۔ ایک دوسری تعمیر کے مطابق ایک فعل کو اس کے فاعل کی طرف نسبت دینا یہ ایک مرحلہ ہے اور خود اس کے وجود کو خدا کی طرف نسبت دینا اس شے بالاتر مرحلہ ہے کہ جس مرحلہ میں خود انسان کا وجود اور وہ مادہ کہ جس پر وہ فعل انجام پاتا ہے اور وہ آلات جس کی مدد سے فعل واقع ہوا ہے سب کے سب اسی سے وابستہ ہیں۔

پس انسان کے ارادہ کی تاثیر علت تامہ کے ایک جز کے عنوان سے اپنے امور میں اس امر سے کوئی منافات نہیں رکھتا، کہ علت تامہ کے تمام اجزا کو خدا سے نسبت دیدی جائے، اور وہ صرف خدا ہے جو جہان انسان اور اس کے تمام افعال و کردار کو اپنے دست قدرت میں سنبھالے ہوئے ہے، ہمیشہ انھیں وجود عطا کرتا ہے اور ان میں ہر ایک کو ایک معین شکل میں خلق کرتا ہے۔

لہذا کوئی موجود بھی کسی بھی حال میں اس سے بے نیاز نہیں ہے، اور انسان کے اختیاری افعال بھی اس سے بے نیاز اور اس کی قدرت سے باہر نہیں ہیں، اور اس کی تمام خصوصیات اور صفات الہی قضا و قدر سے وابستہ ہیں، لہذا ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا کہ یا تو وہ، انسان کے ارادہ سے وابستہ ہوں یا خدا کے ارادہ کے تحت ہوں اس لئے کہ یہ دونوں ارادے، مستقل اور مانعہ الجمع نہیں ہیں، اور اعمال کو تحقق بخشنے میں ایک دوسرے کے بدلے اثر انداز نہیں ہوتے، بلکہ انسان کا ارادہ اس کے وجود کی طرح ارادہ الہی سے وابستہ ہے، اور اسے تحقق بخشنے کے لئے خدا کے ارادہ کی ضرورت ہے۔ (مَا تَقْضَىٰ وَنَ إِلَّا أَنْ يُقْضَىٰ اللَّهُ رَبُّ الْعَالَمِينَ^۱) اور تم کچھ چاہتے ہی نہیں مگر وہی جو سارے جہان کا پالنے والا خدا چاہتا ہے۔

^۱ سورہ تکویر۔ آیت / ۲۹۔

قضا و قدر پر اعتقاد کے آثار

قضا و قدر پر اعتقاد، معرفت خدا کے حصول اور عقلی اعتبار سے انسان کے تکامل (بتدریج کامل ہونے) کے علاوہ بے شمار علمی فوائد کا حامل ہے جن میں سے بعض کی طرف اشارہ کیا جا چکا ہے اور بعض کو ہم یہاں ذکر کریں گے۔ وہ اشخاص جو حوادث کی پیدائش میں ارادہ الہی کی اثر اندازی اور قضا و قدر الہی پر ایمان رکھتے ہیں وہ ناگوار حادثوں سے نہیں ڈرتے، اور نالہ و زاری نہیں کرتے، بلکہ چونکہ انھیں معلوم ہے کہ یہ حوادث بھی اس کے حکیمانہ ارادہ کا ایک جز ہے اور اس کے وقوع ہونے میں کوئی نہ کوئی حکمت کار فرما ہے لہذا رضا کارانہ اور والہانہ طور پر اس کا استقبال کرتے ہیں، اور اس طرح صبر و رضا، تسلیم و توکل جیسے صفات کے منظور بن جاتے ہیں اور دنیا کی خوشیوں و رعنائیوں پر مغرور و سرمست نہیں ہوتے اور خدائی نعمتوں کو اپنے لئے فخر کا وسیلہ نہیں سمجھتے۔ یہ تو وہی آثار ہیں کہ جس کی طرف اس آیت میں اشارہ ہوا ہے۔

(مَا أَصَابَ مِنْ مُصِيبَةٍ فِی الْأَرْضِ وَلَا فِی السَّمَاءِ إِلَّا فِی كِتَابٍ مِّن قَبْلِ أَن نَّبْرَأَهَا إِنَّ ذَٰلِكَ عَلَى اللَّهِ يَسِيرٌ * لَّيْلًا نَّأْتُوا عَلَىٰ مَا تَكْفُرُونَ ۚ أَمْ كُنتُمْ تَرْجُوا أَنَّكُمْ وَآلُكُمْ لَا تُحِيطُ بِكُلِّ شَيْءٍ مُّخْفٍ ۖ فَتُخَوَّرُ ۚ)۔ یعنی مصیبتیں روئے زمین پر اور خود تم لوگوں پر نازل ہوئی ہیں قبل اس کے کہ ہم انھیں ظاہر کریں (لوح محفوظ) میں مکتوب میں بیشک یہ خدا پر آسان ہے تاکہ جب تم سے کوئی چیز چھین لی جائے اس کا رنج نہ کرو اور جب کوئی چیز (نعمت) خدا تم کو دے تو اس پر نہ اترا یا کرو اور خدا کسی اترانے والے شیخی باز کو دوست نہیں رکھتا۔

لیکن اس بات کی طرف اشارہ کرنا لازم ہے کہ تاثیر استغالی میں توحید قضا و قدر سے غلط مطلب نکالنا انتہائی سستی، کاہلی اور ذمہ داریوں سے از نو منہ موڑنا ہے۔ اور ہمیشہ یاد رہنا چاہیے کہ جاودانی سعادت و ثقاوت ہمارے اختیاری افعال میں ہے۔ (لھما ما کسبت وعلیہما ما اکتسبت)۔ اس نے اچھا کام کیا تو اپنے نفع کے لئے اور برا کام کیا تو (اس کا وبال) کا خمیازہ بھی وہی بگھستے گا،

^۱ سورہ حدید۔ آیت/ ۲۲، ۲۳

^۲ سورہ بقرہ۔ آخری آیت۔

(وَ اَنْ لِّسَ لِلْاِنْسَانِ الْاَلَمَ سَعًی) اور انسان کے لئے نہیں ہے مگر یہ کہ جتنی وہ کوشش کرے۔

سوالات

- ۱۔ قضا و قدر کے لغوی معنی بیان کریں؟
- ۲۔ تقدیر الہی اور اس کی قضا کا مطلب کیا ہے؟
- ۳۔ کس اعتبار سے قضا و قدر کو حتمی اور غیر حتمی امور میں تقسیم کیا جاسکتا ہے؟
- ۴۔ بداء کیا ہے؟
- ۵۔ علمی اور عینی قضا و قدر کو بیان کریں؟
- ۶۔ لوح محفوظ اور لوح محو اثبات اور ان دونوں کا حتمی اور غیر حتمی تقدیر سے ارتباط کو بیان کریں؟
- ۷۔ قضا و قدر اور انسان کے مختار ہونے کے درمیان جمع کی مشکلات کے علاوہ اس موضوع کے تحت متکلمین کے اختلافات کی شرح دیں؟
- ۸۔ معلول واحد میں متعدد علتوں کے اثر انداز ہونے کی قسموں کو بیان کریں اور ان میں سے کون سی قسم محال ہے؟
- ۹۔ قضا و قدر کے مسئلہ میں جبر کے متعلق شبہات کو بیان کریں؟
- ۱۰۔ قضا و قدر الہی پر اعتماد رکھنے کے اثرات بیان کریں؟

بیواں درس

عدل الہی

مقدمہ

ہم نے گذشتہ دروس میں متکلمین کے دو گروہوں (اشعری اور معتزلی) کے نظریات کلامی، ارادہ الہی، توحید، جبر و اختیار، قضا و قدر کے سلسلہ میں گفتگو کی کہ جن میں یا تو افراط ہے تفریط۔ انھیں دو گروہوں کے درمیان بنیادی اختلاف میں سے ایک عدل الہی کا مسئلہ ہے، اس نظریہ میں شیعہ متکلمین، معتزلہ کے موافق ہیں جنھیں اشاعرہ کے مقابل میں عدلیہ کہا جاتا ہے، اور یہ مسئلہ اپنی اہمیت کی وجہ سے علم کلام کے بنیادی و اساسی مسائل میں شمار کیا جاتا ہے، یہاں تک کہ اس مسئلہ کو اصول عقائد کا ایک حصہ اور شیعہ و معتزلہ متکلمین کی پہچان کے عنوان سے جانا گیا ہے۔

لیکن اس بات کی طرف توجہ رہے کہ اشاعرہ عدل الہی کے منکر نہیں ہیں، اور ایسا ہرگز نہیں ہے کہ وہ (العیاذ باللہ) خدا کو ظالم سمجھتے ہوں، اس لئے کہ قرآن کی آیات واضح انداز میں عدل الہی کے اثبات اور اس سے ہر طرح کے ظلم کی نفی کرتی ہیں، لیکن اصل اختلاف یہ ہے کہ کیا عقل، شرعی بیانات (کتاب و سنت) سے ہٹ کر خدا کے افعال کے لئے قوانین کا ادراک کر سکتی ہے، اور اس طرح کسی عمل کے انجام دینے یا اسے ترک کرنے کا حکم دے سکتی ہے، مثلاً کیا ”خدا کے لئے لازم ہے کہ مومنوں کو بہشت اور کافروں کو دوزخ میں لے جائے“، کیا عقل حکم دے سکتی ہے، یا پھر ایسے قضایا کا حل صرف وحی کے ذریعہ ممکن ہے اور عقل کو ایسے مسائل میں دخل اندازی کا کوئی امکان نہیں ہے؟ لہذا اختلاف کا محوری نقطہ (حسن و قبح عقلی) کا مسئلہ ہے جس سے اشاعرہ نے انکار کیا ہے اور وہ قائل ہیں کہ تکوینی امور میں جو خدا کا فرمان ہے وہی بہتر ہے، اور (تشریحی امور) میں صرف اسی کا حکم اچھا اور بہتر ہے، اور ایسا ہرگز نہیں ہے چونکہ وہ نیک کام ہے لہذا اسے انجام دینے کا حکم دیا جائے یا برا کام ہے لہذا اس سے

روکا جائے۔ لیکن عدلیہ حضرات کا یہ نظریہ ہے کہ تکوینی اور تشریعی مسائل سے صرف نظر کرتے ہوئے افعال خدا کو (حسن و قبح) سے متصل کیا جاسکتا ہے، اور عقل بھی ایک حد تک افعال کے برے یا اچھے ہونے کے اسباب کا پتا لگا سکتی ہے اور وجود مقدس الہی کو افعال قبیحہ سے منزہ کر سکتی ہے لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ عقل خدا کو (العیاذ باللہ) نیک امور کا حکم دے یا برے امور سے منع کرے بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ عقل ذات خداوندی سے افعال قبیحہ کے صدور کو محال جانتی ہے نیز ذات الہی اور افعال حسنہ یا قبیحہ کے درمیان نسبتوں کا اندازہ لگا سکتی ہے۔

یہ بات اٹھارہ ہے کہ ان مباحث کی تفصیلی تحقیق اور اس ضمن میں ثبوتات کا جواب جس میں اشاعرہ کی طرف سے (حسن و قبح) عقلی کا انکار کیا گیا ہے اور انہیں جماعت عدلیہ کے مقابلہ میں لا کر کھڑا کر دیا ہے اس کتاب کی وسعت سے باہر ہے، اور یہ بھی ممکن ہے کہ اس مسئلہ کے تحت معترضہ کے بعض ضعیف نظریات ہوں کہ جن کی ہم مناسب موقع پر وضاحت کریں گے، لیکن یہ حسن و قبح عقلی کا مسئلہ شیعوں کے نزدیک قابل قبول اور کتاب و سنت کی طرف سے تائید کے علاوہ، معصومین علیہم السلام نے اس کے اثبات میں بڑی تاکید کی ہے۔ اسی وجہ سے ہم یہاں پر مفہوم عدل کے تحت تھوڑی وضاحت کریں گے، اور چونکہ یہ خدا کی صفات فعلیہ ہے لہذا اس پر دلیلا قائم کرتے ہوئے اس ضمن میں موجودہ ثبوتات کے سلسلہ میں بحث کریں گے۔

مفہوم عدل

عدل کے لغوی معنی برابری اور مساوی کرنے کے ہیں، اور عرف عام میں لوگوں کے حقوق کی رعایت کرنے کے معنی میں ہے جسے دوسروں کے حقوق پر تجاوز کرنے کے مقابلہ میں استعمال کیا جاتا ہے پس عدل کی اس طرح تعریف کی جاسکتی ہے اعطاء کُلِّ ذی حق حَقِّہٖ، صاحب حق کے حق کو عطا کرنا لہذا اس تعریف کے تحت ایک ایسے موجود کو فرض کرنا ہوگا جو صاحب حق ہو، تاکہ اس کی رعایت کو عدل اور اس پر تجاوز کو ظلم کا نام دیا جاسکے لیکن کبھی مفہوم عدل کو وسعت دیتے ہوئے اس طرح تعریف کی جاتی ہے کہ (کسی بھی شے کو اس کے مقام پر رکھنا اور کسی بھی فعل کو شائستہ صورت میں انجام دینا) اور پھر اس طرح عدل کی

تعریف (وضع کل شیء فی موضعه)۔ (کسی بھی شے کو اس کے مقام پر رکھنا) کی جا سکتی ہے، عدل کی یہ تعریف حکمت کے مساوی اور ایک عادلانہ حکیمانہ عمل کا مساوی کھلائے گی لیکن کسی طرح (صاحب حق کا حق) کسی بھی شے کا اپنا مقام معین ہو، اس سلسلہ میں کافی بحث ہے جس نے فلسفہ اور کلام کے ایک عظیم مباحث کو اپنے سے مخصوص کر لیا ہے جنہیں ہم یہاں پر کسی بھی صورت میں بیان نہیں کر سکتے۔ لیکن جس مسئلہ کی طرف توجہ لازم ہے وہ یہ ہے کہ دنیا کے تمام عقلا اس بات کو سمجھتے ہیں کہ یتیم کے دہن سے لقمہ کو چھیننا یا ناحق کسی کا خون بہانا، ایک قبیح عمل ہے، یا یتیم کے دہن سے چھینا گیا لقمہ اس کے منہ میں لوٹا دینا یا ناحق خون بہانے والے کو سزا دینا ایک عادلانہ اور شائستہ عمل ہے، اور یہ امر خدا کے امر و نہی پر منحصر نہیں ہے یہاں تک کہ ایک ملحد بھی اپنے مقام پر یہی قضاوت کرتا ہے لیکن اس فیصلہ کا راز کیا ہے؟ اور کون سی طاقت حسن و قبح کے تعین کی صلاحیت رکھتی ہے اسی طرح کے اور دوسرے مسائل کے بارے میں فلسفہ کی کتابوں میں بحث کی جاتی رہی ہے۔

نتیجہ

عدل کے لئے دو مفہوم خاص اور عام فرض کئے جا سکتے ہیں، ایک یہ کہ دوسروں کے حقوق کی رعایت کرنا، اور دوسرے یہ کہ حکیمانہ عمل انجام دینا، بلکہ جس میں لوگوں کے حقوق کی رعایت کرنا شامل ہے لہذا عدل کا لازمہ تمام انسانوں یا اشیاء کو برابر اور مساوی تقسیم کرنا نہیں ہے جیسے کہ عادل استاد یہ نہیں ہے جو محنتی اور کامل شاگردوں کو برابر سے تشوئق یا انہیں مساوی حیثیت سے سزا دے، یا عادل قاضی یہ نہیں ہے جو مدعی اور مدعا علیہ کے درمیان مورد نزاع مال کو مساوی تقسیم کر دے، بلکہ عادل استاد یہ ہے جو ہر شاگرد کو اس کی شانگنی کے مطابق تشوئق یا اس کی کاہلی کے اعتبار سے اسے سزا دے، اور عادل قاضی یہ ہے جو مال کو اس کے مالک کے حوالہ کر دے۔ اسی طرح حکمت الہی کا تقاضا یہ نہیں ہے کہ تمام مخلوقات کو ایک جیسا خلق کرے، جیسے کہ پرندوں کی طرح انسان کو بھی بال و پر عطا کرے۔ بلکہ حکمت الہی کا تقاضا یہ ہے کہ جہاں کو اسی صورت میں خلق کرے کہ جس سے زیادہ سے زیادہ خیر و کمال مل سکے، اور مختلف موجودات کو انتہائی ہدف کے مطابق خلق کرے اسی طرح حکمت الہی کا تقاضا یہ ہے کہ ہر انسان کو

اس کی استعداد کے مطابق عمل انجام دینے کا حکم دے اور پھر اس کی استعداد اور توانائی کے مطابق قضاوت کرے^۲ اور اس کے عمل کے عوض میں سزا، یا جزا عطا کرے^۳۔

دلیل عدل الہی

جیسا کہ اشارہ ہو چکا ہے کہ عدل ایک تعریف کے مطابق حکمت الہی کا حصہ اور دوسری تعریف کے مطابق عین حکمت الہی ہے، لہذا اس کے اثبات میں دلیل بھی ایسی ہونی چاہیے جو حکمت الہی کو ثابت کر سکے، جس کے بارے میں گیارہویں درس میں اشارہ کیا جا چکا ہے، یہاں پر مزید اس کی وضاحت کی جا رہی ہے ہمیں یہ معلوم ہو چکا ہے کہ خدا بے نہایت قدرت و اختیار کا مالک ہے اور تمام ممکن الوجود امور اسی کی قدرت میں ہیں، اور کسی بھی خارجی طاقت کے سامنے تسلیم اور مغلوب ہوئے بغیر امور کی انجام دہی یا انھیں ترک کرنے پر قادر ہے، لیکن ہر وہ فعل جسے انجام دے سکتا ہے انجام نہیں دیتا بلکہ جس کے لئے ارادہ بناتا ہے اسے انجام دیتا ہے۔ اور یہ بھی معلوم ہوا کہ اس کا ارادہ بے حساب و کتاب نہیں ہے، بلکہ صرف وہ اپنے صفات کمالیہ کے مطابق ارادہ بناتا ہے، اور اگر اس کے صفات کمالیہ کسی فعل کا تقاضا نہ رکھتے ہوں تو وہ کبھی بھی اسے انجام نہیں دیتا، چونکہ ذات خداوند کمال محض ہے، لہذا اس کا ارادہ بھی مخلوقات کے کمال اور ان کے خیر سے متعلق ہوتا ہے، اور اگر کسی مخلوق کے وجود کا لازمہ، جہان میں نقائص کی پیدائش کا سبب ہو تو اس کے نقائص مقصود بالتبع ہوں گے۔

یعنی اس لئے کہ وہ خیر فراواں ناقابل انفکاک (شر) کا لازمہ ہے، لہذا اس خیر غالب سے ارادہ الہی متعلق ہوگا۔ پس الہی صفات کمالیہ کا اقتضایہ ہے کہ جہان اس طرح خلق ہو کہ جو مجموعاً زیادہ سے زیادہ خیر و کمال کا سرچشمہ بن سکے لہذا ہمیں سے خدا کے لئے صفات کمالیہ ثابت ہو جاتے ہیں اسی بنیاد پر ارادہ الہی اسی انسان کی خلقت سے متعلق ہوتا ہے کہ جس میں امکان وجود ہو اور ”خیر

^۱ ”لَا يُكَلِّفُ اللَّهُ نَفْسًا إِلَّا وُسْعَهَا“۔ سورہ بقرہ۔ آیت ۲۸۶

^۲ ”وَقَضَىٰ رَبُّهُمْ أَلْتُمْ بِالْقِسْطِ وَأَبْمَ لَا يُظْلَمُونَ“۔ سورہ یونس۔ آیت ۵۴

^۳ ”قَالِیَوْمَ لَا تُظْلَمُ نَفْسٌ شَيْئًا وَلَا تُجْزَوْنَ إِلَّا مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ“۔ سورہ یس۔ آیت ۵۴

و برکت کا نفا ہو، اور انسان کے امتیازات میں سے اس کا مختار ہونا اور ارادہ کے اعتبار سے آزاد ہونا ہے، بے شک اختیار و انتخاب کی طاقت سے متصف ہونا کمالات و جودمی میں سے شمار کیا جاتا ہے، لیکن انسان کے مختار ہونے کا لازمہ یہ ہے کہ وہ نیک امور انجام دے، اور اپنے اتھانی کمال کی جانب قدم بڑھاتا رہے، اور اس میں اتنی طاقت ہو کہ وہ ناپسند اور بڑے امور سے اپنے آپ کو بچالے تاکہ ثقاوت جاودانی اور خسران عظیم سے محفوظ رہ سکے، البتہ وہ امر جو تہا ارادہ الہی سے متعلق ہوتا ہے وہ صرف کمال ہے لیکن چونکہ انسان کے کمال اختیاری کے لازمہ کے ساتھ امکان سقوط بھی ہے، جو نفسانی خواہشوں کی پیروی سے حاصل ہوتا ہے، لہذا ایسا سقوط اختیاری بھی بالذات ارادہ الہی سے متعلق ہوگا۔

اور چونکہ صحیح انتخاب خیر و شر کی راہوں کی صحیح شناخت کا محتاج ہے، لہذا خدا نے انسان کو انہیں امور کے انجام دینے کا حکم دیا ہے جن میں زیادہ سے زیادہ خیر و مصلحت ہو اسی طرح تباہی و بربادی کے عوامل سے بچنے کا حکم بھی دیا ہے، تاکہ اس طرح اس کے کمال کا وسیلہ فراہم ہو جائے اور چونکہ تکالیف اور احکام اس لئے وضع ہوئے ہیں تاکہ انسان ان پر عمل کرتے ہوئے مفید نتائج تک پہنچ سکے کہ جس میں خدا کے لئے نہ کوئی نفع ہے اور نہ ہی نقصان، اس وجہ سے حکم الہی کا تقاضا یہ ہے کہ یہ احکام مکلفین کی طاقت کے مطابق ہوں اس لئے کہ وہ احکام جن پر عمل نہیں کیا جاسکتا وہ بے فائدہ اور لغو ہیں۔ پس اس طرح عدل کا پہلا مرحلہ (اپنے خاص معنی میں) یعنی مقام تکلیف میں عدالت اس دلیل سے ثابت ہے کہ اگر خدا بندوں کی طاقت سے ماوراء ان پر کوئی حکم نافذ کرے تو وہ چونکہ امکان عمل سے باہر ہے لہذا ایک بے فائدہ عمل کہلائے گا۔ لیکن بندوں کے درمیان فیصلہ میں عدالت کا مسئلہ اس نکتہ کی طرف توجہ دینے کے ذریعہ ثابت ہو جاتا ہے کہ خدا کا ایسا کرنا صرف اس وجہ سے ہے تاکہ سزا و جزا کے اعتبار سے انسان محض ہو سکے، لہذا اگر ایسی صورت میں خدا نے عدل و انصاف سے کام نہیں لیا تو نقص غرض لازم آئیگی۔

آخر کار سزا اور جزا دینے کا مقصد مقام عدالت ہدف خلقت کے پیش نظر ثابت ہو جاتا ہے اس لئے کہ جس نے انسان کو اچھے اور برے امور کے نتائج تک رسائی کے لئے خلق کیا ہے اگر انہیں اس ہدف کے خلاف سزا یا جزا دینا چاہے تو وہ کبھی بھی اپنے

ہدف تک نہیں پہنچ سکتا۔ لہذا تمام مظاہر کے درمیان عدل الہی کا صحیح مطلب یہ ہے کہ اس کے صفات ذاتیہ حکیمانہ اور عادلانہ اعمال کا سبب میں اور ایسی کوئی صفت بھی اس کی ذات میں نہیں پائی جاتی جس میں ظلم و ستم یا عبث ہونے کا شائبہ پایا جاتا ہو۔

چند شبہات کا حل

۱۔ مخلوقات کے درمیان خصوصاً انسانوں میں موجود اختلافات عدل الہی سے کس طرح سازگار ہیں؟ اور کیوں خدا نے اپنی تمام مخلوقات کو یکساں خلق نہیں کیا؟

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ مخلوقات کے درمیان خلقت کے اعتبار سے موجودہ اختلافات نظام خلقت اور اس پر حاکم قانون علت و معلول کا لازمہ ہیں تمام مخلوقات کا اپنی خلقت میں یکساں ہونا ایک خام خیالی ہے اگر اس سلسلہ میں ہم تھوڑا بھی غور کر لیں تو ہمیں معلوم ہو جائے گا کہ یہ فرض ترک خلقت کے مساوی ہے اس لئے کہ اگر تمام مخلوقات مرد یا عورت ہوتے تو نسل آگے بڑھ نہیں سکتی تھی اور انسانی نسل کا خاتمہ ہو جاتا، اسی طرح اگر تمام مخلوقات انسان ہوتی تو انہیں اپنی احتیاجات کو برطرف کرنے کے لئے کوئی چیز باقی رہ نہ جاتی اس کے علاوہ اگر تمام حیوانات یا نباتات ایک ہی جیسے اور ایک ہی رنگ سے سرقراز ہوتے تو ایسے دلکش مناظر کے علاوہ مختلف فوائد کا وجود نہ ہوتا، موجودات کا مختلف اشکال میں پیدا ہونا مادہ کے تغیرات کا نتیجہ ہے، اور خلقت سے پہلے کسی کا کوئی بھی حق خدا کے ذمہ نہیں ہے کہ وہ اسے کیسے اور کس شکل میں خلق کرے، کہاں قرار دے کس مقام میں اتارے، تاکہ اس طرح عدل قائم رہے اور ظلم کا خاتمہ ہو جائے۔

۲۔ اگر حکمت الہی کا تقاضا یہ ہے کہ اسے اس جہان میں خلق کرے، تو پھر اسے موت کیوں دیتا ہے اور کیوں اس کی زندگی کا خاتمہ کر دیتا ہے؟ اس شبہ کا جواب یہ ہے کہ پہلے تو یہ: اس جہان میں موجودات کی زندگی اور موت قوانین تکوینی اور علت و معلول و روابط کی وجہ سے ہے، اور یہی نظام خلقت کا لازمہ بھی ہے دوسرے یہ کہ: اگر زندہ موجودات نہیں مرتے اور باقی رہ جاتے تو آئندہ

مخلوقات کے لئے خلقت کا کوئی مقام نہیں رہ جاتا اور وہ وجود و حیات کی نعمتوں سے محروم ہو جاتے۔ تیسرے یہ کہ: اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ تمام انسان خلقت کے بعد ہمیشہ زندہ رہیں تو چند ہی سال کے اندر یہ زمین انسانوں کے لئے تنگ ہو جاتی اور لوگ رنج و الم اور تنگی کی وجہ سے موت کی تمنا کرنے لگتے۔ چوتھے یہ کہ: انسان کی خلقت کا اصل ہدف کمال تک پہنچنا ہے اور جب تک انسان موت کے ذریعہ اس جہان سے جہانِ ابدی میں منتقل نہیں ہوتا اس وقت تک اپنے انتہائی ہدف تک نہیں پہنچ سکتا۔

۳۔ یہ اس زمین پر بے شمار طبعی بلاؤں اور رنج و الم (جیسے زلزلہ سیلاب وغیرہ) اور اجتماعی مشکلات جیسے جنگ، جدال (کیونکر عدل الہی سے سازگار ہیں؟ سب سے پہلے، اس سوال کا جواب یہ ہے کہ ایسے ناگوار حوادث کا وجود مادی تغیرات کا نتیجہ ہے اور جبکہ اس کی حکمت ان کے عیوب پر غالب ہے لہذا یہ کسی بھی حال میں مخالف حکمت نہیں ہو سکتے اس کے علاوہ اجتماعی مشکلات کا اٹھنا انسان کے مختار ہونے کا لازمہ ہے جو حکمت الہی کا تقاضا ہے اور زندگی کے مصلح اس کے مفاسد سے کہیں زیادہ ہیں اس لئے کہ اگر صرف مفاسد ہی مفاسد ہوتے تو اس زمین پر کوئی انسان باقی نہ رہتا۔

دوسرے یہ کہ، ایک طرف بے شمار رنج و زحمت کا ہونا اسرارِ طبیعت کو کشف کرنے کے لئے انسانوں کی حرکت کا سبب اور مختلف علوم و فنون کے ایجاد کا انگیزہ ہے اور دوسری سختیوں سے نبرد آزمانا، نیز اس سے مقابلہ کرنا انسانی صلاحیتوں کو پر ثمر بنانے کے لئے اور راہِ بحال کو طے کرنے کے لئے ایک زبردست عامل ہے اس کے علاوہ اس جہان میں اگر سختیوں کو تحمل کرنا نیتِ خیر کے ساتھ ہو تو جہانِ ابدی میں عظیم نعمات سے سرفرازی کا سبب ہے۔

۴۔ اس زمین پر ہونے والے محدود گناہوں کی سزا عذابِ ابدی کی شکل میں کیونکر عدالت سے سازگار ہے؟

اس شبہ کا جواب یہ ہے کہ نیک اور بد اعمال کے درمیان، اور اخروی سزا و جزا کے درمیان ایک قسم کا رابطہ علیت پایا جاتا ہے جسے وحی الہی کے ذریعہ لوگوں کو سنا دیا گیا ہے اور جس طرح اس جہان میں بعض حوادث و اشرار، طولانی آثار کا سبب بنتے ہیں جیسے

کہ انسان کا اپنی یا دوسروں کی آنکھوں کو پھوڑ دینا ایک لحظہ کا عمل ہے لیکن اس کے آثار یعنی ناپیدائی آخر عمر تک باقی رہتی ہے اس طرح بڑے بڑے گناہ آخرت میں ابدی آثار سے متصف ہیں، لہذا اگر کوئی اس جہان میں انہیں ان کی تلافی نہ کرے (جیسے کہ توبہ نہ کرے) تو اس کے برے آثار ابد تک، اس کے دامن پر رہیں گے، جس طرح انسانوں کا آخری عمر تک اندھا رہنا تنہا اور تنہا ایک لحظہ کی شرارات کا نتیجہ ہے، اور عدل الہی سے کوئی منافات نہیں رکھتا، اسی طرح گناہوں کے نتیجہ میں عذاب ابدی میں گرفتار ہونا، عدل الہی سے منافات نہیں رکھتا، اس لئے کہ جو کچھ بھی دیکھ رہا ہے، وہ ان گناہوں کا نتیجہ ہے، جسے اس نے جانتے ہوئے انجام دیا ہے۔

سوالات

- ۱۔ عدل الہی کے مسئلہ میں موجودہ اختلاف کا ریشہ کیا ہے؟
- ۲۔ مفہوم عدل کی وضاحت کریں؟
- ۳۔ کیا عدل کا لازمہ تمام موجودات کا ایک ہونا ہے؟ کیوں؟
- ۴۔ حکمت اور عدل الہی کے لوازمات کیا ہیں؟
- ۵۔ عدل الہی کی دلیل کیا ہے؟
- ۶۔ انسان کے خلق کرنے کا ہدف کیا ہے؟
- ۷۔ مخلوقات کے درمیان تکوینی اختلافات کس طرح عدل اور حکمت الہی سے سازگار ہیں؟
- ۸۔ کیوں خدائے حکیم اپنی مخلوقات کو موت دیتا ہے؟

۹۔ طبعی اور اجتماعی بلائیں کس طرح حکمت الہی سے سازگار ہیں؟

۱۰۔ کیوں ایک محدود گناہ، ابدی عذاب میں گرفتاری کا سبب ہوتے ہیں؟

ایکواں درس

مسائل نبوت پر بحث کرنے کے نتائج

مقدمہ

ہمیں یہ مطلب معلوم ہو چکا ہے کہ وہ مسائل جنہیں حل کرنا اور جاننا ہر عاقل شخص پر واجب ہے تاکہ وہ ایک انسانی زندگی بہ حُسنِ خوبی گزار سکے، درج ذیل ہیں۔ ۱۔ انسان اور جہان کا وجود کس سے ہے یا ان دونوں کی تدبیر اور ارادہ کس کے ہاتھ میں ہے؟

۲۔ انسان کی زندگی کا اتھائی مرحلہ اور اتھائی ہدف کہاں ہے؟

۳۔ انسانوں کی وہ احتیاجات جس کے لئے بھی صحیح زندگی گزارنے کے طور طریقہ کا جاننا ضروری ہے تاکہ اس راستہ کے ذریعہ کمالِ حقیقی اور سعادتِ ابدی کو حاصل کیا جاسکے، لہذا ان مسائل کے پیش نظر کیا اس معرفت کو حاصل کرنے میں کوئی ضمانت ہے؟ اور اگر ہے؟ تو کن لوگوں کے اختیار میں ہے؟ ان سوالات کے صحیح جوابات دراصل (توحید، قیامت، نبوت) جیسے اصول ہیں کہ جو تمام ادیان آسمانی میں اصلی ترین عقائد میں شمار کئے جاتے ہیں۔

ہم نے اس کتاب کے پہلے مرحلہ میں معرفتِ خدا کے تحت بحث کی ہے اور اس نتیجہ تک پہنچے ہیں کہ تمام موجودات اپنے وجود کو خالقِ ہستی سے حاصل کرتے ہیں، اور ہر ایک اسی کے حکیمانہ تدبیر کے زیر سایہ ہیں۔ اور کوئی بھی کسی بھی حال میں کہیں بھی، اور کسی بھی امر میں اس سے بے نیاز نہیں ہے ہم نے ان مطالب کو، عقلی دلائل کے ذریعہ ثابت کر دیا ہے، اور اس بات کی بھی وضاحت کر دی ہے کہ ایسے مسائل کو صرف عقلی دلائل کے ذریعہ ہی حل کیا جاسکتا ہے، اس لئے کہ تبدیلی دلائل اور کلامِ خدا کو، اسی وقت دلیل بنایا جاسکتا ہے جب وجودِ خدا اور اس کا کلام اس کا معتبر ہونا، دلیل عقلی کے ذریعہ ثابت ہو چکا ہو، جس طرح سے

کہ نبی اور امام کے کلام کو سنت قرار دینا، ان کی نبوت و امامت اور ان کے کلام کی حجت کے اثبات پر منحصر ہے تفصیل معاد کو وحی کے ذریعہ ثابت کیا جاسکتا ہے، اگرچہ اصل قیامت عقلی اور نقلی دلائل کے ذریعہ قابل اثبات ہے۔ لہذا (نبوت اور قیامت) کے مسائل کو بیان کرنے کے لئے پہلے عقلی دلائل کے ذریعہ اصل قیامت اور اصل نبوت کو ثابت کرنا ہوگا، پھر جب رسول اکرم ﷺ کی نبوت اور قرآن کریم کی حقانیت ثابت ہو جائے تو کتاب و سنت کے مطابق ان دونوں کے تفصیلی مسائل کو بیان کیا جائے گا، لیکن چونکہ ان دونوں کے مسائل کو جد اگانہ بیان کرنا سمجھانے کے لئے نہایت مفید ہے لہذا گذشتہ سنت پر عمل کرتے ہوئے پہلے ہم نبوت کے مسائل اور پھر قیامت کے مسائل کو بیان کریں گے اور اگر بعض مقامات پر کسی ایسے مطلب کی ضرورت پڑی کہ جسے بعد میں ثابت کرنا ہوا تو اس کو استدلال کے درمیان (اصل موضوع) کے عنوان سے ذکر کر دیں گے تاکہ آسانی بات اپنی جگہ پر ثابت ہو سکے۔

اس حصہ کے مباحث کا هدف

اس حصہ کو ذکر کرنے سے ہمارا پہلا ہدف یہ ہے کہ حقائق ہستی اور صحیح زندگی کے راستوں کی معرفت حاصل کرنے کے لئے حس و عقل کے علاوہ ایک اور راستہ بھی ہے، کہ جس میں خطا کا کوئی امکان نہیں ہے، جسے وحی کہا جاتا ہے جو ایک قسم کی الہی تعلیم ہونے کے ناطے اس کے خاص بندوں سے مخصوص ہے اور عوام اس کی حقیقت سے بے خبر ہے، لیکن آثار اور علامتوں کے ذریعہ وحی کے ہونے کا پتہ لگاتے ہوئے انبیاء الہی کے ادعا یعنی وحی کے ہونے پر یقین کیا جاسکتا ہے، اور یہ ایک حقیقت ہے کہ جب کسی کے لئے وحی الہی کا ہونا ثابت ہو جائے اور جب اس کے پیغامات دوسروں تک پہنچ جائیں تو ان پر واجب ہے، کہ اس کے احکامات پر عمل کریں، اور اس صورت میں کوئی بھی اس کی مخالفت کر کے عذر پیش نہیں کر سکتا، مگر یہ کہ وحی کسی خاص فرد یا گروہ یا ایک معین زمانہ سے مخصوص ہو۔ لہذا اس حصہ کے بنیادی مسائل، بحث انبیاء [ع] کی ضرورت، وحی کا لوگوں تک پہنچنے تک عہد یا سہوی تصرفات سے محفوظ رہنا، یا انبیاء [ع] کا پیغامات الہی کو لوگوں تک پہنچانے میں معصوم ہونا، اور ان کی نبوت کو ثابت کرنے کے

لئے کافی دلائل کا ہونا وغیرہ یہیں جب وحی اور نبوت کے بنیادی مسائل دلیل عقلی کے ذریعہ ثابت ہو گئے تو اس کے بعد دوسرے مسائل جیسے تعدد انبیاء، کتب آسمانی شریعتیں، آخری رسول ﷺ آخری کتاب اور ان کے جانشین کی تعیین جیسے مسائل کے تحت بحث کی جائے گی۔ لیکن ان تمام مسائل کو عقلی برہان کے ذریعہ ثابت کرنا میسر نہیں ہے بلکہ بہت سے مقامات پر نقلی اور تعبدی دلائل کا سہارا لینا ضروری ہے۔

علم کلام میں تحقیق کی روش

اب تک جو کچھ ہم نے بیان کیا ہے اس کے مطابق فلسفہ اور علم کلام کے درمیان بنیادی فرق روشن ہو گیا اس لئے کہ فلسفہ ان مسائل میں سے ہے کہ جو عقلی دلائل کے ذریعہ ثابت ہوتا ہے لیکن علم کلام ان مسائل پر مشتمل ہے کہ جو نقلی اور تعبدی دلائل کے بغیر قابل اثبات نہیں ہے۔ ایک دوسری تعبیر کے مطابق فلسفہ اور علم کلام کے درمیان موجودہ نسبت (عموم خصوص من وجہ) کی ہے یعنی فلسفہ اور علم کلام مشترک مسائل سے متصف ہوتے ہوئے دونوں اپنے مخصوص مسائل کے مالک بھی ہیں، ہاں فلسفہ کے اپنے مخصوص مسائل عقل کی بنیاد پر حل کئے جاتے ہیں، لیکن علم کلام کے مسائل عقلی اور تعبدی دلائل کے ذریعہ ثابت ہوتے ہیں۔ ایک دوسری تعبیر کے مطابق درحقیقت علم کلام (تلفیقی) یعنی اس میں دلائل عقلی کے استعمال کے علاوہ تعبدی دلائل کا سہارا بھی لیا جاتا ہے۔

نتیجہ

فلسفہ اور علم کلام میں دو بنیادی فرق یہ ہے کہ دونوں مشترک مسائل (خدا کی معرفت) سے سرفراز ہونے کے علاوہ کچھ مخصوص مسائل کے مالک بھی ہیں، کہ جن میں فلسفہ کے مخصوص مسائل سے کلام اور کلام کے مخصوص مسائل سے فلسفہ میں بحث نہیں کی جاتی، اور دوسرا فرق یہ ہے کہ فلسفہ میں اس کے مسائل کے تحت تحقیق ایک عقلی روش ہے لیکن علم کلام اپنے بعض مسائل میں جو ان دونوں میں مشترک ہیں عقلی روش کے ذریعہ اور بعض مسائل (جیسے امامت) میں نقلی روش کے ذریعہ بحث کرتا ہے، لیکن بعض

مقام پر (جیسے اصل قیامت کو ثابت کرنے کے لئے) دونوں روش کو استعمال میں لاتا ہے، اس مقام پر اس بات کی طرف اشارہ کرنا لازم ہے کہ علم کلام کے اپنے تمام خاص مسائل جو نقلی اور تعبیری روش کے ذریعہ ثابت ہوتے ہیں، ایک جیسے نہیں ہیں، بلکہ بعض مسائل جیسے رسول اکرم ﷺ کے کردار و گفتار کی حجیت خود قرآنی آیات کے ذریعہ ثابت ہوتی ہے لیکن اس سے پہلے عقلی دلائل کے ذریعہ قرآن کی حقانیت کا ثابت ہونا ضروری ہے اور پھر آنحضرت کے خلفاء کے تعیین اور ان کے اقوال کی حجیت کے تحت بحث کی جاتی ہے۔ لیکن یہ امر واضح و آشکار ہے کہ دلائل نقلی کے ذریعہ حاصل ہونے والے نتائج اس صورت میں یقینی ہوں گے کہ جب ان کی سند قطعی اور ان کی دلالت آشکار ہوں۔

سوالات

- ۱۔ کیوں خدا کی معرفت کے بعض مسائل کو ہم نے صرف عقلی اسلوب کے ذریعہ بیان کیا ہے؟
- ۲۔ نبوت کے بنیادی مسائل کیا ہیں؟
- ۳۔ کیا نبوت اور قیامت کے بنیادی مسائل کو نقلی دلائل کے ذریعہ ثابت کیا جاسکتا ہے؟ اور کیا ان دونوں میں کوئی فرق ہے؟
- ۴۔ علم کلام کے کن مسائل کو نقلی دلائل کے ذریعہ ثابت کیا جاسکتا ہے؟
- ۵۔ مسائل نبوت کو معاد کے مسائل پر مقدم کرنے کی وجہ کیا ہے؟ اور کیا ان دونوں کے مسائل کو منظم کرنے کے لئے کوئی منطقی ترتیب ہے؟
- ۶۔ فلسفہ اور علم کلام میں کیا فرق ہے؟
- ۷۔ علم کلام کے مسائل کے اثبات کی جہت سے اسے چند قسموں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے؟ ان قسموں کی ترتیب بیان کریں؟

بایںواں درس

بشر کو وحی اور نبوت کی ضرورت

بعث انبیاء علیہ السلام کی ضرورت

یہ مسئلہ نبوت کے مسائل میں سے ہے جسے ایک ایسے برہان کے ذریعہ ثابت کرنا ہوگا کہ جو تین مقدمات پر مشتمل ہو۔ پہلا مقدمہ یہ ہے انسان کی خلقت کا ہدف یہ ہے کہ وہ اپنے مختار ہونے کے ساتھ اعمال کے ذریعہ راہ نکال کو انتہائی کمال تک طے کرے، ایسا کمال کہ جو انسان کے مختار ہوئے بغیر قابل دست رسی نہیں ہے، ایک دوسری تعبیر کے مطابق انسان کو اس لئے خلق کیا گیا ہے کہ وہ خدا کی اطاعت و عبادت کے ذریعہ اپنے وجود میں رحمت الہی کی دریافت کی لیاقت پیدا کرے، جو صرف اور صرف انسان کمال سے مخصوص ہے، اور خدا کا ارادہ بھی انسان کی سعادت اور اس کے کمال سے متعلق ہے لیکن چونکہ یہ سعادت اختیاری افعال انجام دئے بغیر میسر نہیں ہے اس مسئلہ نے بشری زندگی کو دو راہے پر کھڑا کر دیا ہے تاکہ وہ اپنے اختیار سے جسے چاہے انتخاب کرے جن میں سے ایک راستہ شقاوت کی طرف جاتا ہے جو بالاتباع ارادہ الہی سے متعلق ہے نہ بالاصالت۔ یہ مقدمہ عدل و حکمت الہی کی بحث کے ضمن میں واضح ہو گیا۔

دوسرا مقدمہ: یہ ہے کہ غور و فکر کے ذریعہ اختیار و انتخاب کرنا، مختلف امور کی انجام دہی میں بیرونی عوامل کا مہیا ہونا اور ان کی طرف باطنی کشش کے پائے جانے کے علاوہ امور کے صحیح یا غلط ہونے اور اسی طرح شائستہ اور ناشائستہ راستوں کی ضرورت ہے، اور انسان اسی صورت میں غور و فکر کے ساتھ انتخاب کر سکتا ہے کہ جب ہدف اور اس تک پہنچنے والے راستہ کو اچھی طرح جانتا ہو، اور اس کے فراز و نشیب، پیچ و خم سے پوری طرح آگاہ ہو لہذا حکمت الہی کا تقاضا یہ ہے کہ ایسی معرفت کے حصول کے لئے خداوند متعال ضروری وسائل و امکانات، بشر کے اختیار میں قرار دے، وگرنہ اس کی مثال اس شخص کی ہوگی جو کسی کو اپنے مہمان سرا پر

دعوت دے، لیکن اسے اس کا پتہ اور وہاں تک جانے والے راستہ کی نشاندہی نہ کرے، ظاہر ہے کہ ایسا عمل حکمت اور غرض کے خلاف ہوگا۔ یہ مقدمہ بھی چونکہ واضح ہے لہذا اس کے لئے زیادہ وضاحت کی ضرورت نہیں ہے۔ تیسرا مقدمہ یہ ہے کہ انسانوں کی وہ معمولی معرفت جو حس و عقل کی بنیاد پر حاصل ہوتی ہے اگرچہ انسانی ضروریات کو پورا کرنے میں اپنا پورا کردار ادا کرتی ہے لیکن سعادت حقیقی اور راہ کمال کو فردی و اجتماعی، مادی و معنوی، دنیوی و آخروی پہلوؤں کے لحاظ سے پہچاننے کے لئے کافی نہیں ہے، اور اگر ان مشکلات کے حل کے لئے کوئی اور راستہ نہ ہو تو انسان کی خلقت سے خدا کا ہدف پورا نہیں ہو سکتا۔

ان مقدمات کی بدولت ہم اس نتیجہ تک پہنچے ہیں کہ حکمت الہی کا تقاضا یہ ہے کہ راہ تکامل کی پہچان کے لئے حس و عقل کے علاوہ کوئی دوسرا راستہ انسان کے اختیار میں ہونا چاہیے، تاکہ انسان براہ راست یا ایک یا چند واسطہ کے ذریعہ اس سے مستفید ہو سکے، ہاں یہ وہی وحی کا راستہ ہے جسے خدا نے اپنے انبیاء [ع] کے اختیار میں دے دیا ہے، جس سے عوام، انبیاء [ع] کے ذریعہ اور انبیاء [ع] براہ راست مستفید ہوتے ہیں، اور جو چیز کمال نہائی اور سعادت کے حصول میں ضروری ہے اسے انسانوں کے اختیار میں قرار دیا ہے۔ ان تینوں مقدموں میں تیسرے مقدمہ کی بہ نسبت ممکن ہے کسی کے دل میں کوئی شبہ پیدا ہو لہذا اس سلسلہ میں تھوڑی سی وضاحت کریں گے تاکہ اس طرح راہ تکامل کی تشخیص میں علوم بشری کی کمزوری اور بشر کیلئے راہ وحی کی ضرورت پوری طرح روشن ہو جائے۔

بشری علوم کی ناکامی

زندگی کے صحیح راستہ کو اس کے تمام جوانب کے ساتھ پہچاننے کے لئے ضروری ہے کہ سب سے پہلے انسان کے آغاز و انجام نیز بقیہ موجودات کے ساتھ اس کے روابط اور مخلوقات کے ساتھ اس کی معاشرت کے علاوہ سعادت و ثقاوت میں اثر انداز ہونے والے مختلف پہلوؤں کا جاننا ضروری ہے نیز مصالح و مفاسد، سود و زیان میں کمی اور زیادتی کی تشخیص بھی ضروری ہے، تاکہ اس طرح کھربوں انسان کے وظائف مشخص ہو سکیں، جو مختلف طبعی اور اجتماعی شرائط اور بدنی اور روحی تفاوت و اختلافات کے ساتھ زندگی

گزار رہے ہیں، لیکن ان تمام امور پر ایک یا چند افراد کی بات کیا ہزاروں علوم انسانی کے ماہرین بھی اکٹھا ہو جائیں تو بھی ایسے پیچیدہ فارمولے کو کشف کر کے اسے منظم اصول و قوانین کی ایسی شکل نہیں دے سکتے کہ جو تمام انسانوں کے لئے فردی و اجتماعی، مادی، معنوی، دنیوی و اخروی اعتبار سے مصلح و مفاسد کی ضمانت دے سکے اس کے علاوہ بے شمار مصلح و مفاسد کے ٹکراؤ کے دوران جو اکثر اوقات پیش آتے ہیں ان میں اہم کو انتخاب کر کے وظیفہ کو معین کرنا بھی ان کی استطاعت کے باہر ہے۔ تاریخ بشر میں بدلتے ہوئے قوانین نے اس بات کو ثابت کر دیا ہے کہ ہزاروں سال تک ہزاروں حقوق دانوں کی تحقیق و جستجو سے آج تک کامل اور عیب و نقص سے مبرا قوانین کا ایک مجموعہ وجود میں نہیں آسکا، بلکہ ہمیشہ قانون کو وضع کرنے والے ایک مدت کے بعد اپنے ہی وضع کردہ قانون میں خطا سے آگاہ ہوئے، یا تو اسے بدل دیا یا پھر اسے کسی دوسرے وضع کردہ قانون کے ذریعہ کامل کر دیا۔

لیکن اس مقام پر اس مطلب کی طرف توجہ مبذول رہے، کہ انھوں نے بہت حد تک اپنے قوانین کو وضع کرنے میں الہی قوانین کا سہارا لیا ہے اور یہ بھی معلوم رہے، کہ قانون گذاروں کی تمام سعی و کوشش دنیوی اور اجتماعی زندگی کو سنوارنے کے لئے صرف ہوتی رہی ہے، لیکن کبھی بھی انھوں نے اخروی منافع کی طرف کوئی توجہ نہ دی اور دنیوی قوانین سے اس کا کوئی موازنہ نہیں کیا، بلکہ اگر وہ اس مسئلہ کو مد نظر رکھ کر قوانین وضع کرتے تو کبھی بھی اس راہ میں کامیاب نہ ہوتے، اس لئے کہ مادی اور دنیوی مصلحتوں کو ایک حد تک تجربوں کے ذریعہ معین کیا جاسکتا ہے لیکن معنوی اور اخروی مصلحتیں کسی بھی حال میں تجربہ حسی کے قابل نہیں ہیں، اور پوری طرح سے اس کے مصلح کا اندازہ نہیں لگایا جاسکتا، اسی طرح ان کے لئے مصلح اخروی اور مصلح دنیوی کے ٹکراؤ کے ہنگام اہم و مهم کو تشخیص دینا بھی غیر ممکن ہے، بشر کے موجودہ قوانین کی حالت کو دیکھتے ہوئے ہزاروں سال پہلے جینے والے انسانوں کے علوم کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے اور یہ قطعی نتیجہ حاصل کیا جاسکتا ہے کہ گذشتہ ادوار میں جینے والے اس عصر میں جینے والوں کے مقابلہ میں زندگی کے صحیح راستہ کی تشخیص میں نہایت ناتواں تھے اور اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ اس عصر کے انسانوں سے ہزاروں سالہ تجربات کے پیش نظر کامل قوانین کے مجموعہ کو وضع کرنے میں کامیابی حاصل کر بھی لی ہے یا بالفرض یہ قوانین انسانوں کی اخروی

سعادت کے ضامن بھی بن گئے ہیں، لیکن پھر بھی یہ سوال اپنی جگہ باقی ہے کہ کس طرح ہزاروں انسانوں کو ان کی جہالت میں چھوڑ دینا حکمت الہی سے سازگار ہے؟ نتیجہ۔ آغاز سے انجام تک انسانوں کی خلقت کا ہدف اسی صورت میں قابل تحقیق ہے کہ جب زندگی کے حقائق اور فردی و اجتماعی وظائف کی معرفت کے لئے حس و عقل سے ماورا کوئی دوسرا راستہ بھی موجود ہو، اور وہ راستہ وحی کے علاوہ کوئی دوسرا راستہ نہیں ہو سکتا۔

اس بحث کی روشنی میں یہ مطلب بھی واضح ہو گیا کہ اس برہان کا تقاضا یہ ہے کہ اس زمین پر قدم رکھنے والے سب سے پہلے انسان کا نبی ہونا ضروری ہے تاکہ وہ وحی کے ذریعہ زندگی کے صحیح طریقہ کو پہچانے اور ہدف خلقت اس کے متعلق متحقق ہو جائے اور اس کے بعد آنے والے انسان اسی کے ذریعہ ہدایت یافتہ ہوں۔

بعثت انبیاء علیہ السلام کے فوائد

انبیاء الہی انسانوں کے کمال کو مشخص کرنے اور وحی کو دریافت کرنے کے بعد لوگوں کے سامنے اسے بیان کرنے کے علاوہ انسانوں کے بحال (بتدریج کمال تک پہنچنے) کے لئے دوسرے مهم راستوں سے بھی آگاہ تھے جو درج ذیل ہیں۔ ۱۔ بہت سے ایسے مطالب ہیں کہ جنہیں درک کرنے کے لئے انسانی عقول میں طاقت نہیں ہے، بلکہ اسے سمجھنے کے لئے گزشتہ زمانے کے علاوہ بے شمار تجربوں کی ضرورت ہے یا پھر وہ مطالب حیوانی خواہشات میں ملوث ہونے اور مادیات سے وابستہ ہونے کی وجہ سے فراموشی کا شکار ہو گئے ہیں، یا پھر زہریلی تبلیغات اور لوگوں کے درمیان غلط پروپیگنڈوں کی وجہ سے مخفی ہو گئے ہیں، ایسے مطالب بھی انبیاء الہی کی جانب سے بیان کئے جاتے ہیں جنہیں پے درپے تذکرات اور بار بار تکرار کے ذریعہ پوری طرح فراموش ہونے سے بچایا جاتا ہے اور صحیح تعلیم کے ذریعہ ایسی زہریلی تبلیغات کے اثرات سے محفوظ کر دیا جاتا ہے۔

یہیں سے انبیاء [ع] کا ”ذکر“ اور ”نذیر“ اور قرآن کا ”ذکر“ اور تذکرہ“ جیسی صفات سے متصف ہونا سمجھ میں آتا ہے امام علی علیہ السلام بعثت انبیاء [ع] کی حکمتوں کو بیان کرنے کے دوران فرماتے ہیں (لِئَلَّا ذُوْهُمْ مِثَاقُ فِطْرَتِهِمْ وَيَذْكُرُوْهُمْ نِعْمَتِهِ وَنَجْوَاهُ عَلِيمٌ بالتبلیغ) یعنی خدا نے اپنے رسولوں کو پے در پے بھیجا تاکہ لوگوں سے یہاں فطرت پر وفاداری کا اقرار لیں، فراموش شدہ نعمتوں کی یاد دلائیں اور تبلیغ کے ذریعہ اتمام حجت کریں:

۲۔ انسان کے مکمل (کمال کے آخری درجہ تک پہنچنے) کے مهم ترین عوامل میں سے اسوہ اور نمونہ کا ہونا ہے کہ جس کی اہمیت علم نفسیات ثابت ہے انبیاء الہی انسان کامل اور دست الہی کے ہاتھوں تربیت پانے کی وجہ سے اس کردار کو بہترین صورت میں پیش کرتے ہیں، لوگوں کو اپنی تعلیمات کا میابی حاصل کرنے کے علاوہ ان کی تربیت اور تزکیہ کا اہتمام بھی کرتے ہیں، اور ہمیں یہ معلوم ہے کہ قرآن میں تعلیم و تزکیہ کو باہم ذکر کیا گیا ہے یہاں تک کہ بعض مقامات پر تزکیہ کو تعلیم پر مقدم کیا گیا ہے۔

۳۔ لوگوں کے درمیان انبیاء [ع] کے موجود ہونے کی برکات میں سے ایک برکت یہ بھی ہے کہ صورت حال کے موافق ہوتے ہی لوگوں کی سیاسی، اجتماعی رہبری کو بھی سنبھالتے ہیں، اور یہ امر بخوبی روشن ہے کہ ایک سماج کے لئے معصوم رہبر کا ہونا عظیم نعمتوں میں سے ہے اس لئے کہ اس کے ذریعہ سماج کی بہت سی مشکلات کو روک دیا جاتا ہے، اور سماج اختلاف بگراہی اور کج روی سے نجات پا جاتا ہے اور کمال کی جانب گامزن ہو جاتا ہے۔

سوالات

۱۔ انسان کی خلقت کا ہدف کیا ہے؟

۲۔ کیا جس طرح خدا کا حکیمانہ ارادہ انسان کی سعادت سے متعلق ہے اسی طرح اس پر عذاب سے بھی متعلق ہے؟ یا پھر ان دونوں میں کوئی فرق ہے؟

۳۔ غور و فکر کے ساتھ انسان کو اختیار و انتخاب کے لئے کن امور کی ضرورت ہے؟

۴۔ کیوں عقل بشر تمام معارف کے سمجھنے میں ناقص و قاصر ہے؟

۵۔ بعثت انبیاء [ع] کی ضرورت پر موجودہ برہان کو بیان کریں؟

۶۔ اگر انسان طولانی تجربوں کے ذریعہ دنیوی اور اجتماعی سعادتوں کو حاصل کر لیتا تو کیا پھر بھی اسے وحی کی ضرورت تھی؟ اور کیوں؟

۷۔ کیا سب سے پہلے انسان کے نبی ہونے پر دلیل قائم کی جاسکتی ہے؟

۸۔ انبیاء [ع] کے موجود ہونے کے تمام فوائد کو بیان کریں؟

تیسواں درس

چند شبہات کا حل

بعثت انبیاء علیہم السلام کے سلسلہ میں جو دلائل ذکر ہوئے ہیں انھیں دلائل کے ضمن میں چند شبہات اور سوالات میں جن کے جوابات یہاں ذکر کئے جائیں گے۔ کیوں بہت سے لوگ انبیاء [ع] کی ہدایت سے محروم ہو گئے؟ اگر تمام انسانوں کی ہدایت کے لئے بعثت انبیاء [ع] کا اقتضایہ ہے کہ وہ انبیاء [ع] کو مبعوث کرے تو پھر کیوں سب کے سب فقط ایک ہی سرزمین ایشیا میں مبعوث ہوئے، اور بقیہ سرزمینیں اس نعمت سے محروم رہیں، خصوصاً گذشتہ ادوار میں ارتباطات کے وسائل بہت محدود تھے اور ایک مقام سے دوسرے مقام تک، کسی خبر کو پہنچانا نہایت سختی سے انجام پاتا تھا اور شاید اس وقت کچھ ایسی قومیں رہی ہوں، جنہیں اصلاً بعثت انبیاء [ع] کی کوئی خبر نہ ملی ہو۔

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ پہلے، انبیاء [ع] کی بعثت کسی خاص سرزمین سے مخصوص نہیں تھی، بلکہ قرآن کی آیات کے مطابق ہر امت اور ہر قوم کے پاس پیغمبر بھیجے گئے جیسا کہ سورہ فاطر کی چوبیسویں آیت میں خدا فرماتا ہے: (وَإِنْ مِنْ أُمَّةٍ إِلَّا خَلَا فِيهَا نَذِيرٌ) اور دنیا میں کوئی امت ایسی نہیں گئی جس کے پاس ہمارا ڈرانے والا پیغمبر نہ آیا ہو۔

سورہ نحل کی آیت چھتیسویں میں وارد ہوا ہے: (وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِي كُلِّ أُمَّةٍ رَسُولًا أَنْ اِعْبُدُوا اللَّهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوتَ) اور ہم نے تو ہر امت میں ایک نہ ایک رسول ضرور بھیجا کہ وہ لوگوں سے کہے کہ خدا کی عبادت کرو اور بتوں کی عبادت سے بچے رہو۔ اور اگر قرآن میں محدود انبیاء [ع] کا نام آیا ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ کل انبیاء کی تعداد اتنی ہی تھی بلکہ خود قرآن کے بیان کے مطابق بہت سے انبیاء [ع] تھے جن کے اسماء اس قرآن میں ذکر نہیں کئے گئے، جیسا کہ سورہ نساء کی آیت ۱۶۴ میں خدا فرماتا ہے: (وَرَسُولًا لِّمَنْ يَخْلُقُ مَا يَشَاءُ لِيُخَوِّفَ مِمَّا بِيَدِهِ مَن يَشَاءُ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ)

نقصم علیک) جن کا حال تم سے بیان نہیں کیا گیا۔ دوسرے: اس برہان کا تقاضا یہ ہے کہ حس و عقل کے ماوراء کوئی ایسا راستہ ہونا چاہیے کہ جس کے ذریعہ یہ امکان ہو کہ لوگوں کی ہدایت کی جاسکے، لیکن بشر کی ہدایت کو مرحلہ فعلیت تک پہنچنے کے لئے دو شرط ہے۔ ۱۔ پہلی یہ کہ وہ لوگ خود اس نعمت الہی سے استفادہ کرنا چاہیں۔

۲۔ دوسرے یہ کہ کوئی دوسرا ان کی ہدایت میں مانع ایجاد نہ کرے، اور لوگوں کا انبیاء [ع] سے محروم ہونے کا سبب خود ان کے ناجائز اختیارات تھے، جس طرح کہ بہت سے لوگوں کا انبیاء [ع] کی ہدایت سے محروم ہونا انہیں موانع کی وجہ سے ہے، جسے وہ لوگ خود انبیاء [ع] کی تبلیغ میں ایجاد کرتے تھے، اور ہمیں بخوبی معلوم ہے کہ انبیاء الہی برابر ایسے موانع کو برطرف کرنے کے لئے کوشاں رہے، اور ہمیشہ سنگمروں، ظالموں اور مستکبروں سے برسرِ پیکار رہتے تھے، بلکہ انبیاء [ع] کی ایک کثیر تعداد راہ تبلیغ اور لوگوں کی ہدایت کی راہ میں شہید بھی ہو گئی بلکہ جب بھی انہیں نیک ساتھیوں کی حمایت ملی تو انہوں نے وقت کے ان ظالموں سے مقابلہ کیا، مگر جو ان کے اہداف میں موانع ایجاد کرتے تھے۔

قابل توجہ نکتہ تو یہ ہے کہ انسان کی مکالمی حرکت کی خصوصیات کا تقاضا یہ ہے کہ یہ تمام تدابیر اس طرح انجام پذیر ہوں کہ حق و باطل کے حامیوں کے لئے حسن انتخاب یا سوء انتخاب فراہم ہو جائے، مگر یہ کہ ظالموں اور مستکبروں کا تسلط اس حد تک بڑھ جائے کہ ہادیوں کی ہدایت کا راستہ پوری طرح بند ہو جائے اور سماج سے نور ہدایت خاموش ہو جائے، یہی وہ صورت ہے کہ جب خدا غیب اور غیر عادی راہوں سے حق کے طرفداروں کی مدد فرماتا ہے۔ نتیجہ: اگر ایسے موانع انبیاء [ع] کے راستوں میں نہ ہوئے تو ان کی دعوت توحید تمام انسانوں کے کانوں تک پہنچ جاتی اور تمام انسان وحی اور نبوت کے ذریعہ نعمت ہدایت سے بہر مند ہو جاتے، لہذا بہت سے لوگوں کا ہدایت انبیاء [ع] سے محروم ہونے کا گناہ، ان لوگوں کی گردنوں پر ہے کہ جنہوں نے راہ ہدایت انبیاء میں رکاوٹیں ایجاد کی ہیں۔ کیوں خدا نے انحرافات اور اختلافات کا سد باب نہیں کیا؟ اگر انبیاء [ع] تکامل انسان کے شرائط کو کامل کرنے کے لئے مبعوث ہوئے ہیں تو پھر کیوں ان کے ہوتے ہوئے بشر خطا اور بد بختیوں کا شکار ہوا اور ہر زمانہ میں لوگوں کی ایک بڑی جماعت کفر

و اتحاد میں گرفتار رہی، یہاں تک کہ ادیان آسمانی کے پیروکاروں نے ایک دوسرے کے خلاف جنگ کے شعلہ بھڑکائے جس کی وجہ سے خونی جنگیں دیکھنے میں آئیں؟ کیا حکمت الہی کا تقاضا یہ نہ تھا کہ وہ کچھ ایسے راستہ بھی مہیا کرتا، جن کے ذریعہ ایسی بد بختیوں کا سد باب ہو جاتا اور کم از کم ادیان آسمانی کے پیروکار ایک دوسرے کے مقابلہ میں نہ ٹھہرتے۔ اس سوال کا جواب بحال انسان کے اختیارات کی خصوصیات میں غور و فکر کرنے کے ذریعہ معلوم ہو جاتا ہے، اس لئے کہ حکمت الہی کا تقاضا یہ ہے کہ انسان کے بحال کے اسباب و شرائط کا جبری ہونے کے بدلے اختیاری ہونا ضروری ہے تاکہ وہ لوگ جو راہ حق کو پہچانا چاہتے ہیں اور اسے اختیار کرنا چاہتے ہیں، وہ کمال اور سعادت ابدی کو حاصل کرنے میں مختار ہیں، لیکن ایسے بحال اور کمال کے لئے اسباب و شرائط کا مہیا ہو جانا اس معنی میں نہیں ہے کہ تمام انسانوں نے بہ نحو احسن اس سے استفادہ کیا ہو، اور صحیح راستہ کا انتخاب کیا ہو بلکہ قرآن کی تعمیر کے مطابق خدا نے انسانوں کو ایسے شرائط کے تحت اس لئے خلق کیا ہے تاکہ انہیں آزما سکے کہ ان میں کون نیکوکار ہے!

اس کے علاوہ قرآن میں بارہا اس بات کی تاکید ہوئی ہے کہ اگر خدا چاہتا تو تمام انسانوں کو راہ ہدایت کی طرف راہنمائی کر دیتا اور ظلم و ستم کو دبا دیتا^۱۔ لیکن اس صورت میں انتخاب کا کوئی مطلب نہیں رہ جاتا، نیز انسانوں کے کردار قابلِ ارزش بھی نہ رہتے اور اس طرح انسان کی خلقت سے غرض الہی (اختیار و انتخاب) میں نقض آ جاتا۔

نتیجہ

انسانوں میں فساد و تباہ کاری اور کفر و عصیان کی طرف میلان خود ان کے ناجائز اختیارات کا نتیجہ ہے، اور خود انسانوں کی خلقت میں ایسے امور پر قدرت کا لحاظ رکھا گیا ہے لہذا ایسے اختیار کے اثرات کا حاصل ہونا بالتبع لازم ہے، اگرچہ خدا کا ارادہ یہ ہے کہ انسان اپنے کمال کو حاصل کر لے، لیکن چونکہ اس ارادہ کا تعلق مختار ہونے پر مشروط ہے لہذا اس صورت میں سوء اختیار کے نتیجہ میں انحراف کا انکار نہیں کیا جاسکتا، اور حکمت الہی کا تقاضا تو یہ نہیں ہے کہ تمام انسان خواہ خواہ ہدایت یافتہ ہو جائیں اگرچہ ان کے ارادہ

^۱ رجوع کریں سورۃ ہود۔ آیت ۷۔ سورۃ ملک۔ آیت ۲۔ سورۃ مائدہ۔ آیت ۴۸ سورۃ انعام۔ آیت ۱۶۵۔

کے خلاف ہی کیوں نہ ہو۔ کیوں انبیاء الہی صنعتی اور اقتصادی امتیازات سے سرفراز نہ تھے؟ حکمت الہی کے تقاضوں کے پیش نظر کہ تمام انسان بہ نحو احسن اپنے حقیقی کمال کو حاصل کر لیں، کیا بہتر یہ نہ تھا کہ خدا وحی کے ذریعہ اس جہان کے اسرار لوگوں کے لئے فاش کر دیتا، تاکہ مختلف نعمتوں سے فائدہ اٹھانے کے ذریعہ انسان راہ مکمل میں اپنے سفر کو سرعت بخش دیتا! جیسا کہ اس دور میں طبعی طاقتوں کے ظہور اور مختلف اسباب کے ایجادات سے بشری تمدن نے نمایاں ترقی حاصل کی ہے، جن کی وجہ سے حفظ سلامتہ امراض سے مقابلہ ارتباطات میں سرعت، جیسے مطلوب عوامل اور آثار وجود میں آگئے، اس وضاحت کی روشنی میں اٹکار ہے کہ اگر انبیاء الہی جدید علوم و صنائع اور آسائش کے وسائل لوگوں کے لئے فراہم کرنے کے ذریعہ اپنی اجتماعی اور سیاسی قدرت کو افزائش دے سکتے تھے اور بڑی آسانی سے اپنے اہداف تک پہنچ سکتے تھے۔

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ وحی و نبوت کے ہونے کی اصلی ضرورت ان امور میں ہے کہ جن میں بشر عادی وسائل کے ذریعہ کشف نہ کر سکے اور اس سے جاہل ہوتے ہوئے کمال حقیقی کی طرف جانے والے راستہ کو معین نہ کر سکے، ایک دوسری تعمیر کے مطابق انبیاء علیم السلام کا اصلی وظیفہ یہ ہے کہ وہ انسانوں کو صحیح زندگی اور کمال حقیقی کے حصول میں مدد کریں، تاکہ وہ ہر حال میں اپنے وظیفہ کو پہچان سکیں، اور مطلوب کو حاصل کرنے میں اپنی پوری طاقت صرف کریں، انسان، خواہ دشت میں رہنے والا ہو، یا دریاؤں کی سیر کرنے والا ہو یا کوئی بھی ہو، وہ ہر صورت میں اپنی انسانی حیثیت کو پہچان لے تاکہ معلوم ہو جائے کہ خدا کی عبادت کے وظائف کیا ہیں؟ تمام مخلوقات اور سماج میں رہنے والوں کے ساتھ رہن سہن کے واجبات کیا ہیں تاکہ انھیں انجام دینے کے ذریعہ کمال حقیقی اور سعادت ابدی تک پہنچ جائے لیکن صلاحیتوں اور صنعتی و طبعی امکانات کا اختلاف خواہ ایک زمانہ میں ہو یا مختلف زمانوں میں، ایک ایسا امر ہے کہ جو خاص اسباب و شرائط کے تحت وجود میں آتا ہے اس کے علاوہ مکمل (کمال) حقیقی میں اس کا کوئی نقش بھی نہیں ہے، جیسا کہ آج کی علمی اور صنعتی ترقیاں دنیوی لذتوں کی افزائش کا باعث تو بنیں، لیکن لوگوں کی روحی اور معنوی مکمل میں ایک معمولی کردار بھی ادا نہ کر سکیں، بلکہ ہم تو یہ دیکھ رہے ہیں کہ ان سب کا اثر بالکل برعکس رہا ہے۔

نتیجہ

حکمت الہی کا تقاضا یہ ہے کہ انسان مادی نعمتوں سے استفادہ کرتے ہوئے اپنی دنیوی زندگی کو جاری رکھے، اور عقل و وحی کی راہنمائی میں کمال حقیقی اور سعادت ابدی کی جانب قدم بڑھائے، لیکن روحی اور بدنی توانائیوں میں اختلاف، نیز طبعی اور اجتماعی شرائط میں اختلاف اسی طرح علوم و صنائع سے فائدہ حاصل کرنے میں اختلاف ایک خاص تکوینی اسباب و شرائط کے تابع ہے، جو نظام علی و معلولی کے تحت وجود میں آتے ہیں یہ اختلافات انسان کی ابدی تقدیر میں کسی بھی خاص کردار سے متصف نہیں ہیں، اس لئے کہ بسا اوقات ایسا ہوا ہے کہ ایک فرد یا ایک جماعت اپنی سادہ زندگی اور حداقل مادی و دنیوی نعمتوں سے سرفراز ہوتے ہوئے کمال و سعادت کے عظیم درجات پر فائز ہوئے ہیں، اور اکثر دیکھنے میں آیا ہے کہ ایک فرد یا جماعت ترقی یافتہ علوم صنائع اور بہترین وسائل زندگی سے سرفراز ہوتے ہوئے، غرور و تکبر اور ظلم و ستم کے نتیجہ میں شقاوت ابدی میں گرفتار ہو گئے ہیں۔

البتہ انبیاء الہی نے اصلی و عینہ (حقیقی اور ابدی سعادت و کمال کی طرف ہدایت) کے علاوہ لوگوں کو صحیح زندگی گزارنے کے لئے مدد کی ہے اور جہاں حکمت الہی نے تقاضا کیا وہاں ناشاختہ حقائق اور اسرار طبیعت سے پردہ بھی اٹھا دیا، اور اس طرح تمدن بشر کو ترقی دینے میں مدد کی، جیسا کہ ایسی مثالیں جناب داؤد اور، جناب سلیمان اور جناب ذوالقرنین علیہم السلام کے حالات میں دیکھی جا سکتی ہیں، انھوں نے سماج کو کامیاب بنانے اور امور میں حسن تدبیر کے لئے نمایاں کام انجام دئے ہیں، جب جیسا کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے سرزمین مصر پر انجام دیا^۱ ایسے خدمات جو کچھ بھی انبیاء نے پیش کئے وہ ان کے اصلی و عینہ سے جدا تھے۔ لیکن یہ سوال کہ کیوں انبیاء [ع] نے اپنے اہداف کو کامیاب بنانے کے لئے صنعت و اقتصاد وغیرہ کا سہارا نہیں لیا؟ تو اس سوال کے جواب میں یہ کہنا بہتر ہے کہ انبیاء علیہم السلام کا ہدف جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے آزاد انتخاب کے لئے وسائل کا فراہم کرنا تھا، اور

^۱ رجوع کریں۔ سورۃ انبیاء آیت / ۸۲، ۷۸، سورۃ کہف آیت / ۸۳، ۹۷۔ سورۃ سبا۔ آیت / ۱۰، ۱۳۔ بعض روایتوں کے ذریعہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ذوالقرنین نبی نہیں بلکہ ولی خدا تھے۔
^۲ رجوع کریں۔ سورۃ یوسف آیت / ۵۵۔

اگر وہ غیر عادی طاقتوں کے بل بوتے پر قیام کرتے، تو آزادانہ مکالم اور رشد معنوی انسانوں کو حاصل نہ ہوتا، بلکہ عوام ان کی قدرتوں کے ڈر سے اطاعت کرتی، نہ الہی فرمان اور آزاد انتخاب کے تحت۔ اسی سلسلہ میں امام علی علیہ السلام فرماتے ہیں اگر خداوند متعال اپنے انبیاء [ع] کو مبعوث کرتے وقت سیم و زر کے گنجینہ، جواہرات اور قیمتی معادن اور باغات عطا کر دیتا، ہواؤں کے پرندے اور زمین کے چرند ان کے لئے مطیع بنا دیتا تو اس صورت میں جزا و سزا اور امتحان کا موقع باقی نہ رہتا۔ اور اگر اپنے انبیاء [ع] کو بے مثال قدرت، شکست ناپذیر عزت اور عظیم سلطنت عطا کرتا کہ جس کی وجہ سے لوگ ڈر کر یا طمع میں تسلیم ہوتے ہوئے، ظلم و ستم اور تکبر سے دست بردار ہو جاتے تو اس صورت میں اقدار مساوی ہو جاتے، لیکن خدا کا یہ ارادہ تھا کہ پیغمبروں کی اطاعت ان کی کتابوں کی تصدیق اور ان کے حضور فروتنی کسی بھی عیب سے پاک ہوتے ہوئے حق کے لئے ہو، لہذا جس قدر بلا اور امتحان عظیم ہوں گے ثواب الہی اتنے ہی کثیر ہوں گے“۔^۱

البتہ جب لوگ اپنے ارادہ اور رغبت سے دین حق کو قبول کر لیں اور ایک الہی سماج کو تشکیل دیدیں، تو پھر اہداف الہی کو کامیاب بنانے کے لئے مختلف قدرتوں سے استفادہ کرنا درست ہوگا، جیسا کہ ایسے نمونے حضرت سلیمان علیہ السلام کی زندگی میں ملتے ہیں۔^۲

^۱ نہج البلاغہ، خطبہ قاصعہ۔ سورۃ فرقان۔ آیت ۷/ ۱۰۔ سورۃ زخرف۔ آیت ۳۱/ ۳۵۔

^۲ سورۃ انبیاء۔ آیت ۸۱/ ۸۲۔ سورۃ نمل۔ آیت ۱۵/ ۴۴۔

سوالات

- ۱۔ کیا تمام انبیاء [ع] کسی خاص سرزمین پر مبعوث ہوئے؟ دلیل کیا ہے؟
- ۲۔ کیوں انبیاء [ع] کی دعوتیں تمام انسانوں تک نہ پہنچ سکیں؟
- ۳۔ کیوں خدا نے ایسے اباب فراہم نہیں کئے کہ جس کی وجہ سے فساد و خون ریزی کی روک تھام ہو؟
- ۴۔ کیوں انبیاء [ع] نے اسرار طبیعت کو فاش نہیں کیا تاکہ ان کے ماننے والے مادی نعمتوں سے زیادہ مستفید ہوتے؟
- ۵۔ کیوں انبیاء [ع] نے اپنے اہداف کو کامیاب بنانے کے لئے صنعتی اور اقتصادی قدرتوں سے فائدہ نہیں اٹھایا؟

چوبیسواں درس

عصمت انبیاء [ع]

وحی کے محفوظ رہنے کی ضرورت

حس و عقل کی کمیوں کو پورا کرنے اور ضروری معارف کے حصول میں مدد کرنے والے عامل یعنی اب جب کہ ہم نے وحی کی ضرورت کو سمجھ لیا ہے اس کے بعد یہ مسئلہ سامنے آتا ہے کہ یہ مطلب ہر ایک کو معلوم ہے کہ عادی انسان بالواسطہ وحی سے استفادہ نہیں کر سکتے اور وحی کو دریافت کرنے کی لیاقت اور استعداد سے سرفراز نہیں ہو سکتے، بلکہ چند خاص اجزا (انبیاء الہی) کے ذریعہ وحی کے پیغامات کو ان تک پہنچانا ہوگا، لیکن ان پیغامات کے صحیح ہونے کی ضمانت کیا ہے، اور کہاں سے یہ معلوم ہو کہ نبی خدا نے وحی کو دریافت کر کے صحیح و سالم لوگوں کے حوالہ کیا ہے؟ اور اگر خدا اور رسول ﷺ کے درمیان رابطہ ہے بھی تو کیا اس نے اپنی رسالت انجام دے دی ہے؟ اس لئے کہ وحی اسی وقت مفید واقع ہو سکتی ہے جب مرحلہ صدور سے مرحلہ وصول تک عمدی یا سہوی تمام خطاؤں اور اضافات سے محفوظ رہی ہو، وگرنہ واسطوں میں سو و نیان کے احتمال یا ان میں عمدی تصرفات کے احتمال کے ہوتے ہوئے لوگوں تک پہنچنے والے پیغام میں نادرست اور خطا ہونے کا باب کھل جائے گا، اور اس طرح اعتماد کے اٹھ جانے کا سبب ہوگا لہذا کیسے معلوم ہو سکتا ہے کہ وحی صحیح و سالم لوگوں تک پہنچی ہے؟

یہ بات روشن ہے کہ جب وحی کی حقیقت لوگوں کے لئے مجہول ہو اور اسے دریافت کی استعداد سے وہ سرفراز نہ ہوں تو اس صورت میں واسطوں میں کافی نظارت بھی نہیں رکھ سکتے، اور صرف اسی وقت وحی میں ہونے والے تصرفات سے آزاہی ممکن ہے کہ جب عقل و منطق کے خلاف کوئی پیغام موجود ہو، جیسے کہ کوئی یہ دعویٰ کرے کہ خدا نے اس پر وحی بھیجی ہے: کہ اجتماع نقیضین جائز یا

^۱ قرآن کریم اس سلسلہ میں فرماتا ہے: (وَمَا كَانَ اللَّهُ لِيُظِلَّكُمْ عَلَى الْغَيْبِ وَ لَكِنَّ اللَّهَ يَجْتَبِي مِنْ رُسُلِهِ مَنْ يَشَاءُ) سورة آل عمران۔ آیت / ۱۷۹۔

واجب ہے یا العیاذ باللہ) ذات الہی میں تعدد یا زوال یا ترکیب کا ہونا امکان پذیر ہے، ان مطالب کے جھوٹے ہونے کو عقل کے ذریعہ ثابت کیا جاسکتا ہے، لیکن وحی کی اصلی ضرورت ان مسائل میں ہے کہ جس میں عقل نفی و اثبات کے قابل نہیں ہے اور اس میں اتنی استعداد نہیں ہے کہ ان پیغامات کے صحیح یا باطل ہونے کو ثابت کر سکے، لہذا ایسے موارد میں کس طرح وحی کے پیغامات میں واسطوں کے عہدے یا سموی تصرفات سے محفوظ رہنے کو ثابت کیا جاسکتا ہے؟ اس سوال کا جواب یہ ہے کہ جس طرح سے عقل، حکمت الہی کے پیش نظر، بایمیں درس میں بیان کئے گئے برہان کے مطابق اس امر کو بخوبی درک کرتی ہے کہ وظائف اور حقیقتوں کا پتہ لگانے کے لئے کسی دوسرے راستہ کا ہونا ضروری ہے، اگرچہ اس کی اصلی حقیقت سے وہ بے خبر ہے اور اس طرح یہ بھی درک کرتی ہے کہ حکمت الہی کا تقاضا یہ ہے کہ اس کے پیغامات صحیح و سالم حالت میں لوگوں تک پہنچیں، وگرنہ غیر صحیح و سالم ہونے کی صورت میں نقض غرض لازم آئے گی۔

ایک دوسری تعبیر کے مطابق جب یہ معلوم ہو گیا کہ الہی پیغامات ایک یا چند واسطوں سے لوگوں تک پہنچتے ہیں تاکہ انسان کے اختیاری بحال کا راستہ ہموار رہے، اور بشر کی خلقت سے خدا کا ہدف پورا ہو جائے لہذا صفات کمالیہ الہی سے یہ امر بخوبی روشن ہو جاتا ہے کہ اس کی طرف سے آنے والے تمام پیغامات عہدے یا سموی تصرفات سے محفوظ ہیں، اس لئے کہ اگر خدا یہ ارادہ کر لے کہ اس کے پیغامات بندوں تک سالم نہ پہنچیں، تو یہ حکمت کے خلاف ہوگا، جبکہ خدا کا حکیمانہ ارادہ اس بات کی پوری طرح نفی کرتا ہے، اور اگر خدا اپنے بے کراں علم کے ہوتے ہوئے یہ سمجھ نہ سکے کہ وہ کس طرح اور کن واسطوں سے اپنے پیغامات کو سالم لوگوں تک پہنچائے تو یہ اس کے لامتناہی علم سے سازگار نہیں ہے، اور اگر خائنہ واسطہ پیدا نہ کر سکے اور انھیں شیاطین کے جہم سے محفوظ نہ رکھ سکے تو یہ امر، اس کی لامحدود قدرت سے منافات رکھتا ہے، لہذا چونکہ خدا ہر شے کے بارے میں جانتا ہے لہذا خدا کے لئے یہ تصور نہیں کیا جاسکتا کہ جسے واسطہ بنا رہا ہے، اس کی خطا کاریوں سے بے خبر ہوا اور اسی طرح یہ احتمال بھی باطل ہے کہ اس نے اپنی

^۱ قرآن اس بارے میں فرماتا ہے ”اللَّهُ أَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسَالَتَهُ“ سورة انعام - آیت ۱۲۴

لامحدود قدرت کے ہوتے ہوئے بھی اپنے پیغامات کو شیطین اور عادی یا سہمی تصرفات سے محفوظ نہ رکھ سکا^۱ جس طرح سے کہ حکمت الہی کے پیش نظریہ احتمال بھی باطل ہے کہ اس نے اپنے پیغامات کو لوگوں تک صحیح و سالم نہ پہنچانے کا ارادہ کر لیا ہے، لہذا خدا کا علم، اس کی قدرت و حکمت کا تقاضا یہ ہے کہ وہ اپنے پیغامات کو سالم اور تصرفات سے محفوظ لوگوں تک پہنچائے اور اس طرح وحی کا محفوظ رہنا عقلی برہان کے ذریعہ ثابت ہو جاتا ہے^۲۔

عصمت کی دوسری قسمیں

فرشتوں اور انبیاء [ع] کی وہ عصمت جو دلیل کی بناء پر ثابت ہوتی ہے وحی کے پیغام پر منحصر ہے لیکن عصمت کی دوسری قسمیں بھی ہیں جو اس دلیل کے ذریعہ قابل اثبات نہیں ہیں، جنہیں تین حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے، پہلی قسم فرشتوں سے متعلق ہے، دوسری قسم انبیاء [ع] کی عصمت ہے اور تیسری قسم بقیہ انسانوں، جیسے ائمہ [ع] حضرت مریم، اور حضرت زہراء ۲۸ کی عصمت ہے فرشتوں کی عصمت کے سلسلہ میں ابلاغ وحی کے علاوہ دو مسئلہ پیش کئے جاسکتے ہیں۔

پہلا مسئلہ ان فرشتوں کی عصمت کا ہے، جو دریافت وحی اور اسے رسول تک پہنچانے کے ذمہ دار ہیں دوسرا مسئلہ ان فرشتوں کی عصمت کا ہے، جنہیں وحی سے کوئی سروکار نہیں ہے بلکہ وہ کتابت اعمال، رزق پہنچانے اور قبض اور ارج وغیرہ کے ذمہ دار ہیں۔ اس طرح انبیاء [ع] کی عصمت ان چیزوں کے سلسلہ میں جو ان کی رسالت سے مربوط نہیں ہے اس میں بھی دو مسئلہ ہیں، پہلا مسئلہ یہ ہے کہ انبیاء [ع] کا عادی گناہوں اور سرپیچوں سے محفوظ و مصون رہنا دوسرا مسئلہ انبیاء [ع] کا سو و نیان سے معصوم ہونا ہے اور انہیں دو مسئلہ کو غیر انبیاء [ع] کی عصمتوں میں پیش کئے جاسکتے ہیں۔

^۱ قرآن اس سلسلہ میں فرماتا ہے: (عَلَّمَ الْغَيْبَ فَلَا يُظْهِرُ عَلَى غَيْبِهِ أَحَدًا * إِلَّا مَنِ ارْتَضَىٰ مِنْ رَسُولٍ فَإِنَّهُ يَسْلُكُ مِنْ بَيْنِ يَدَيْهِ وَمَنْ خَلْفَهُ رَصَدًا * لِيَعْلَمَ أَنْ قَدْ أَبْلَغُوا رِسَالَاتِ رَبِّهِمْ وَأَخَاطِبًا لَدَيْهِمْ وَأَحْصَىٰ كُلَّ شَيْءٍ عَدَدًا) سورہ جن۔ آیت/ ۲۸، ۲۶۔

^۲ لِيَهْلِكَ مَنْ هَلَكَ عَنْ بَيِّنَةٍ وَ يُحْيِيَ مَنْ حَيَّ عَنْ بَيِّنَةٍ) سورہ انفال۔ آیت/ ۴۲

^۳ سورہ شعراء۔ آیت/ ۱۹۳۔ سورہ تکویر۔ آیت/ ۲۱۔ سورہ اعراف۔ آیت/ ۶۸۔ سورہ شعراء۔ آیت/ ۱۰۷، ۱۲۵، ۱۴۳، ۱۶۲، ۱۷۸۔ سورہ دخاء۔ آیت/ ۱۸۔ سورہ تکویر۔ آیت/ ۲۰۔ سورہ نجم۔ آیت/ ۵۔ سورہ حاقہ۔ آیت/ ۴۴۔ سورہ جن۔ آیت/ ۲۸، ۲۶۔

لیکن فرشتوں کی عصمت وحی کے ابلاغ کے علاوہ دوسرے مسائل میں دلیل عقلی کے ذریعہ اسی وقت قابل حل ہے کہ جب ملائکہ کی مامت اور ان کی حقیقت معلوم ہو جائے، لیکن ملائکہ کی مامت کا سمجھنا نہ ہی آسان ہے اور نہ ہی اس کتاب کے مناسب اسی وجہ سے فرشتوں کی عصمت کی دلیل میں قرآن سے دو آیتوں کے ذکر پر اکتفا کرتے ہیں، خداوند عالم قرآن کے سورہ انبیاء کی ستائیسویں آیت میں ارشاد فرماتا ہے: (بَلْ عِبَادٌ مُّكْرَمُونَ لَا يَخْتَوْنَ بِالْقَوْلِ وَاَنْهَمُ بِأَمْرِهُ يَعْلَمُونَ) بلکہ فرشتے خدا کے معزز بندے ہیں وہ لگشگو میں اس سے سبقت نہیں کر سکتے اور وہ اس کے حکم پر چلتے ہیں۔

اور اسی طرح سورہ تحریم کی چھٹی آیت میں ارشاد فرماتا ہے: (لَا يَعْصُونَ اللَّهَ مَا أَمَرَهُمْ وَيَفْعَلُونَ مَا يُؤْمَرُونَ) خدا جس بات کا حکم دیتا ہے اس کی نافرمانی نہیں کرتے اور جو حکم انھیں ملتا ہے اسے بجا لاتے ہیں۔ یہ دو آیتیں پوری صراحت کے ساتھ اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ ملائکہ منتخب مخلوق ہیں، جو فرمان الہی کے مطابق اعمال انجام دیتے ہیں اور کبھی بھی اس کے فرمان سے روگردانی نہیں کرتے، اگرچہ ان آیتوں کی عمومیت تمام فرشتوں کی عصمت کو شامل ہے۔

لیکن انبیاء علیہ السلام کی عصمت کے علاوہ بقیہ انسانوں کی عصمت کے سلسلہ میں بحث کرنا مباحث امامت سے سازگار ہے اسی وجہ سے اس حصہ میں انبیاء علیہ السلام کی عصمت کے تحت بحث کریں گے اگرچہ ان میں سے بعض مسائل کو تنہا نقلی اور تعبیدی مسائل کے ذریعہ حل کیا جاسکتا ہے اور اصولی اعتبار سے اسے کتاب و سنت کی حجت ثابت ہونے کے بعد ذکر ہونا چاہئے لیکن موضوعات کی مناسبت سے اسی مقام پر اس کے سلسلہ میں بحث کریں گے اور کتاب و سنت کی حجت کی بحث کو اصل موضوع کے عنوان سے قبول کرتے ہوئے اسے اسی مقام پر ذکر کرتے ہیں۔

انبیاء علیہ السلام کی عصمت

گروہ مسلمین میں اس مسئلہ کے تحت شدید اختلافات ہیں کہ انبیاء علیہ السلام ہوں گے مقابلہ میں کس حد تک معصوم ہیں، اثنا عشری شیعوں

کا عقیدہ ہے کہ انبیاء [ع] اپنے آغاز ولادت سے آخری لمحہ حیات تک تمام گناہوں سے پاک ہوتے ہیں، بلکہ بھولے سے بھی کوئی گناہ نہیں کرتے لیکن اہل سنت کی بعض جماعتوں نے عصمت انبیاء [ع] کو گناہان کبیرہ کے مقابلہ میں مانا ہے، بعض نے دوران بلوغ سے اور بعض نے کہا کہ بعثت کے بعد سے معصوم ہوتے ہیں، بلکہ اہل سنت کے بعض فرقوں (حشویہ اور اہل حدیث) کے اعتقاد کے مطابق (انبیاء [ع] ہر قسم کی عصمت سے عاری ہیں، ان سے گناہان کبیرہ صادر ہو سکتا ہے بلکہ وہ نبی ہوتے ہوئے بھی عدا گناہ کر سکتے ہیں۔ انبیاء علیہم السلام کی عصمت کو ثابت کرنے سے پہلے ہمیں چند نکات کی طرف اشارہ کرنا لازم ہے پہلا نکتہ یہ ہے کہ انبیاء [ع] اور غیر انبیاء میں سے بقیہ انسانوں کے معصوم ہونے کا مطلب صرف گناہوں سے معصوم ہونا نہیں ہے بلکہ اس بات کا امکان ہے کہ ایک معمولی انسان خصوصاً کم عمر ہونے کی وجہ سے کوئی گناہ انجام نہ دے۔

بلکہ مطلب یہ ہے کہ نہایت طاقتور ملکہ نفسانی کے مالک ہیں، کہ جو سخت سے سخت شرائط و حالات میں اپنے آپ کو محفوظ رکھتے ہیں اور یہ ملکہ گناہوں کی آلودگیوں سے آگاہی، شکست ناپذیر ارادہ، اور نفسانی خواہشوں کو مہار کرنے کے نتیجہ میں حاصل ہوتا ہے، اور چونکہ یہ ملکہ عنایت الہی کے ذریعہ حاصل ہوتا ہے لہذا اس کی فاعلیت کو خدا کی جانب نسبت دی جاتی ہے، وگرنہ ایسا ہرگز نہیں ہے کہ خدا معصوم انسان (انبیاء و آئمہ) کو زبردستی گناہوں سے محفوظ رکھتا ہے یا اس سے اختیار کو چھین لیتا ہے ان لوگوں کی عصمت جو منصب الہی، جیسے نبوت و امامت سے متصف ہیں مراد یہ ہے، کہ خدا نے گناہوں سے محفوظ رہنے کی ضمانت انہیں دے دی ہے۔ دوسرا نکتہ یہ ہے کہ کسی بھی شخص کی عصمت کا لازمہ یہ ہے کہ وہ تمام حرام اعمال کو ترک کر دے، جیسے کہ وہ گناہ جو تمام شریعتوں میں حرام ہیں، یا وہ امور جو خود اسی کے زمانہ کی شریعت میں حرام ہوں، لہذا انبیاء [ع] کی عصمت ان اعمال کے ذریعہ خدشہ دار نہیں ہوتی جو اس کی شریعت یا خود اس کے لئے جائز ہوں یا وہی عمل گذشتہ شریعت میں حرام ہو یا بعد میں حرام کر دیا جائے۔ تیسرا نکتہ یہ ہے کہ گناہ سے مراد یہ ہے، کہ جس سے ایک معصوم محفوظ رہتا ہے ایک ایسا عمل ہے کہ جسے فقہ میں حرام کہا جاتا ہے اور اسی طرح اس عمل کو ترک کرنا کہ جسے فقہ میں واجب کہا جاتا ہے۔ لیکن گناہ کے علاوہ دوسرے کلمات جیسے (عیان) (ذنب)

وغیرہ وسیع معنی میں استعمال ہوتے ہیں کہ جس میں ترکِ اولیٰ بھی شامل ہے اور ایسے گناہوں کا انجام دینا عصمت کے خلاف نہیں ہے۔

سوالات

- ۱۔ کس طرح وحی کو کسی بھی قسم کے خلل سے محفوظ رہنے کو ثابت کیا جاسکتا ہے؟
- ۲۔ دریافتِ وحی اور ابلاغ میں محفوظ رہنے کے علاوہ کن مقامات پر عصمت ضروری ہے؟
- ۳۔ فرشتوں کی عصمت کیسے ثابت کی جاسکتی ہے؟
- ۴۔ انبیاءِ عظیم السلام کی عصمت کے سلسلہ میں کتنے اقوال ہیں؟ اور اہل تشیع کا نظریہ کیا ہے؟
- ۵۔ عصمت کی تعریف کریں اور اس کے لوازمات بیان کریں؟

پچھواں درس

انبیاء [ع] کے معصوم ہونے کی دلیلیں

مقدمہ

شیعوں کے معروف اور قطعی عقائد میں سے انبیاء [ع] کا عہدی اور سوہی گناہوں سے معصوم ہونے کا عقیدہ ہے جس کی ائمہ علیہم السلام نے اپنے پیروکاروں کو تعلیم دی ہے اور اپنے مختلف بیانات کے ذریعہ دشمنوں کے اقوال کو باطل قرار دیا ہے ائمہ علیہم السلام کا عصمت انبیاء [ع] کے سلسلہ میں اپنے دشمنوں سے احتجاجات میں سے سب سے زیادہ مشہور امام رضا علیہ السلام کا احتجاج ہے جو کتب حدیث اور تاریخ میں درج ہے۔ لیکن مباح امور میں انبیاء علیہم السلام کا سوہ و نیان باعث اختلاف رہا ہے اور ائمہ علیہم السلام کی جانب سے وارد ہونے والی روایات اختلاف سے خالی نہیں ہیں، جس کے سلسلہ میں تحقیق و جستجو اس بحث کی وسعت سے خارج ہے، لیکن اتنا مسلم ہے کہ اسے ضروری اعتقادات میں سے شمار نہیں کیا جاسکتا، اور وہ دلائل جو انبیاء علیہم السلام کی عصمت کے تحت بیان کئے گئے ہیں دو حصوں میں تقسیم ہوتے ہیں۔

۱۔ عقلی دلائل۔

۲۔ نقلی دلائل۔

اگرچہ اس بحث میں زیادہ تر اعتماد نقلی دلائل پر کیا گیا ہے، ہم یہاں دو دلیلوں کے بیان کرنے پر اکتفا کرتے ہیں اور اس کے بعد کچھ قرآنی دلائل کو ذکر کریں گے۔

عصمت انبیاء علیہم السلام عقلی دلائل

انبیاء علیہم السلام کا گناہوں کے ارتکاب سے معصوم رہنے پر پہلی عقلی دلیل یہ ہے کہ ان کی بعثت کا پہلا ہدف انسانوں کو ان حقائق اور وظائف کی طرف ہدایت کرنا ہے جسے خدا نے انسانوں کے لئے معین فرمایا ہے، درحقیقت یہ لوگ انسانوں کے درمیان خدا کے نمائندے ہیں، کہ جنہیں لوگوں کو راہ راست کی طرف ہدایت کرنا ہے، لہذا اگر ایسے نمائندے دستورات خدا کے پابند نہ ہوں اور اپنی رسالت کے برخلاف اعمال کے مرتکب ہوں تو لوگ ان کے اعمال کو ان کی گفتار سے جدا کہیں گے اور اس طرح لوگوں کا اعتماد ان کی گفتار پر ختم ہو جائے گا اور یوں ان کی بعثت کا ہدف مکمل نہ ہو سکے گا، لہذا حکمت الہی کا تقاضا یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام کا تمام گناہوں سے دور ہوں بلکہ سو و نیان کی بنیاد پر کوئی نا شائستہ عمل بھی انجام نہ دیں، تاکہ لوگوں کو یہ گمان ہونے لگے کہ انہوں نے سو و نیان کو گناہوں کے ارتکاب کے لئے بہانہ بنالیا ہے۔ عصمت انبیاء علیہم السلام پر دوسری عقلی دلیل یہ ہے کہ وہ وحی کو لوگوں تک پہنچانے اور انہیں راہ مستقیم کی طرف ہدایت کرنے کے علاوہ ان پر لوگوں کی تربیت اور تزکیہ کی بھجب ذمہ داری ہے تاکہ وہ مستعد افراد کو کمال کے آخری منازل تک لے جائیں یا ایک دوسری تعبیر کے مطابق تعلیم اور ہدایت کے وظیفہ کے علاوہ وظیفہ تربیت کے بھی ذمہ دار ہیں، اور وہ بھی ایسی تربیت جو سماج کے برجستہ اور عاقل حضرات کو بھی شامل ہوتی ہے۔

لہذا ایسے مقامات انہیں لوگوں کے لئے شائستہ ہیں کہ جو انسانی کمالات کے اعلیٰ مقامات پر فائز ہوں اور ملکہ نفسانی (ملکہ عصمت) کے عظیم درجہ پر فائز ہو۔ اس کے علاوہ مربی کا کردار افراد کی تربیت کرنے میں، اس کی گفتار سے کہیں زیادہ موثر ہوتا ہے اور وہ افراد جو کردار کے اعتبار سے عیوب اور نقائص کے حامل ہوتے ہیں ان کی گفتار بھی مطلوب تاثیر سے برخوردار نہیں ہو سکتی، لہذا انبیاء علیہم السلام کی بعثت اس عنوان کے تحت کہ وہ سماج کے مربی ہیں اسی صورت میں قابل تحقیق ہے کہ جب ان کا کردار اور ان کی گفتار ہر قسم کی خطا سے محفوظ ہو۔

عصمت انبیاء علیہم السلام پر نقلی دلائل

۱۔ قرآن کریم بعض انسانوں کو مخلص^۱ (جنہیں خدا کے لئے خالص کر دیا گیا ہو) کے نام سے یاد کرتا ہے یہاں تک کہ ابلیس بھی انہیں گمراہ کرنے کی طمع نہیں رکھتا جیسا کہ قرآن نے اُس کے قول کو نقل کیا ہے کہ وہ تمام انسانوں کو گمراہ کرے گا لیکن مخلصین اُس کی دسترس سے خارج ہیں۔ سورہ ص کی آیت نمبر (۸۲، ۸۳) میں ہے: (قَالَ فَبِعِزَّتِكَ لَا يَتَّبِعُكُمْ أَجْمَعِينَ * إِلَّا عِبَادُكَ الْمُخْلَصِينَ) وہ بولا تیری ہی عزت و جلال کی قسم ان میں سے تیرے خالص بندوں کے سوا سب کو گمراہ کروں گا۔ اور بے شک ابلیس کا انہیں گمراہ نہ کرنے کی طمع اُس عصمت کی وجہ سے ہے جو انہیں گناہوں سے مقابلہ میں حاصل ہے، وگرنہ وہ تو ان کا بھی دشمن ہے اگر اُسے موقع مل جائے تو انہیں بھی گمراہ کئے بغیر نہ چھوڑے۔

۲۔ قرآن انبیاء علیہم السلام کی اطاعت کو مطلق قرار دے رہا ہے جیسا کہ سورہ نساء کی آیت (۶۴) میں فرماتا ہے: (وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ رُسُلٍ إِلَّا لِيُطَاعَ بِإِذْنِ اللَّهِ) اور ہم نے کوئی رسول نہیں بھیجا مگر اس واسطے کہ خدا کے حکم سے لوگ اس کی اطاعت کریں۔ اور ان لوگوں کی مطلق اطاعت اسی صورت میں صحیح ہے کہ جب ان کی اطاعت اطاعت خدا ہو، اور ان کی پیروی کرنا اطاعت خدا کے خلاف نہ ہو وگرنہ ایک طرف خدا کی اطاعت کا حکم اور دوسری طرف ان لوگوں کی اطاعت کا حکم جو خطاؤں سے محفوظ نہیں ہیں غرض کے خلاف ہوگا۔

^۱ اس بات کی طرف توجہ ہے کہ مخلص لام کے فتح کے ساتھ، مخلص لام کے کسرہ کے ساتھ جدا ہے، مخلص لام کے فتح کے ساتھ کا مطلب یہ ہے کہ خدا نے شخص کو خالص بنادیا ہو، اور مخلص لام کے کسرہ کے ساتھ اس کا مطلب یہ ہے کہ شخص نے اپنے اعمال اخلاص کے ساتھ انجام دیے ہوں۔

لہذا عنوان (مخلص) عنوان (معصوم) کے مساوی ہے، اگرچہ ہمارے پاس اس صفت کا انبیاء [ع] سے مخصوص ہونے کے لئے کوئی دلیل نہیں ہے لیکن اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ یہ صفت انبیاء [ع] کو بھی حاصل ہے جیسا کہ خود قرآن نے بعض انبیاء [ع] کو مخلصین میں سے شمار کیا ہے سورہ ص کی آیت (۴۶، ۴۵) میں فرماتا ہے:

(وَإِذْكَرْ عِبْدَنَا إِبْرَاهِيمَ وَ إِسْحَاقَ وَ يَعْقُوبَ أُولَى الْأَيْدِي وَالْأَبْصَارِ *)

إِنَّا أَخْلَصْنَاهُمْ بِخَالِصَةٍ ذَكَرْنَاهُ الْذَّارِ

اے رسول! ہمارے بندوں میں ابراہیم اسحاق اور یعقوب [ع] کو یاد کرو جو قوت و بصیرت والے تھے ہم نے ان کو ایک خاص صفت کی یاد سے ممتاز کیا تھا۔

اور سورہ مریم کی (۵۱) آیت میں فرماتا ہے:

(وَإِذْكَرْ فِي الْكِتَابِ مُوسَى إِنَّهُ كَانَ مُخْلَصًا وَ كَانَ رَسُولًا نَبِيًّا)

اے رسول! قرآن میں موسیٰ کا تذکرہ کرو اس میں شک نہیں کہ وہ میرا برگزیدہ اور بھیجا ہوا صاحب شریعت نبی تھا۔

اس کے علاوہ قرآن نے یوسف علیہ السلام کا سخت ترین لحظات میں محفوظ رہنے کو ان کے

مخلص ہونے سے نسبت دے رہا ہے جیسا کہ سورہ یوسف کی آیت (۲۴) میں فرماتا ہے:

(كَذَٰلِكَ لِنُصْرِفَ عَنْهُ السُّوءَ وَالْفَحْشَاءَ إِنَّهُ مِنْ عِبَادِنَا الْمُخْلَصِينَ)

ہم نے اُس کو یوں بچایا تا کہ ہم اس سے بُرائی اور بدکاری کو دور رکھیں بے شک وہ ہمارے مخلص بندوں میں سے تھا۔

۳۔ قرآن نے الہی منصبوں کو انہیں لوگوں سے مخصوص جانا ہے، کہ جن کے ہاتھ ظلم سے آلودہ نہ ہوں، جیسا کہ قرآن حضرت ابراہیم علیہ السلام کے جواب میں فرماتا ہے، کہ جب انھوں نے منصب امامت کی اپنی اولاد کے لئے درخواست کی (لَا يَنْالُ عَهْدِي الظَّالِمِينَ) فرمایا ہاں! مگر میرے اس عہد پر ظالموں میں سے کوئی شخص فائز نہیں ہو سکتا۔ اور ہمیں بخوبی معلوم ہے کہ ہر گناہ نفس پر ایک ظلم ہے اور قرآن کی زبان میں ہر گنہگار ظالم ہے، پس انبیاء الہی جو منصب الہی کے ذمہ دار ہوتے ہیں، ہر قسم کے گناہ اور ظلم سے پاک ہوتے ہیں۔

عصمت انبیاء علیہ السلام کا راز

اس درس کے اختتام پر بہتر ہے کہ ہم انبیاء علیہ السلام کے معصوم ہونے کے اسرار کی طرف ایک مختصر اشارہ کر دیں، لہذا انبیاء علیہم السلام کا وحی کو حاصل کرنے میں معصوم ہونے کا راز یہ ہے کہ اصولاً وحی کو درک کرنا خطا بردار اور اکات سے ممکن نہیں ہے اور جو بھی اسے حاصل کر لینے کی صلاحیت سے سرفراز ہو، وہ ایک ایسے علم کی حقیقت کا مالک ہے جسے وہ اپنے سامنے حاضر پاتا ہے، اور وحی سے اس کا رابطہ ہوتا ہے، خواہ وہ وحی لانے والا فرشتہ ہو یا کوئی اور ہو بخوبی اسے مشاہدہ کرتا ہے^۱ اور اس بات کا کوئی امکان نہیں ہے کہ وحی حاصل کرنے والا شک میں مبتلا ہو جائے کہ اس پر وحی ہوئی ہے یا نہیں؟ یا کس نے اس پر نازل کی ہے؟ یا وحی کے مطالب کیا ہیں؟ اور اگر بعض من گھڑت جو کچھ انہوں نے دیکھا ان کے دل نے جھوٹ نہ جانا۔ داستانوں میں آیا ہے کہ مثلاً کسی نبی نے اپنی نبوت میں شک کیا یا وحی کے مطلب کو بھلا دیا یا وحی نازل کرنے والے کو پہچان نہ سکا، یہ سب کچھ صاف بہتان ہے اور ایسے بہتان بالکل اسی طرح ہیں کہ کوئی اپنے وجود یا کسی حضوری اور وجدانی امر کے تحت شک کرے!! لیکن انجام وظائف (لوگوں تک پیغام الہی کے پہنچانے) میں انبیاء علیہم السلام کی عصمت کے راز کو بیان کرنے کے لئے ایک مقدمہ کی ضرورت ہے اور وہ یہ ہے کہ انسان کے اختیاری افعال اس صورت میں انجام پاتے ہیں، کہ جب انسانوں کے باطن میں اس کے انجام دینے میں

^۱ سورۃ بقرہ آیت ۱۲۴۔

^۲ قرآن اس سلسلہ میں فرماتا ہے: (مَا كَذَّبَ الْفُؤَادُ مَا رَأَى) سورۃ نجم۔ آیت ۱۱

رجحان ہو، جو مختلف اسباب و عوامل کے نتیجہ میں پیدا ہوتا ہے اور ایک شخص علم اور مختلف ادراکات کے ذریعہ مطلب تک پہنچنے والے راستہ کو معین کرتا ہے۔ اور اسی کے مطابق امور کو انجام دیتا ہے لیکن جب اس میں متضاد رجحان ہوں تو اس صورت میں وہ بہترین کو انتخاب کرنے کی کوشش میں رہتا ہے، لیکن کبھی کبھی علوم کی کمزوری بہترین کو معین کرنے میں خطا سے دوچار ہونے کا سبب بن جاتی ہے یا بہترین سے غفلت یا ہست ترین شی سے انس اشتباہ کا سبب بن جاتا ہے صحیح فکر اور صحیح انتخاب کا موقع نہیں مل پاتا۔ لہذا انسان جس قدر حقائق سے آشنا ہو، اور حقائق کے تحت زیادہ سے زیادہ توجہ سے سرفراز ہو، نیز اس کے علاوہ باطنی ہیجانات اور ہنگاموں کو مہار کرنے میں عظیم قدرت سے سرفراز ہو تو وہ اتنا ہی حسن انتخاب میں کامیاب ہوگا، اور خطاؤں سے اسی انداز سے کے مطابق محفوظ رہے گا۔

یہی وجہ ہے کہ وہ لوگ جو متعدد، و راستہ، عقل و عینش سے سرفراز ہونے کے علاوہ صحیح تربیت میں پہلے، بڑھے ہیں وہ فضیلت و کمال کے درجات حاصل کر لیتے ہیں، یہاں تک کہ اس راہ میں مرتبہ عصمت تک بھی پہنچ جاتے ہیں، اور ان کے ذہنوں میں گناہ کا خیال تک نہیں آتا، جیسا کہ کوئی بھی عاقل شخص اپنے ذہن میں زہر کو پینے یا غلاظتوں کے کھانے کی فکر کو نہیں لاتا، اسی طرح یہ لوگ بھی گناہوں کے ارتکاب کی فکر اپنے ذہن میں نہیں لاتے۔ اب اگر ہم یہ فرض کر لیں کہ ایک شخص کی استعداد حقائق کو سمجھنے میں بے نہایت اور روح کی طہارت و پاکیزگی کے اعتبار سے عظیم مقامات پر فائز ہے اور قرآن کی تصویر کے مطابق وہ روغن زیتون کی طرح زلال نیز خالص اور شعلہ ور ہونے کے نزدیک ہو بغیر اس کے کہ وہ کسی شعلہ سے ارتباط برقرار کرے (یکاد ذیہما یضئٰی و لولم تمہ نار) اور اسی قوی استعداد اور روح کی پاکیزگی کی وجہ سے خدا کی تربیت میں پرہان چڑھے اور خدا اس کی روح القدس کے ذریعہ مدد کرے، ایسا شخص غیر قابل وصف کمالات کے مدارج کو طے کرتا ہے بلکہ ہزاروں سال طولانی راستہ کو ایک شب میں طے کر لیتا ہے، دوران طفولیت بلکہ شکم مادر میں، ہر ایک پر، اسے برتری حاصل ہوگی، ایسے شخص کی نگاہ میں گناہوں کی حقیقت اسی طرح اٹھکا رہے

جس طرح دوسروں کے لئے زہر پینے اور غلامتوں کو کھانے کی حقیقت۔ اور جس طرح عادی و معمولی افراد کا ایسے کاموں سے پرہیز جبری نہیں ہے اسی طرح معصوم کا گناہوں سے بچنا کسی بھی صورت میں ان کے اختیار کے خلاف نہ ہوگا۔

سوالات

- ۱۔ انبیاءِ عظیم السلام کی عصمت کو عقلی دلائل کے ذریعہ ثابت کریں؟
- ۲۔ قرآن کی کون سی آیات انبیاء [ع] کی عصمت پر دلالت کرتی ہیں؟
- ۳۔ وحی کو بیان کرنے میں انبیاء [ع] کے معصوم ہونے کا راز کیا ہے؟
- ۴۔ انبیاء [ع] کا گناہوں سے بچنا کیسے ان کے اختیار سے سازگار ہے؟

چھیواں درس

چند شبہات کا حل

چند شبہات کا حل

انبیاء علیہم السلام کی عصمت کے سلسلہ میں چند شبہات پیش کئے گئے ہیں کہ جن کے جوابات ہم اسی درس میں بیان کریں گے۔ پہلا شبہ یہ ہے کہ اگر خدا نے انبیاء علیہم السلام کو گناہوں کے ارتکاب سے روک رکھا ہے جس کا لازمہ وظائف کو انجام دینا بھی ہے تو پھر اس صورت میں انبیاء علیہم السلام کے لئے اختیاری امتیاز باقی نہیں رہتا، اور گناہوں سے بچنے کی جزا اور وظائف کو انجام دینے کی صورت میں کسی بھی پاداش کے مستحق نہیں رہ جاتے، اس لئے کہ اگر خدا انبیاء کے علاوہ کسی اور کو معصوم قرار دیتا تو وہ بھی انہیں کی طرح ہوتے۔ اسی شبہ کا جواب گذشتہ بیانات کی روشنی میں اٹھکا رہے ہیں کہ ملازمہ یہ ہے کہ معصوم ہونے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وظائف کو انجام دینے کے لئے اور گناہوں سے پرہیز کرنے کے لئے ان پر جبر کیا گیا ہو جیسا کہ گذشتہ درس میں یہ مطلب روشن ہو چکا ہے، اور خدا کا انہیں معصوم رکھنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ان سے اختیاری افعال کی نسبت چھین لی جائے اگرچہ تمام موجودات نہایت خدا کے ارادہ تکوینی کے دائرے میں ہیں، چنانچہ جب خدا کی جانب سے کوئی خاص وضاحت ہو تو امور کو اس کی طرف نسبت دینا ایک جدا صورت ہے، لیکن خدا کا ارادہ، ارادہ انسان کے طول میں ہے نہ کہ اس کے عرض میں (یعنی انسان کا ارادہ وہی خدا کا ارادہ ہے نہ کہ خدا کا ارادہ اور انسان کا ارادہ دو مستقل امر ہوں) اور نہ ہی انسان کا ارادہ خدا کے ارادہ کا جانشین ہے۔

اور معصومین کی بہ نسبت خدا کی خاص عنایت ہے تو جس طرح خاص ابواب و شرائط سنگین ذمہ داریوں کا سبب بنتے ہیں، اسی طرح یہ خاص توجہ بھی سنگین ذمہ داریوں کا سبب ہے، جس طرح وظائف کو انجام دینے کی جزا زیادہ ہوگی اسی طرح اس کی مخالفت کی سزا

بھی زیادہ ہوگی، اسی طرح جزا و سزا کے درمیان اعتدال برقرار ہو جاتا ہے، اگرچہ ایک معصوم کبھی بھی اپنے اختیار سے کسی سزا کا مستحق نہیں ہو سکتا اور ایسے اعتدال کی مثالیں ان تمام لوگوں میں دیکھی جاسکتی ہیں کہ جو خاص نعمتوں سے سرفراز ہیں جیسا کہ علماء اور خاندان رسالت اسے وابستہ حضرات کی ذمہ داریاں زیادہ ہیں لہذا جزا یا سزا بھی اتنی ہی زیادہ ہوگی^۱ اسی وجہ سے جو جتنا بلند ہوتا ہے اس کے سقوط کے امکانات اتنے ہی زیادہ ہوتے ہیں۔ دوسرا شبہ یہ ہے کہ معصومین اور انبیاء علیہم السلام کی طرف سے جو دعاؤں میں وارد ہوئے ہیں ان میں ان حضرات نے اپنے آپ کو گنہگار کہا ہے اور اپنے گناہوں سے استغفار کرتے تھے پس ایسے اعترافات کے ہوتے ہوئے کیسے ان کے معصوم ہونے کو تسلیم کیا جاسکتا ہے؟

اس شبہ کا جواب یہ ہے کہ حضرات معصومین علیہم السلام جو درجات کے اختلاف کے ساتھ کمال و قرب کے عظیم مقامات پر فائز تھے اپنے لئے دوسروں کے وظائف سے کہیں عظیم وظائف کے قائل تھے بلکہ معبود کے علاوہ کسی غیر کی طرف معمولی توجہ کو بھی عظیم گناہ شمار کرتے تھے اسی وجہ سے ہمیشہ استغفار کیا کرتے تھے اور جیسا کہ یہاں ذکر کیا جا چکا ہے کہ انبیاء علیہم السلام کی عصمت کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ حضرات ان امور کے ارتکاب سے محفوظ ہیں جنہیں گناہ کا نام دیا جاتا ہے بلکہ ان کے معصوم ہونے کا مطلب واجبہ تکالیف کی مخالفت اور محرمات فہمی کے مرتکب ہونے سے محفوظ رہنے کا نام ہے۔ تیسرا شبہ یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام کی عصمت پر قرآنی دلائل میں سے ایک دلیل یہ ہے کہ وہ مخلصین میں سے ہیں اور شیطان کو انہیں گمراہ کرنے کی بھی کوئی طمع نہیں ہے، حالانکہ خود قرآن سے بعض مقامات پر انبیاء علیہم السلام کے سلسلہ میں شیطان کی طرف سے کئے گئے تصرفات کو بیان کیا گیا ہے: (يَا بَنِي آدَمَ لَا يَتَّبِعْكُمُ الشَّيْطَانُ كَمَا أَخْرَجَ أَبُوكُم مِّنَ الْجَنَّةِ ۚ) اس آیت میں شیطان کا آدم و حوا علیہما السلام کو دھوکا دینا اور ان کا بہشت سے نکل جانے کو قرآن شیطان کی طرف نسبت دے رہا ہے، اور سورہ ص کی آیت (۴۱) میں جناب ایوب علیہ السلام کی زبانی نقل فرماتا ہے: (اِذْ

^۱ قرآن کریم اس سلسلہ میں فرماتا ہے: (يَا نِسَاءَ النَّبِيِّ لَسْتُنَّ كَأَحَدٍ مِّنَ النِّسَاءِ)

سورہ احزاب - آیت ۳۰/۳۲۔

^۲ جیسا کہ روایت میں وارد ہوا ہے 'يَغْفِرُ لِلْجَابِلِ سَبْعُونَ ذَنْبًا قَبْلَ أَنْ يُغْفَرَ لِلْعَالَمِ ذَنْبٌ وَاحِدٌ'۔

^۳ سورہ اعراف - آیت ۲۷

ناذی رَبِّ اَنِّیْ مُنِّی الْاِیْطَانُ بُصْبِ وَ عَذَابِ) جب ایوب علیہ السلام نے اپنے پروردگار سے فریاد کی کہ مجھے شیطان نے بہت تکلیف و اذیت پہنچا رکھی ہے۔ اس کے علاوہ سورہ حج کی آیت (۵۲) میں شیطان کی طرف انبیاء علیہم السلام پر القائنات کو ثابت کرتا ہے، جیسا کہ فرماتا ہے: (وَمَا اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رُّسُولٍ وَلَا نَبِیٍّ اِلَّا اِذَا تَمَنَّی الْاِیْطَانُ فِیْ اٰمِنَتِهٖ) اور اے رسول اللہ ﷺ ہم نے تو آپ سے پہلے جب کبھی کوئی رسول اور نبی بھیجا تو یہ ہوا، جس وقت اس نے تبلیغ دین کی آرزو کی تو شیطان نے ان کی آرزو میں خلل ڈالا، اور لوگوں کو گمراہ کیا۔ اس شبہ کا جواب یہ ہے کہ ان تمام آیات میں شیطان کے تصرف کے نتیجہ میں انبیاء علیہم السلام کا واجب تکالیف سے مخالفت کی طرف اشارہ نہیں کیا گیا ہے اور سورہ اعراف کی (۲۷) آیت میں شجرہ منہیہ کے سلسلہ میں جس وسوسہ کی طرف اشارہ ہوا ہے، اس میں اس درخت سے نہ کھانے کی کوئی تحریم نہیں تھی، بلکہ جناب آدم و حوا سے اتنا کہہ دیا گیا تھا کہ اگر اس درخت سے کھاؤ گے تو جنت سے نکال کر زمین کی طرف بھیج دئے جاؤ گے، اور شیطان و وسوسہ اس امر سے مخالفت کا سبب بنا، اس کے علاوہ وہ جس عالم میں تھے وہ عام تکلیف (ارشادی) تھی وہاں کوئی شریعت نہیں تھی کہ جس کے وہ پابند ہوتے، اور سورہ ص کی (۴۱) آیت میں ان مصیبتوں کی طرف اشارہ ہے کہ جو شیطان کی وجہ سے جناب ایوب پر نازل ہوئی تھیں، اور آپ کے متعلق کسی بھی امر کے مخالفت کی طرف کوئی معمولی اشارہ بھی نہیں ہے، اور سورہ حج کی (۵۲) آیت میں ان رکاوٹوں کی طرف اشارہ ہے کہ جو انبیاء علیہم السلام کے اہداف میں شیطان ایجاد کرتا تھا، اور ان کی تکلیف کا باعث بنتا تھا، یہاں تک کہ خدا اس کے مکر کو باطل کر دیتا ہے اور اپنے دین کو قائم کر دیتا ہے۔

چوتھا شبہ یہ ہے کہ قرآن کے سورہ طہ کی (۱۲۱) آیت میں نسبت عصیان اور اسی طرح اسی سورہ کی آیت (۱۱۵) میں نیان کی نسبت جناب آدم کی طرف دی جا رہی ہے، لہذا ایسی نسبتیں ان کی عصمت سے کیسے سازگار ہیں؟ اس شبہ کا جواب یہ ہے کہ گذشتہ بیان سے واضح ہے کہ یہ عصیان اور نیان واجب تکالیف میں سے نہیں تھے کہ گناہ حساب کئے جائے۔ پانچواں شبہ یہ ہے کہ قرآن کے بعض مقامات پر جھوٹ کی نسبت انبیاء علیہم السلام کی طرف دی گئی ہے جیسا کہ سورہ صافات کی آیت (۸۹) میں جناب ابراہیم علیہ

السلام کی زبانی فرماتا ہے: (تَالِ اِنِّیْ سَقِیْمٌ) انھوں نے کہا کہ میں بیمار ہوں۔ حالانکہ جب جناب ابراہیم نے یہ جملہ کہا مریض نہ تھے اور اسی طرح آپ ہی کی زبانی سورۃ انبیاء کی آیت (۶۳) میں فرماتا ہے: (قَالَ بَلْ فَكِدْ كَيْدُكُمْ) بلکہ ان بتوں کو ان کے بڑے خدا نے توڑا ہے۔ حالانکہ خود جناب ابراہیم علیہ السلام نے بتوں کو منہدم کیا تھا، اور اسی طرح سورۃ یوسف کی آیت (۷۰) میں فرماتا ہے: (ثُمَّ اٰذُنْ مُوْؤَذْنِ اٰیْہِئَا الْعِیْرُ اَنْتُمْ لَسَارِقُوْنَ) پھر ایک منادی لکار کے بولا کہ اے قافلہ والو یقیناً تم ہی لوگ چور ہو۔ ان شبہات کا جواب یہ ہے کہ بعض روایتوں کے مطابق یہ سب ”توریہ“ سے ہے اہم ترین مصلحتوں کے لئے بولا جاتا ہے اور اس مطلب کو خود قرآن کی آیتوں سے ثابت کیا جاسکتا ہے، جیسا کہ جناب یوسف کی داستان میں فرماتا ہے: (کَذٰلِکَ کَدٰنَا یُوسُفَ) ہر حال ایسے جھوٹ عصیان اور گناہ حساب نہیں کئے جاتے۔ چھٹا شبہ یہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی داستان میں آیا ہے کہ جناب موسیٰ نے اس قبطی کو مار ڈالا جو ایک بنی اسرائیل کے ساتھ جھگڑ رہا تھا، اسی وجہ سے آپ مصر سے فرار کر گئے، اور جب خدا نے آپ کو فرعون کی جانب مبعوث کیا تو آپ نے بارگاہ خدا میں عرض کی: (وَلَمْ عَلٰی ذَنْبٍ فَاَخَافُ اَنْ یَّتَّخِلُوْنَ) اس کے علاوہ ان کے لئے میری گردن پر ایک جرم ہے مجھے خوف ہے کہ وہ مجھے قصاصاً قتل نہ کر دیں۔

اور جب فرعون نے اس قتل کی نسبت آپ کی طرف دی تو فرمایا: (قَالَ فَعَلْتُمْ اِذَا وَاَنَا مِنَ الصّٰلِحِیْنَ) ہاں میں نے اس کام کو انجام دیا جب میں حالت غفلت میں تھا۔ یہ داستان کس طرح انبیاء علیہم السلام کی عصمت بلکہ بعثت سے پہلے معصوم ہونے سے سازگار ہے۔ اس شبہ کا جواب یہ ہے کہ قبطی کا قتل عمدی نہیں تھا بلکہ ایک مشی کی وجہ سے تھا کہ جسے صرف دور کرنے کے لئے مارا تھا، اس کے علاوہ (وَلَمْ عَلٰی ذَنْبٍ) کا جملہ فرعونوں کے گمان کے مطابق ہے اور اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ مجھے گنہگار سمجھتے ہیں اور مجھے ڈر ہے کہ کہیں وہ مجھے قصاص میں قتل نہ کر ڈالیں اور (وَاَنَا مِنَ الصّٰلِحِیْنَ) کا جملہ فرعون سے ہم کلامی کے دوران کہا ہے کہ میں اس بعثت سے پہلے ایسے براہین سے بے خبر تھا اور اب دلیل قاطع کے ساتھ مبعوث ہوا ہوں یا ضلال کا مطلب یہ ہے کہ میں

^۱ سورۃ شعراء۔ آیت ۱۴/

^۲ سورۃ شعراء آیت ۲۰۔

اس عمل کے انجام سے بے خبر تھا، ہر حال کسی بھی صورت میں جناب موسیٰ کا واجبی تکالیف سے مخالفت، ان جملوں سے ثابت نہیں ہوتی۔

ساتواں شبہ یہ ہے کہ سورہ یونس کی آیت (۹۴) میں خدا اپنے رسول ﷺ کو مخاطب کرتے ہوئے فرماتا ہے: (فَإِنْ كُنْتُمْ فِي شَكٍّ مِمَّا أَنْزَلْنَا إِلَيْكَ فَاسْأَلِ الَّذِينَ يَقْرَأُونَ الْكِتَابَ مِنْ قَبْلِكَ لَقَدْ جَاءَكَ الْحَقُّ مِنْ رَبِّكَ فَلَا تَكُونُ مِنَ الْمُمْتَرِينَ) پس جو ہم نے تمہاری طرف نازل کیا ہے اگر اس کے بارے میں تم کو کچھ شک ہو تو جو لوگ تم سے پہلے کتاب خدا پڑھا کرتے ہیں ان سے پوچھ کر دیکھو تمہارے پاس پروردگار کی طرف سے کتاب آچکی ہے تم ہرگز شک کرنے والوں میں سے نہ ہونا۔ اسی طرح سورہ بقرہ کی آیت (۱۳۷)، سورہ آل عمران کی آیت (۶۰) سورہ انعام کی آیت ۱۱۴، سورہ ہود کی آیت (۱۷) اور سورہ سجدہ کی آیت (۲۳) میں آنحضرت ﷺ کو شک و تردید سے منع فرماتا ہے، پس کس طرح یہ کہا جاسکتا ہے کہ وحی کو درک کرنا غیر قابل شک ہے۔ اس شبہ کا جواب یہ ہے کہ یہ آیات اس بات پر دلالت نہیں کرتیں کہ آپ نے کوئی شک کیا ہو بلکہ صرف اس مطلب کو بیان کرتی ہیں کہ آنحضرت کی رسالت اور قرآن کریم کی حقانیت میں کوئی شک و تردید نہیں ہے، دراصل ایسے بیانات ”ایاک أَعْنَى وَاسْعَى يَ جَارَةً“ میں سے ہے۔ آٹھواں شبہ یہ ہے کہ قرآن میں آنحضرت ﷺ کی طرف بعض گناہوں کی نسبت دی گئی ہے جنہیں خدا نے بخش دیا جیسا کہ فرماتا ہے: (لِيَغْفِرَ لَكَ اللَّهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِكَ وَمَا تَأَخَّرَ) تاکہ خدا تمہاری امت کے اگلے اور پچھلے گناہ معاف کر دے اس شبہ کا جواب یہ ہے کہ ان آیتوں میں (ذنب) سے مراد وہ گناہ ہیں جنہیں مکہ کے مشرکین ہجرت سے پہلے اور اس کے بعد قائل تھے کہ آپ نے ان کے خداؤں کی توہین کی ہے اور مغفرت سے مراد، ان آثار کو دفع کرنا ہے کہ جن کے مترتب ہونے کا امکان تھا، اور اس مطلب پر دلیل، فتح مکہ کو معاف کردینے کی علت شمار کی ہے جیسا کہ فرماتا ہے: (إِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُبِينًا) ۲ اے رسول ﷺ! یہ حدیبیہ کی صلح نہیں بلکہ ہم نے حقیقتاً تم کو کھلم کھلا فتح عطا کی۔

۱ سورہ فتح - آیت ۲

۲ سورہ فتح - آیت ۱۷

اب یہ امر واضح ہو گیا ہے کہ اگر اس گناہ سے مراد اصطلاحی گناہ ہوتا تو بخشش کی علت میں فح کہ کو بیان کرنے کوئی وجہ نہ تھی۔
 نواں شبہ یہ ہے کہ قرآن کریم: جناب زید کی مطلقہ سے آنحضرت کے شادی کرنے کی داستان کی طرف اشارہ کر رہا ہے، جب کہ زید پیغمبر ﷺ کے منہ بولے فرزند تھے۔ (وَتَحْشَى النَّاسَ وَاللَّهُ اعْلَىٰ شَأْنُهُ) اور تم لوگوں سے ڈرتے تھے حالانکہ خدا کا زیادہ حق تھا کہ تم اس سے ڈرو۔ ایسی تعمیر مقام عصمت سے کیسے سازگار ہے اس شبہ کا جواب یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ کو صرف اور صرف اس بات کا ڈر تھا، کہ کہیں خدا کے اس دستور پر عمل کرنے اور جاہلیت کی رسومات میں سے ایک (گود لئے بچوں کو حقیقی بچوں جیسا سمجھنا) رسم توڑنے کی وجہ سے تھا کہ کہیں مسلمان ضعف ایمان کی وجہ سے اس عمل کو نفسانی خواہشات کا نتیجہ نہ سمجھ بیٹھیں اور ان کے دین سے نکل جانے کا باعث نہ بنے خدا اس آیت میں اپنے رسول ﷺ کو باخبر کرتا ہے کہ ارادہ الہی کے ساتھ اس سنت شکنی کی مصلحت یعنی ایسی رسومات سے ڈٹ کر مقابلہ کرنا اس طرح کے غلط تصور سے زیادہ سزاوار ہے لہذا اس آیت میں آنحضرت ﷺ کو کسی بھی قسم کی کوئی سرزنش نہیں کی گئی ہے۔ دسواں شبہ یہ ہے کہ قرآن نے دو مقام پر آنحضرت ﷺ پر عتاب (ملامت و سرزنش) کی ہے، ان میں سے پہلا مقام یہ ہے کہ جب رسول نے بعض افراد کو جنگ میں شرکت نہ کرنے کی اجازت دی تو خدا نے فرمایا: (عَفَا اللَّهُ عَنْكَ لِمَ أَذِنْتُ لَكُمُ) اے رسول! خدا تم سے درگزر فرمائے تم نے انہیں بھیجے رہ جانے کی اجازت ہی کیوں دی اور بعض حلال امور میں اپنی بعض ازواج کی جلب رضایت کے لئے فرمایا: (يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَا أَحَلَّ اللَّهُ لَكَ مَتَعَيْنِي مَرَضَاتٍ ازْوَاجِكَ) اے رسول! جو چیز خدا نے تمہارے لئے حلال کی ہے تم اس سے اپنی بیویوں کی خوشنودی کے لئے کیوں کنارہ کشی کرتے ہو ایسے عتاب آپ کی عصمت سے کیسے سازگار ہیں؟

اس شبہ کا جواب یہ ہے کہ ایسے بیانات دراصل عتاب کی شکل میں پیغمبر کی مدح میں ہیں جو آنحضرت کی بے نہایت عذوفت اور مہربانی پر دلالت کرتے ہیں یہاں تک کہ آپ نے منافقوں کو بھی ناامید نہیں کیا، اور ان کے اسرار کو فاش نہیں کیا نیز اپنی ازواج

۱ سورۃ احزاب - آیت ۳۷

۲ سورۃ توبہ - آیت ۴۳

۳ سورۃ تحریم - آیت ۱

کی خواہشوں کو اپنی خواہش پر مقدم رکھا، اور ایک مباح فعل کو قسم کے ذریعہ اپنے اوپر حرام کر لیا تھا اور پیغمبر کا ایسا کرنا (معاذ اللہ) اس لئے نہیں تھا کہ حکم خدا کو بدل دیں، اور لوگوں کے لئے حلال کو حرام کر دیں۔ دراصل یہ آیات ان آیات سے نہایت مشابہ ہیں کہ جس میں منافقوں کی ہدایت کے لئے آپ کی دسوزی کی طرف اشارہ کیا گیا ہے: (لَعَلَّكَ بَانِعٌ نَفْسِكَ أَلَّا يَكُونُوا مُؤْمِنِينَ) اے رسول ﷺ شاید اس فکر میں تم اپنی جان ہلاک کر ڈالو گے کہ یہ کفار، مومن کیوں نہیں ہو جاتے۔ یا ان آیات سے مشابہ ہیں کہ جو عبادت کی خاطر زحماتوں کے تحمل کرنے کی طرف اشارہ کرتی ہیں (طہ * مَا أُنْزِلْنَا عَلَيْكَ الْقُرْآنَ لِتَشْقَى) اے رسول ﷺ ہم نے تم پر قرآن اس لئے نازل نہیں کیا، کہ تم اس قدر مشقت اٹھاءو بہر حال یہ مقامات عصمت کے خلاف نہیں ہیں۔

سوالات

۱۔ ایک معصوم کو دو سروسوں پر کیسے امتیازی اختیارات حاصل ہیں؟ وہ اعمال جو عصمت الہی کی بنا پر انجام دیئے جائیں اور کس جزا کے مستحق ہیں؟

۲۔ کیوں انبیاء اور اولیاء [ع] اپنے آپ کو گنہگار سمجھتے اور استغفار کرتے تھے؟

۳۔ انبیاء علیہم السلام کے سلسلہ میں شیطان کے تصرفات ان کی عصمت سے کیسے سازگار ہیں؟

۴۔ قرآن میں حضرت آدم علیہ السلام کی طرف جس نیان اور عصیان کی نسبت دی گئی ہے وہ آپ کی عصمت سے کیسے سازگار ہے؟

۵۔ اگر سارے انبیاء [ع] معصوم ہیں تو پھر حضرت ابراہیم علیہ السلام اور جناب یوسف علیہ السلام نے کیوں جھوٹ بولے؟

^۱ سورۃ شعراء۔ آیت / ۳

^۲ سورۃ طہ۔ آیت / ۱، ۲

۶۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے سلسلہ میں موجودہ شبہ اور اس کے جواب کو ذکر کریں؟

۷۔ اگر وحی کے ادراک میں کوئی خطا واقع نہیں ہو سکتی تو پھر کیوں خدا بار بار اپنے رسول ﷺ کو آپ کی رسالت میں شک و تردید سے منع کر دیا ہے؟

۸۔ سورہ فتح میں آنحضرت کی طرف جس گناہ کی نسبت دی گئی ہے وہ کیونکر آپ کی عصمت سے سازگار ہے؟

۹۔ جناب زید کی داستان کے متعلق شبہات اور جوابات بیان کریں؟

۱۰۔ حضرت رسول ﷺ کی نسبت قرآن میں جو عتاب وارد ہوا ہے وہ کیا ہے؟ اور اس کا جواب کیا ہے؟

تائیمواں درس

معجزہ

نبوت کو ثابت کرنے کے راستے

نبوت کے بنیادی مسائل میں سے ایک تیسرا مسئلہ یہ ہے کہ سچے پیغمبروں کے دعوے کی صداقت اور جھوٹے نبیوں کے دعوے کا بطلان کیسے ثابت ہو؟ اس امر میں کوئی شک نہیں ہے کہ اگر کوئی فرد گناہوں میں آلودہ ہو، کہ جس کی قباحت کو عقل بھی بخوبی درک کرتی ہے، ایسا شخص کسی بھی صورت میں قابل اعتماد نہیں ہو سکتا، خصوصاً اس وقت یہ اعتماد محال ہو جاتا ہے، کہ جب وہ عقل کے خلاف کسی امر کی طرف دعوت دے یا اس کی باتوں میں تناقض و اختلاف پایا جاتا ہو۔ اس کے علاوہ اس امر کا بھی امکان ہے کہ اس شخص کے گزشتہ حالات ایسے ہوں کہ بے غرض افراد اس کی باتوں پر اعتماد کر لیں، خصوصاً جب عقل بھی اس کی باتوں کی تصدیق کر رہی ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ ایک فرد کی پیغمبری کسی دوسرے رسول کی پیشینگوئی کے ذریعہ ثابت ہو جائے اور وہ بھی اس طرح ثابت ہو جائے کہ حقیقت کے طلبکاروں کے لئے شک و تردید کا مقام باقی نہ رہ جائے۔

لیکن جب لوگوں کے پاس اطمینان بخش قرائن نہ ہوں، نیز ان کے پاس کسی نبی کی بشارت یا تائید بھی موجود نہ ہو، تو انھیں نبوت کے اثبات کے لئے دوسرے راستے اختیار کرنے پڑیں گے، لہذا خدا نے اس مشکل کو حل کرتے ہوئے اپنے رسولوں کو معجزے عطا کئے تاکہ یہ معجزے ان کے دعوے کو ثابت کرنے میں ان کی مدد کریں اسی وجہ سے انھیں آیات کے نام سے یاد کیا گیا ہے۔ نتیجہ۔ کسی نبی کے دعوے کو ثابت کرنے کے لئے تین راستے ہیں۔ ۱۔ اطمینان بخش قرائن کے ذریعہ، لیکن یہ صرف ان نبیوں کے

^۱ کلمہ آیات مختلف معانی میں استعمال ہوتا ہے جیسے علم و قدرت، حکمت، موجودات خواہ وہ عادی ہوں یا غیر عادی۔

متعلق صحیح ہے جنہوں نے لوگوں کے درمیان سالہا سال زندگی گزاری ہو، اور ایک عظیم شخصیت کے مالک ہوں لیکن اگر کوئی نبی ایام جوانی یا اپنی شخصیت کی پہچان سے پہلے وہ مبعوث بہ رسالت ہو جائے تو اس نبی کے دعوے کو اس راہ کے ذریعہ ثابت نہیں کیا جاسکتا۔

۲۔ گذشتہ نبی نے آنے والے نبی کی خبر دی ہو، یہ راستہ بھی انہیں لوگوں سے مخصوص ہے کہ جنہوں نے اس سے پہلے کسی نبی کی معرفت حاصل کر لی ہو اور اس کی جانب سے آنے والے نبی کی تائید یا بشارت سنی ہو۔

۳۔ معجزہ، یہ راستہ نہایت مفید اور تمام مقامات پر مفید ہے، لہذا اس کے بارے میں مزید وضاحت پیش کرتے ہیں۔

معجزہ کی تعریف

معجزہ یعنی ایک ایسا غیر عادی عمل، جو ارادہ خداوند کے مطابق نبوت کا دعویٰ کرنے والے شخص کی جانب سے صادر ہو اور اس کے دعوے کو ثابت کرے۔ جیسا کہ آپ نے ملاحظہ کیا کہ یہ تعریف تین مطالب پر مشتمل ہے۔ الف: غیر عادی امور کا وجود، جو عادی اسباب کے ذریعہ وجود میں نہیں آتے۔ ب: غیر عادی امور میں سے بعض ارادہ الہی اور اس کی اجازت سے واقع ہوتے ہیں۔ ج: ایسے غیر عادی امور کسی پیغمبر کے دعوے کی صداقت کی علامت بن سکتے ہیں اسی وجہ سے اصطلاح میں اس کو ”معجزہ“ کہا جاتا ہے۔

خارق عادت امور

جو موجودات بھی اس کائنات میں وجود میں آتے ہیں عموماً وہ سب کے سب کسی نہ کسی اسباب و علل کا نتیجہ ہوتے ہیں جنہیں آزمائشات کے ذریعہ پہچانا جاسکتا ہے جیسے کہ فزیک، یا لوجی، کیمسٹری اور روحی علوم میں ترکیبات کے نتیجہ میں وجود میں آنے والے موجودات کی جزئیات کا علم ہو جاتا ہے لیکن بعض نادر مواقع میں وجود میں آنے والے بعض موجودات کا وجود میں آنا، بالکل

متفاوت ہوتا ہے، جس کے تمام اسباب و علل کو حسی آزمائشات کے ذریعہ معلوم نہیں کیا جاسکتا، بلکہ صرف کچھ ایسے شواہد مل جاتے ہیں کہ جو اس بات کی خبر دیتے ہیں کہ اس طرح کے موجودات کے پائے جانے میں کوئی دوسری علت کار فرما ہے، جیسے کہ مرتاضوں (کے دریافت کرنے والوں) کے حیرت انگیز کام مختلف علوم کے ماہرین کا کہنا ہے کہ ایسے امور مادی اور تجربی قوانین کے تحت وجود میں نہیں آتے، لہذا اسے وہ ”خارق عادت“ کا نام دیتے ہیں۔

الہی خارق عادت امور

غیر عادی امور کو دو حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے خارق عادت امور کی ایک قسم، ایسے اسباب و علل پر مشتمل ہوتی ہے جو عادی تو نہیں لیکن بشر کے اختیار میں ضرور ہیں، جسے تعلیم اور تمرین کے ذریعہ حاصل کیا جاسکتا ہے جیسے کہ مرتاضوں کے غیر عادی امور، خارق عادت امور کی دوسری قسم: صرف اذن پروردگار سے وقع ہوتی ہے کہ جس کے اختیارات کبھی بھی ان لوگوں کے سپرد نہیں کئے جاتے جو اس سے مربوط نہ ہوں، اسی وجہ اس کی دو خصوصیات پیش کی گئی ہیں، ایک تو یہ کہ یہ اس قابل نہیں کہ اس کو سیکھا اور سکھایا جاسکے دوسرے یہ کہ کسی طاقت و قوت سے مرغوب نہیں ہوتے، ایسے غیر عادی امور اس کے خاص بندوں سے مخصوص ہیں، جسے کبھی بھی ہوس باز اور گمراہ افراد کے سپرد نہیں کیا جاسکتا، لیکن یہ صرف انبیاء [ع] سے مخصوص نہیں ہے، بلکہ اولیاء الہی بھی اس سے سرفراز ہوتے ہیں، اسی وجہ سے علم کلام میں تمام خارق عادت امور کو معجزہ نہیں کہا جاتا، لہذا وہ خارق عادت امور جو انبیاء [ع] کے علاوہ اولیاء کرام سے صادر ہوتے ہیں انہیں کرامت کہا جاتا ہے، اسی طرح غیر عادی علوم بھی وحی نبوت سے مخصوص نہیں ہیں، لہذا جب ایسے علوم انبیاء [ع] کے علاوہ دوسروں کو عطا کئے جاتے ہیں تو اسے الہام یا تحدیث یا انہیں جیسا دوسرا نام دیا جاتا ہے۔ اس بحث کے ضمن میں خارق عادت امور (الہی اور غیر الہی) دو نوعیت سے جانے جا سکتے ہیں، یعنی اگر خارق عادت امور کو انجام دینا قابل تعلیم و تعلم ہوتا یا کسی دوسرے میں اتنی طاقت ہوتی کہ ان کے درمیان موانع یا خلل ایجاد کر دے یا اس کے اثر کو باطل کر دے تو کسی بھی صورت میں یہ خدا کی جانب سے خارق العادہ امور کے حامل نہیں

ہو سکتے تھے، جب کہ کسی شخص کی بد اخلاقی اور تباہ کاری کو خدا سے رابطہ نہ ہونے کی دلیل اور اس کے امور کے نفسانی یا شیطانی ہونے کو ثابت کیا جاسکتا ہے۔ اس مقام پر مناسب ہے کہ ایک دوسرے نکتہ کی طرف اشارہ کر دیا جائے کہ خارق العادہ امور کا فاعل، خدا کو قرار دیا جاسکتا ہے (اگرچہ تمام مخلوقات منجملہ عادی موجودات کی فاعلیت کی نسبت بھی اسی کی طرف ہے) اس اعتبار سے اس کا محقق ہونا خدا کے اذن خاص پر موقوف ہے اور انھیں واسطوں سے فرشتہ یا انبیاء [ع] کی طرف نسبت دی جاسکتی ہے اس لحاظ سے اس کی حیثیت یا واسطہ یا فاعل قریب کی ہے، جس طرح سے کہ قرآن میں مردوں کو زندہ کرنا، بیماروں کو شفاء دینا اور پرندوں کے خلق کرنے کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی طرف نسبت دی گئی ہے 'الہذا ان دونوں نسبتوں کے درمیان کوئی تضاد نہیں ہے اس لئے کہ خدا کی فاعلیت بندوں کی فاعلیت کے طول میں ہے۔

انبیاء [ع] کے معجزات کی خصوصیات

معجزہ کی تعریف میں جس تیسرے مطلب کی طرف اشارہ ہوا ہے وہ یہ ہے کہ انبیاء [ع] کے معجزے ان کے دعوے کے صحیح ہونے کی علامت ہیں، اسی وجہ سے جب کسی خارق عادت امر کہ جسے علم کلام میں معجزہ کہا جاتا ہے خدا کی اجازت پر منحصر ہونے کے علاوہ پیغمبروں کی پیغمبری کی دلیل ہوتے ہوئے اس کے مفہوم میں معمولی تبدیلی کے ساتھ ان خارق عادت امور کو بھی شامل ہو جاتا ہے جسے امامت کو ثابت کرنے کے لئے انجام دیا جاتا ہے، اور اس طرح کرامت کی اصطلاح ان خارق عادت امور سے مخصوص ہو جاتی ہے جو اوصیاء الہی سے صادر ہوتے ہیں، جو ایسے غیر عادی امور کے مقابلہ میں ہے جس کا انحصار نفس اور شیطان پر ہو جیسے سحر، کمانت اور مرتاضوں کے افعال یہ قسم قابل تعلیم و تعلم ہے اور طاقتور عوامل کے مقابلہ میں مغلوب بھی ہو سکتے ہیں اور اس کا خدا کی جانب سے نہ ہونے کے سبب ان کے انجام دینے والوں کو گنہگار اور فاسد عقیدے سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ اس مقام پر جس نکتہ کی طرف توجہ لازم ہے وہ یہ ہے کہ انبیاء [ع] کے معجزات جس چیز کو براہ راست ثابت کرتے ہیں، وہ انبیاء [ع] کی

^۱ سورۃ رعد۔ آیت ۳۷۔ سورۃ غافر۔ آیت ۷۸

^۲ سورۃ آل عمران۔ آیت ۴۹۔ سورۃ مائدہ۔ آیت ۱۱۰

نبوت کا دعویٰ ہے، لیکن رسالت کے پیغامات کا صحیح ہونا اور ان کے احکامات کی پیروی کرنا بھی براہ راست اس سے ثابت ہو جاتا ہے، یا ایک دوسری تعبیر کے مطابق انبیاء علیہم السلام کی نبوت عقلی دلیل اور ان کے پیغامات تبدیلی دلائل کے ذریعہ ثابت ہوتے ہیں۔^۱

سوالات

۱۔ سچے پیغمبروں کو کن راستوں سے پہچانا جاسکتا ہے اور ان راستوں میں کیا فرق ہے؟

۲۔ جھوٹے نبیوں کی پہچان کیا ہے؟

۳۔ معجزہ کی تعریف کریں؟

۴۔ خارق العادت امور کیا ہیں۔؟

۵۔ الہی خارق العادہ امور اور غیر الہی خارق العادہ امور میں کیا فرق ہے؟

۶۔ الہی خارق عادت امور کو کن راہوں سے ثابت کیا جاسکتا ہے؟

۷۔ الہی خارق عادت امور کے درمیان انبیاء [ع] کے معجزات کی خصوصیات کیا ہیں؟

۸۔ معجزہ اور کرامت کی اصطلاح کو بیان کریں؟

۹۔ معجزہ خدا کا کام ہے یا رسول ﷺ کا؟

۱۰۔ معجزہ پیغمبروں کے سچے ہونے کی دلیل ہے یا ان کے پیغامات کے صحیح ہونے کی؟

^۱ اسی کتاب کے چوتھے اور چوبیسویں درس کی طرف رجوع کیا جائے۔

اٹھائیسواں درس

چند شبہات کا حل

چند شبہات کا حل

مسئلہ اعجاز کے سلسلہ میں چند شبہات ہیں کہ جن کے جوابات اس درس میں دئے جائیں گے۔ پہلا شبہ یہ ہے کہ ہمیشہ مادی موجودات کا وجود میں آنا، کسی خاص علت کی بنیاد پر ہوتا ہے کہ جنہیں علمی آزمائشات کے ذریعہ معلوم کیا جاسکتا ہے، اور کسی موجود کی علتوں کا نا شناختہ رہ جانا، اس موجود کے لئے علت نہ ہونے پر دلیل نہیں ہے، لہذا خارق عادت امور کو اس عنوان سے قبول کیا جاسکتا ہے کہ وہ ناشناختہ علل و عوامل کے ذریعہ وجود میں آئے ہیں، اور جب تک ان امور کے علل و اسباب ناشناختہ ہیں اس وقت تک انہیں حیرت انگیز امور میں شمار کیا جاسکتا ہے، لیکن قابل شناخت علتوں کا انکار علمی آزمائشوں کے ذریعہ اصل علیت کے نقض کے معنی میں ہے اور غیر قابل قبول ہے۔

اس شبہ کا جواب یہ ہے کہ اصل علیت کا صرف تقاضا یہ ہے کہ کسی بھی وابستہ موجود، یا معلول کے لئے علت کا ہونا ضروری ہے، لیکن تمام علتوں کا آزمائشوں کے ذریعہ قابل شناخت ہونا کسی بھی صورت میں اصل علیت کا لازمہ نہیں ہے اور اس لازمہ کے لئے کوئی دلیل بھی نہیں ہے اس لئے کہ علمی آزمائش امور طبعی میں محدود ہیں، اور کسی بھی صورت میں ماوراء طبعیت امور کے وجود، یا عدم یا اس کی اثرگذاری کو آزمائش و سیلہ کے ذریعہ ثابت نہیں کیا جاسکتا۔ لیکن اعجاز کی تفسیر ناشناختہ علتوں سے آگاہی کے معنی میں صحیح نہیں ہے، اس لئے کہ اگر یہ آگاہی عادی علتوں کے ذریعہ حاصل ہوئی ہو تو اس میں اور بقیہ عادی موجودات میں کوئی فرق نہیں ہونا چاہیے اور کسی بھی صورت میں اسے خارق عادت امر نہیں کہا جاسکتا، اور اگر آگاہی غیر عادی طریقہ سے حاصل ہوئی ہو تو اسے خارق عادت امور میں سے شمار کیا جائے، لیکن جب وہ اذن الہی پر منحصر اور نبوت کی دلیل ہو تو معجزہ کی قسموں میں شامل ہے،

جب کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا لوگوں کے ذخائر اور خوراک سے آگاہی آپ کے معجزات میں سے تھا لیکن معجزہ کو صرف اسی ایک قسم میں منحصر نہیں کیا جاسکتا، اس اعتبار سے کہ بقیہ اقسام کی نفی کر دی جائے لیکن پھر بھی یہ سوال اپنی جگہ باقی ہے کہ ایسے امور اور بقیہ خارق عادت امور میں اصل علت کے اعتبار سے فرق کیا ہے؟ دو سراسر شبہ یہ ہے کہ خدا کی ہمیشہ یہ سنت رہی ہے کہ وہ کسی بھی موجود کو کسی خاص علت کے سہارے وجود میں لاتا ہے، اور قرآن کی آیتوں کے مطابق سنت الہی قابل تغیر نہیں ہے^۱۔ لہذا خارق عادت امور سنت الہی میں تغیر و تبدل کا سبب نہیں، مذکورہ آیتوں کی بنیاد پر یہ بات غیر قابل قبول ہے؟ یہ شبہ بھی گذشتہ شبہ سے مشابہ ہے بس فرق اتنا ہے کہ گذشتہ شبہ میں عقلی دلائل استعمال ہوئے تھے اور اس شبہ میں قرآنی آیت کا سہارا لیا گیا ہے اس شبہ کا جواب یہ ہے کہ موجودات کے علل و اسباب کو عادی علل و اسباب میں منحصر سمجھنے کو تغیر ناپذیر سنت الہی کا جز سمجھنا بے بنیاد بات ہے، اس کی مثال ایسی ہی ہے، جیسے کوئی یہ دعویٰ کرے کہ علت حرارت کا آگ میں منحصر ہونا خدا کی تغیر ناپذیر سنتوں میں سے ہے، ایسے دعوؤں کے مقابلہ میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ مختلف معلومات کے لئے مختلف علتوں اور اسباب عادی کے لئے غیر عادی اسباب کا جمع ہونا ایک ایسا امر ہے جو ہمیشہ دیکھا گیا ہے

اور اس وجہ سے اسے سنت الہی کا جزء شمار کرنا چاہیے اور اسباب کے عادی اسباب میں منحصر ہونے کو اس کے لئے ایک قسم کا تغیر سمجھنا چاہیے کہ کی قرآن نے نفی کی ہے۔ بہر حال ان آیتوں کی تفسیر کرنا جو سنت الہی کے تغیر ناپذیر ہونے پر دلالت کرتی ہیں، اس صورت میں کہ عادی اسباب کا جانشین قبول نہ کرنا اس عنوان کے تحت ہے کہ وہ خدا کی تغیر ناپذیر سنتوں میں سے ایک بے بنیاد تفسیر ہے، بلکہ بہت سی وہ آیات جو معجزات اور خارق عادت امور کے ہونے پر دلالت کرتی ہیں، اس تفسیر کے باطل ہونے کے لئے ایک محکم دلیل، بلکہ ان آیتوں کی صحیح تفسیر کو تفسیر کی کتابوں میں تلاش کرنا ہوگا اور ہم اس مقام پر صرف ایک اجمالی اشارہ کریں گے کہ یہ آیات، معلول کی اپنی علت سے مخالفت نہ کرے پر دلالت کرتی ہیں نہ یہ کہ علتوں کا متعدد ہونا یا علت عادی کی جگہ

^۱ سورۃ آل عمران۔ آیت / ۴۹۔

^۲ سورۃ بنی اسرائیل، آیت / ۷۷، سورۃ احزاب۔ آیت / ۶۲۔ سورۃ فاطر۔ آیت / ۴۳۔ سورۃ فتح۔ آیت / ۲۳۔

علت غیر عادی کے آجانے کی نفی کرتی ہیں بلکہ شاید یہ کہا جاسکتا ہے کہ تاحد یقین اسباب کی تاثیر اور غیر عادی علل ان آیتوں کے موارد میں سے ہیں۔ تیسرا شبہ یہ ہے کہ قرآن کے مطابق لوگ بارہا رسول اکرم ﷺ سے معجزہ کی درخواست کرتے تھے اور آنحضرت ایسی خواہشوں کے جواب سے خودداری فرماتے تھے لہذا اگر معجزہ نبوت کو ثابت کرنے کا وسیلہ ہے تو پھر کیوں آنحضرت ﷺ اس وسیلہ کے استعمال سے خودداری فرماتے تھے؟ اس شبہ کا جواب یہ ہے کہ ایسی آیتیں ان درخواستوں سے مربوط ہیں جو اتمام حجت اور (صحیح قرائن صدق، گذشتہ انبیاء علیہ السلام کی بشارتیں، اور معجزات کے ذریعہ آپ کی نبوت کے اثبات کے بعد) ضد اور عناد کی وجہ سے کی جاتی تھیں^۱ اور حکمت الہی کا تقاضا یہ تھا کہ ایسی خواہشوں کا جواب نہ دیا جائے۔

مزید وضاحت: معجزہ اس جہان میں موجدہ نظام کے درمیان ایک علیحدہ مسئلہ ہے جسے لوگوں کی خواہشوں کو پورا کرے (جیسے ناقہ حضرت صالح -) اور کبھی بطور ابتدائی (جیسے حضرت عیسیٰ کے معجزات) انجام دیا جاتا تھا، لیکن اس کا ہدف خدا کے انبیاء علیہ السلام کو پہنچانا اور لوگوں پر حجت کو تمام کرنا تھا، لہذا معجزہ کا پیش کرنا رسولوں کی دعوتوں کو جبراً قبول کرنے اور ان کے احکامات کے سامنے مجبوراً تسلیم ہو جانے کے لئے نہیں تھا اور نہ ہی وقت گزارنے کے لئے ایک کھیل اور عادی اسباب و مسببات میں ہنگامہ ایجاد کرنے کے لئے تھا، اور ایسے ہدف کے ہوتے ہوئے ایسی خواہشوں کا جواب کبھی نہیں دیا جاسکتا، بلکہ ایسی خواہشوں کا جواب دینا حکمت کے خلاف ہوگا، یہ خواہشیں ان درخواستوں سے مشابہ ہیں کہ جو ایسے امور سے مربوط تھیں کہ جس کی وجہ سے راہ اختیار ختم ہو جاتا، اور لوگوں کو انبیاء علیہم السلام کی دعوت قبول کرنے کے لئے مجبور ہونا پڑتا، یا ان درخواستوں کی طرح ہیں کہ جنہیں عناد اور دشمنی یا حقیقت طلبی کے علاوہ کسی دوسرے اغراض کے تحت پیش کئے کرتے تھے، اس لئے کہ ایسی درخواستوں کا جواب دینے کی وجہ سے معجزات کھلونا بن جاتے اور عوام اسے اپنے لئے وقت گزارنے کا بہترین وسیلہ تصور کر لیتی، یا اپنے شخصی منافع حاصل کرنے کے لئے رسول ﷺ کے پاس جمع ہو جاتی، اور دوسری طرف آزادانہ اختیار و انتخاب کا راستہ بند ہو جاتا، اس کے علاوہ لوگ

^۱ سورۃ انعام۔ آیت / ۳۷ سورۃ یونس۔ آیت / ۲۰ سورۃ رعد۔ آیت / ۷ سورۃ انبیاء۔ آیت / ۵

^۲ سورۃ انعام۔ آیت / ۳۵ سورۃ طہ۔ آیت / ۱۳۳ سورۃ صافات۔ آیت / ۱۴ سورۃ قمر۔ آیت / ۲ سورۃ شعراء۔ آیت / ۴۳ سورۃ اسراء۔ آیت / ۵۹ سورۃ روم۔ آیت / ۵۸

مجبور ہو کر انبیاء علیہم السلام کی اطاعت قبول کرتے، اور یہ دونوں صورتیں معجزات کے پیش کرنے کی حکمت کے خلاف ہیں، لیکن ان مقامات کے علاوہ جہاں حکمت الہی کا تقاضا ہو، وہاں ان کی خواہشوں کا جواب دے دیا جاتا تھا جیسا کہ رسول اکرم ﷺ کے بے شمار معجزات قطعی سند کے ساتھ ثابت ہیں، جن میں ہر ایک سے واضح اور جاودانی قرآن کریم ہے کہ جس کی وضاحت انشاء اللہ آئندہ آئے گی۔ چوتھا شبہ یہ ہے کہ معجزہ چونکہ اذن الہی پر منحصر ہے جو اس بات کی علامت ہو سکتا ہے کہ خدا اور معجزہ دکھانے والے کے درمیان خاص ارتباط پایا جاتا ہے اس لئے کہ اُسے خدا نے یہ خاص اجازت عنایت کی ہے، یا ایک دوسری تفسیر کے مطابق اس نبی نے اپنی خواہش اور عمل کو اُس کے ارادہ کے ذریعہ تحقق بخشا ہے، لیکن ایسے ارتباطات کا عقلی لازمہ یہ نہیں ہے کہ اُس میں اور خدا کے درمیان اُس ارتباط کے علاوہ دوسرے ارتباطات بھی پائے جاتے ہوں لہذا معجزہ کو دعویٰ نبوت کے صحیح ہونے پر دلیل عقلی نہیں مانا جاسکتا، بلکہ اُسے صرف ایک غنی اور قانع کر دینے والی دلیل کا نام دیا جاسکتا ہے۔

اس شبہ کا جواب یہ ہے کہ خارق عادت امور اگرچہ الہی کیوں نہ ہوں، خود بخود رابطہ وحی کے ہونے پر دلالت نہیں کرتے اسی وجہ سے اولیاء علیہم السلام کی کرامت کو ان کے نبی ہونے کی دلیل نہیں مانی جاسکتی لیکن یہاں بحث اس شخص کے سلسلہ میں ہے جس نے نبوت کا دعویٰ کیا ہے اور اپنے دعویٰ کو ثابت کرنے کے لئے معجزہ دکھایا ہے اب اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ اس نے نبوت کا جھوٹا دعویٰ کیا ہے، جو عظیم اور بدترین گناہوں میں سے ہونے کے علاوہ دنیا و آخرت میں تباہی کا موجب بھی ہے، اُس میں ہرگز خدا سے ایسے ارتباط کے برقرار ہونے کی صلاحیت نہیں ہو سکتی، اور خدا کبھی بھی ایسے فرد کو معجزہ کی قدرت عطا نہیں کر سکتا کہ جس کی وجہ سے لوگ گمراہ اور بد بخت ہو جائیں نتیجہ: عقل بخوبی درک کرتی ہے کہ صرف وہی شخص خدا سے خاص ارتباط برقرار کرنے اور معجزہ کی قدرت سے سرفراز ہونے کی صلاحیت رکھتا ہے کہ جو اپنے مولا سے خیانت نہ کرے اور اسکے بندوں کی گمراہی اور بد بختی کا موجب نہ بنے، لہذا معجزہ کا پیش کرنا دعویٰ نبوت کے صحیح ہونے پر ایک قاطع دلیل عقلی ہے۔

^۱ سورۃ انعام۔ آیت / ۲۱، ۹۳، ۱۴۴ سورۃ یونس۔ آیت / ۱۷ سورۃ ہود۔ آیت / ۱۸ سورۃ کہف۔ آیت / ۱۵ سورۃ عنکبوت۔ آیت / ۶۸ سورۃ شوری۔ آیت / ۲۴

^۲ سورۃ الحاقہ۔ آیت / ۴۴، ۴۶

سوالات

- ۱۔ اصل علیت کا مطلب کیا ہے؟ اور اسکا لازمہ کیا ہے؟
- ۲۔ کیوں اصل علیت کو مان لینا اعجاز کو قبول کرنے کے خلاف نہیں ہے؟
- ۳۔ کیوں اعجاز کی تفسیر ناشائستہ علتوں سے آگاہی کے معنی میں صحیح نہیں ہے؟
- ۴۔ کیا اعجاز کو قبول کر لینا تغیر ناپذیر سنت الہی کے خلاف نہیں ہے؟ کیوں؟
- ۵۔ کیا انبیاء علیہم السلام ابتداء امر میں معجزات پیش کرتے تھے یا جب لوگوں کی طرف سے درخواست ہوئی تو اس وقت اپنا معجزہ پیش کرتے تھے؟
- ۶۔ کیوں انبیاء علیہم السلام معجزہ کے حوالے سے بعض خواہشوں کا جواب نہیں دیتے تھے؟
- ۷۔ اس امر کی وضاحت کریں کہ معجزہ ایک دلیل غنی اور اقناعی نہیں ہے بلکہ ادعاء نبوت کے سچے ہونے پر ایک عقلی دلیل ہے؟

انبیاء و ائمہ

انبیاء علیہم السلام کی خصوصیات

انبیاء علیہم السلام کی کثرت

اب تک ہم نے مسائل نبوت میں سے تین مسئلہ کے تحت بحث کی ہے اور اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ دنیا و آخرت کی سعادت حاصل کرنے میں ان معلومات کا بنیادی نقش ہے کہ جنہیں معلوم کرنے میں علوم بشری ناکافی ہیں، اس مسئلہ کے تحت حکمت الہی کا تقاضا یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام کا سلسلہ جاری رکھے اور انہیں ضروری حقائق کی تعلیم دے تاکہ وہ انہیں صحیح و سالم تمام انسانوں تک پہنچادیں، اس کے علاوہ اسے لوگوں کے سامنے اس طرح بیان کرے کہ ان پر حجت تمام ہو جائے اس مقصد تک پہنچنے کے لئے سب سے عمومی راستہ معجزہ ہے۔ ہم نے ان مطالب کو عقلی دلائل کے ذریعہ ثابت کیا، لیکن یہ دلائل انبیاء علیہم السلام کے متعدد ہونے اور آسمانی کتابوں کے متعدد ہونے کو ثابت نہیں کر سکتے، اور اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ بشری زندگی اس طرح ہوتی کہ ایک ہی رسول اس کی ضرورتوں کو کائنات کے ختم ہونے تک اس طرح پورا کر دیتا کہ ہر فرد اور گروہ اسی ایک رسول کے ذریعہ پیام اسلام کو اخذ کرتا تو یہ امر ان دلائل کے تقاضے کے خلاف نہ ہوتا۔

لیکن ہمیں معلوم ہے کہ پہلے یہ کہ، ہر انسان کی عمر خواہ نبی ہو یا غیر نبی محدود ہے لہذا حکمت الہی کا تقاضا یہ نہیں ہے کہ ایک ہی رسول جہان کے ختم ہونے تک زندہ رہے اور خود ہی تمام انسانوں کی ہدایت کا فریضہ انجام دے۔ دوسرے یہ کہ: بشر کی زندگی مختلف حالات اور ادوار میں کبھی بھی ایک جیسی نہیں رہتی لہذا شرائط کا مختلف اور متغیر ہوتے رہنا خصوصاً روابط اجتماعی کا پیچیدہ ہونا احکام اور اجتماعی قوانین کے درمیان میں اثر انداز ہے، بلکہ بعض حالات میں جدید قوانین کی ضرورت ہوتی ہے، لہذا اگر یہ قوانین اسی رسول کے ذریعہ بیان ہوتے جو ہزاروں سال پہلے مبعوث ہوئے تھے تو یہ ایک غیر مفید امر ہوتا اور انہیں ان کے مقامات پر

جاری کرنا اور ہی زیادہ سخت ہوتا۔ تیسرے یہ کہ: اکثر زمانوں میں مبعوث ہونے والے رسولوں کو اپنی تبلیغ کے لئے حالات اور شرائط ایسے نہیں تھے جو اپنے پیغام کو تمام انسانوں تک پہنچا سکتے۔ چوتھے یہ کہ: جب بھی ایک رسول کسی قوم کی جانب مبعوث ہوتا تھا تو اس کی تعلیمات کو زمانہ کے گزرنے کے ساتھ بدل دیا جاتا اور اس میں تحریف کر دی جاتی تھی اور آہستہ آہستہ ایک رسول کا لایا ہوا دین انحراف کا شکار ہو جاتا تھا، جس طرح کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے جس دین کی طرف لوگوں کو دعوت دی تھی وہی دین ان کے بعد انحراف سے دو چار ہو گیا اور تثلیث جیسے عقائد اس دین کے جز بن گئے۔ ان نکات کے پیش نظر انبیاءِ علیم السلام کا متعدد ہونا اور شریعتوں کا بدلتے رہنا اور بعض احکامات میں اختلافات کا راز سمجھ میں آ جاتا ہے؛ لیکن ان سب شریعتوں میں اصول عقائد اور مبنی اخلاقی کے اعتبار سے فردی و اجتماعی احکامات میں مماثلگی تھی مثلاً نماز تمام شریعتوں میں تھی اگرچہ ان نمازوں کی کیفیت متفاوت اور ان کے قبلہ مختلف تھے یا زکوٰۃ اور صدقہ دینا تمام شریعتوں میں تھا اگرچہ اس کی مقدار میں اختلاف تھا۔

بہر حال تمام رسولوں پر ایمان لانا اور نبوت کی تصدیق کے ساتھ ان میں کسی فرق کے قائل نہ ہونا نیز ان پر نازل ہونے والے تمام پیغامات اور معارف کو قبول کرنا نیز اس علاوہ ان میں یکسانیت کا قائل ہونا ہر انسان پر لازم ہے؛ ایک نبی کا انکار تمام انبیاءِ علیم السلام کے انکار کے برابر اور کسی ایک حکم کا منکر ہونا تمام احکامات الہیہ کے منکر ہونے کے مساوی ہے^۱ البتہ کسی بھی امت کے لئے کسی بھی زمانہ میں اسی دور کے نبی کے احکامات کے مطابق وظائف معین ہوتے رہے ہیں۔ جس نکتہ کی طرف یہاں پر اشارہ کرنا لازم ہے وہ یہ ہے کہ اگرچہ عقل مذکورہ نکات کے تحت انبیاءِ علیم السلام اور شریعتوں کے متعدد ہونے کے راز کو معلوم کر سکتی ہے لیکن اصل راز کا پتہ نہیں لگا سکتی کہ کیوں؟ کب؟ کیسے؟ کسی دوسرے نبی کی بعثت یا کسی جدید شریعت کی ضرورت ہے، فقط اس حد تک اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ جب بھی بشر کی زندگی اس طرح ہو کہ ایک نبی کے پیغامات تمام انسانوں تک پہنچ سکیں اور

^۱ ایسے نمونہ سے آگاہی کے لئے علامہ شیخ محمد جواد بلاغی کی کتاب ”الہدای الی دین المصطفیٰ“ کی طرف رجوع کیا جائے۔

^۲ سورۃ بقرہ۔ آیت / ۱۳۱۔ ۱۳۲۔ ۲۸۵، سورۃ آل عمران۔ آیت / ۱۹۔ ۲۰۔

^۳ سورۃ شوریٰ۔ آیت / ۱۳، سورۃ نساء۔ آیت / ۱۳۶، ۱۵۲، سورۃ آل عمران۔ آیت / ۸۴، ۸۵

^۴ سورۃ نساء۔ آیت / ۱۵۰، سورۃ بقرہ۔ آیت / ۸۵

اس کے پیغامات آنے والوں کے لئے محفوظ رہ جائیں، نیز اجتماعی شرائط اس طرح متغیر نہ ہوں، کہ کسی جدید شریعت یا احکامات کلی میں تبدیلی کی ضرورت پڑے، تو ان حالات میں کسی جدید نبی کی بعثت کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

انبیاءِ عظیم السلام کی تعداد

جیسا کہ ہم نے پہلے اشارہ کر دیا ہے کہ ہماری عقل انبیاءِ عظیم السلام اور آسمانی کتابوں کی تعداد کا اندازہ نہیں لگا سکتی، بلکہ اسے صرف نقلی دلائل کے ذریعہ ثابت کیا جاسکتا ہے اور قرآن کریم میں اگرچہ یہ خبر موجود ہے کہ ہر امت کے لئے ایک نبی ضرور مبعوث ہوا ہے لیکن اس کے باوجود قرآن نے ان کی تعداد کو معین نہیں کیا ہے بلکہ ان میں سے صرف ۲۴ رسولوں کا نام آیا ہے اور ان میں سے بھی بعض رسولوں کی داستانوں کی طرف فقط اشارہ کیا گیا ہے اس کے علاوہ ان میں بھی بعض نبیوں کے اسماء ذکر نہیں کئے گئے؛ لیکن معصومین عظیم السلام کی طرف سے منقول روایتوں کے مطابق خدا نے ایک لاکھ چوبیس ہزار نبیوں کو مبعوث کیا ہے ۳ جن کا سلسلہ حضرت آدم ابوالبشر علیہ السلام سے شروع اور حضرت محمد ﷺ پر ختم ہوتا ہے۔

خدا کی طرف سے بھیجے گئے رسول نبی ہونے کے علاوہ نذیر، مدبر، بشیر، بشر ۴ جیسے صفات کے بھی حامل تھے نیز صالحین و مخلصین میں ان کا شمار ہوتا تھا، اور ان میں سے بعض منصب رسالت پر بھی فائز تھے بلکہ بعض روایتوں کے مطابق منصب رسالت پر فائز نبیوں کی تعداد (تین سو تیرہ) ذکر کی گئی ہے ۵۔ اسی وجہ سے اس مقام پر مضمون نبوت و امامت اور نبی و رسول کے درمیان فرق کو بیان کر رہے ہیں۔

۱ سورة فاطر۔ آیت / ۲۴، سورة نحل۔ آیت / ۳۶

۲ سورة بقرہ۔ آیت / ۲۴۶، ۲۵۶۔

۳ رجوع کیا جائے رسالہ اعتقادات صدوق اور بحار الانوار (طبع جدید) ج ۱۱ ص ۲۸، ۳۰، ۳۲، ۴۲۔

۴ سورة بقرہ۔ آیت / ۲۱۳، سورة نساء۔ آیت / ۱۶۵

۵ بحار الانوار۔ ج ۱۱ ص ۲۸، ۳۲

نبوت اور رسالت

کلمہ ”رسول“ پیغام لانے والے کے معنی میں ہے اور کلمہ ”نبی“ اگر مادہ ”نبأ“ سے ہے تو اہم خبر کے مالک، اور اگر مادہ ”رسول“ سے ہے تو بلند و بالا مقام والے کے ہیں۔ بعض لوگوں کا گمان ہے کہ کلمہ نبی کلمہ رسول سے اعم ہے یعنی نبی وہ ہے کہ جس کی طرف خدا کی جانب سے وحی کا نزول ہو اور اسے لوگوں تک پہنچانے میں وہ مختار ہے لیکن رسول وہ ہے کہ جس پر وحی کو لوگوں تک پہنچانا ضروری ہے۔ لیکن یہ صحیح نہیں ہے اس لئے کہ قرآن میں بعض مقامات پر نبی کی صفت رسول کی صفت کے بعد مذکور ہے حالانکہ قاعدہ کے مطابق جو چیز عام ہو اسے خاص سے پہلے ذکر ہونا چاہیے اس کے علاوہ رسول ﷺ کے لئے ابلاغ وحی کے لئے وجوب پر کوئی دلیل بھی نہیں ہے۔

بعض روایتوں میں وارد ہوا ہے کہ مقام نبوت کا تقاضا یہ ہے کہ نبی فرشتہ وحی کو خواب میں مشاہدہ کرتا ہے اور بیداری میں صرف اس کی آواز سنتا ہے جبکہ مقام رسالت کا حامل شخص بیداری میں فرشتہ وحی کو مشاہدہ کرتا ہے^۱۔ لیکن اس فرق کو مفہوم لفظ کو مد نظر رکھتے ہوئے قبول نہیں کیا جاسکتا، ہر حال جس مطلب کو قبول کیا جاسکتا ہے وہ یہ ہے کہ ”نبی“ مصداق کی رو سے (نہ مفہوم کے لحاظ سے) رسول، عام ہے، یعنی تمام رسول مقام نبوت سے سرفراز تھے لیکن مقام رسالت صرف کچھ خاص انبیاء علیہم السلام سے مخصوص تھا جن کی تعداد (۳۱۳) ہے، بس رسولوں کا مقام نبیوں کے مقابلہ میں بلند ہے جیسا کہ خود تمام رسول فضیلت کے اعتبار سے ایک جیسے نہیں تھے بلکہ ان میں سے بعض مقام امامت سے بھی سزاوار تھے^۲۔

^۱ بحار الانوار ج ۱۱ ص ۳۲

^۲ اصول کافی ج ۱ ص ۱۷۶

^۳ سورہ بقرہ آیت ۳۵۳ سورہ بنی اسرائیل آیت ۵۵

^۴ سورہ بقرہ آیت ۱۲۴ سورہ انبیاء آیت ۷۳ سورہ سجدہ آیت ۲۴

اولوالعزم انبیاء علیہم السلام

قرآن کریم نے بعض رسولوں کو اولوالعزم کے نام سے یاد کیا ہے لیکن ان حضرات کی خصوصیات کو بیان نہیں کیا ہے: روایتوں کے مطابق اولوالعزم پیغمبروں کی تعداد پانچ ہے حضرت نوح علیہ السلام، حضرت ابراہیم علیہ السلام، حضرت موسیٰ علیہ السلام، حضرت عیسیٰ علیہ السلام، اور حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ قرآن کے بیان کے مطابق ان حضرات کی خصوصیات صبر و استقامت میں ممتاز ہونے کے علاوہ ان میں سے ہر ایک مستقل کتاب اور شریعت کے مالک تھے نیز ہم عصر اور متاخر انبیاء علیہم السلام، ان کی شریعتوں کی اتباع کرتے تھے مگر یہ کہ کوئی دوسرا اولوالعزم رسول مبعوث ہو اور گذشتہ شریعت منسوخ ہو جائے اسی ضمن میں یہ امر بھی روشن ہو گیا کہ ایک زمانہ میں دو، پیغمبر اکٹھا ہو سکتے ہیں جیسا کہ حضرت لوط علیہ السلام جناب ابراہیم علیہ السلام کے ہم عصر، اور حضرت ہارون۔ جناب موسیٰ علیہ السلام، کے ہم عصر اور حضرت یحییٰ علیہ السلام حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ہم وقت، ہم زمان تھے۔

چند نکات

اس درس کے آخر میں مسئلہ نبوت کے تحت فہرست وار چند نکات کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ الف: ہر نبی دوسرے نبی کی تصدیق اور اس کے آنے کی پیشگوئی کرتا تھا^۱ لہذا اگر کسی نبوت کا دعویٰ اور ہم عصر نبیوں یا گزشتہ رسولوں کی تکذیب کرے تو وہ اپنے دعویٰ میں جھوٹا ہے۔

ب: انبیاء علیہم السلام اپنی تبلیغ کی وجہ سے لوگوں سے اجر طلب نہیں کرتے تھے فقط رسول اکرم ﷺ نے اجر رسالت کے عنوان سے اہل بیت علیہم السلام کی مودت کی وصیت فرمائی تھی جس کی منفعت خود امت کے حق میں ہے^۲۔

^۱ سورۃ احقاف۔ آیت ۳۵۔

^۲ بحار الانوار ج ۱۱، ص ۲۴ اور معالم النبوة آیت / ۱۱۳۔

^۳ سورۃ آل عمران۔ آیت ۸۱۔

ج: بعض انبیاء علیہم السلام منصب الہی کے مالک ہونے کے علاوہ قضاوت اور حکومت کے حق سے بھی سرفراز تھے جن میں سے حضرت داود، اور حضرت سلیمان علیہما السلام کا نام لیا جاسکتا ہے سورہ نساء کی ۶۵ آیت سے استدلال ہوتا ہے کہ ہر رسول کی اطاعت مطلقاً واجب ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ تمام رسول اس مقام کے مالک تھے۔

د: جن جو مکلف اور مختار مخلوقات میں سے ہیں اور عادی حالات میں انسان کے لئے قابل دید نہیں ہیں، بعض انبیاء علیہم السلام کی دعوتوں سے باخبر ہوتے تھے اور ان میں صالح افراد ان کی دعوتوں پر ایمان بھی لائے تھے، ان لوگوں کے درمیان حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت رسول اکرم ﷺ کے پیرو موجود ہیں^۲ اور ان میں سے بعض ابلیس کی پیروی کرتے ہوئے انبیاء علیہم السلام کی تکذیب بھی کرتے ہیں^۵۔

سوالات

- ۱۔ انبیاء علیہم السلام کے متعدد ہونے کی حکمت بیان کریں؟
- ۲۔ انبیاء علیہم السلام کی دعوتیں اور ان کے احکامات سے مقابل میں لوگوں کا وظیفہ کیا ہے؟
- ۳۔ کس صورت میں جدید نبی کو مبعوث کرنے کی ضرورت نہیں ہے؟
- ۴۔ انبیاء اور رسولوں کی تعداد بیان کریں؟
- ۵۔ نبی اور رسول میں کیا فرق ہے اور مفہوم و مصداق کے اعتبار سے ان دونوں میں کیا فرق ہے؟

^۱ سورہ انعام۔ آیت / ۹۰، سورہ یس۔ آیت / ۲۱، سورہ قلم۔ آیت / ۴۲، سورہ یونس۔ آیت / ۷۲، سورہ ہود۔ آیت / ۲۹، ۵۱، سورہ فرقان۔ آیت / ۷۵،

سورہ شعراء۔ آیت / ۱۰۹، ۱۴۵، ۱۲۷، ۱۶۴، ۱۸۰، سورہ یوسف۔ آیت / ۱۰۴

^۲ سورہ شوریٰ۔ آیت / ۲۳

^۳ سورہ سبا۔ آیت / ۴۷

^۴ سورہ احقاف۔ آیت / ۲۹، ۳۲

^۵ سورہ جن۔ آیت / ۱، ۱۴

۶۔ انبیاءِ عظیم السلام کو منصب الہی کی رو سے ایک دوسرے پر کیسے برتری حاصل ہے؟

۷۔ اولوالعزم رسول کون ہیں؟ اور ان کی خصوصیات کیا ہیں؟

۸۔ کیا زمانِ واحد میں پیغمبروں کا متعدد ہونا ممکن ہے؟ اور ممکن ہونے کی صورت میں کسی ایک نمونہ کو بیان کریں؟

۹۔ انبیاءِ عظیم السلام کے اوصاف میں سے آپ کو مذکورہ اوصاف کے علاوہ اگر یاد ہوں تو ذکر کریں؟

۱۰۔ جنات کا طرزِ عمل، ایمان اور کفر کے لحاظ سے انبیاءِ عظیم السلام کی بہ نسبت کیسا ہیں؟

تیواں درس

انبیاء علیہم السلام اور عوام

مقدمہ

قرآن مجید جہاں گذشتہ انبیاء علیہم السلام کی داستانوں کو ذکر کرتا ہے اور ان کی درخشاں زندگی کے ہر گوشہ کی تفصیل بیان کرتا ہے اور ان کی تاریخ میں موجود تحریفات کے پردے فاش کرتا ہے وہیں انبیاء علیہم السلام کی تبلیغات کے مقابلہ میں لوگوں کے ردِ عمل کی طرف بھی توجہ دلاتا ہے ایک طرف انبیاء الہی علیہم السلام کے مقابلہ میں لوگوں کی مخالفتوں نیز ان کی مخالفت کے اسباب و علل کو بیان کرتا ہے اور دوسری طرف انبیاء علیہم السلام کا لوگوں کو ہدایت اور تربیت کرنے کے علاوہ کفر و شرک جیسے عوامل سے برسرِ پیکار ہونے کی طرف بھی اشارہ کرتا ہے نیز انسانی معاشروں میں جاری سنت الہی خصوصاً انبیاء علیہم السلام اور لوگوں کے درمیان ارتباط کی طرف توجہ دلاتا ہے کہ جس میں عبرت آموز نکات پوشیدہ ہیں۔

یہ مباحث اگرچہ براہِ راست اعتقادی مسائل سے مربوط نہیں ہوتی لیکن چونکہ مسائلِ نبوت سے مربوط بہت سارے روشن پہلو، مختلفا بہامات سے پردہ ہٹانے کے علاوہ تاریخ کے وادعات سے عبرت حاصل کرنے اور انسانی زندگی کو سنوارنے میں نہایت اہم رول ادا کرتے ہیں اسی وجہ سے اس درس میں جو محکمات میں ان کی طرف اشارہ کیا جا رہا ہے۔

انبیاء علیہم السلام کے مقابل میں لوگوں کا کردار

جب بھی انبیاء الہی علیہم السلام قیام کرتے اور لوگوں کو خدائے واحد اور اس کے احکامات کی اطاعت کرنے نیز باطل خداؤں کی پرستش سے بیزاری، شیطین اور طاغوت سے کنارہ کشی، ظلم و فساد، گناہ اور مصیبت سے پرہیز کرنے کے لئے دعوت دیتے تھے

^۱ سورۃ نحل۔ آیت/ ۳۶، سورۃ انبیاء۔ آیت/ ۲۵، سورۃ فصلت۔ آیت/ ۱۴، سورۃ احقاف۔ آیت/ ۲۱

تو انہیں عموماً لوگوں کی مخالفتوں کا سامنا کرنا پڑتا تھا^۱ مخصوصاً معاشرہ کے وہ افراد جو حاکم اور مالدار ہونے کی وجہ سے اپنے عیش و نوش^۲ میں مست، علم و دانش^۳ مال و ثروت کی فراوانی پر مغرور تھے، وہ شدت سے مقابلہ کرتے تھے فقیر طبقات کی ایک بڑی جماعت کو اپنا حامی بنا کر لوگوں کو راہ حق کی پیروی سے روکتے تھے^۴ اور اس طرح صرف وہی لوگ ایمان لاتے تھے جو معاشرہ کے پچھڑے ہوئے طبقہ سے تعلق رکھتے تھے^۵ اور بہت کم ایسا ہوتا تھا کہ ایک سماج صحیح و سالم عقائد اور عدل کی بنیادوں پر قائم ہونے کے ساتھ احکامات الہیہ کا مطیع ہوتا جیسا کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے دور میں ایسا سماج دیکھنے میں آیا، اگرچہ انبیاء علیہم السلام کی تعلیمات کا ایک حصہ آہستہ آہستہ ضرور سماج میں نفوذ کر جاتا تھا، یا کبھی حاکمان وقت کی طرف ان کی جھوٹی عظیمیوں کو بتانے کے لئے پیش کیا جاتا تھا جیسا کہ آج زیادہ تر حقوقی نظام آسمانی شریعتوں کے اقتباس کا نتیجہ ہیں جنہیں منع و ماخذ کے بغیر اپنے انکار کے عنوان سے پیش کیا گیا ہے۔

انبیاء علیہم السلام سے مخالفت کے اسباب

انبیاء علیہم السلام سے مخالفت کے اسباب میں سے خواہشات نفسانی اور فحشا سے لگاؤ^۶ کے علاوہ خود خواہی، غرور، اور استکبار، جیسے عوامل میں کہ جو زیادہ تر سماج کے مالداروں اور اثر و نفوذ رکھنے والوں کے درمیان پائے جاتے ہیں، نیز گزشتہ آبا و اجداد کی سنتوں کی پیروی بھی مهم عوامل میں سے تھی^۷۔ اسی طرح دانشمندیوں، حکمرانوں، اور مالداروں کی مخالفت کے اسباب میں سے سماجی مقام اور اقتصادی منافع کو اپنے لئے محفوظ رکھنا تھا^۸ اور دوسری طرف لوگوں کا جہالت اور نادانی کی وجہ سے کفر کے سربراہوں کے دھوکے

^۱ سورہ ابراہیم۔ آیت/ ۹، سورہ مومنون۔ آیت/ ۴۴

^۲ سورہ سبأ۔ آیت/ ۳۴،

^۳ سورہ غافر۔ آیت/ ۸۳، سورہ قصص۔ آیت/ ۷۸، سورہ زمر۔ آیت/ ۴۹

^۴ سورہ احزاب۔ آیت/ ۶۷، سورہ سبا۔ آیت/ ۳۱/ ۳۳

^۵ سورہ ہود۔ آیت/ ۳۱/ ۲۷/ ۴

^۶ سورہ مائدہ۔ آیت/ ۷۰

^۷ سورہ غافر۔ آیت/ ۵، سورہ اعراف۔ آیت/ ۷۶

^۸ سورہ بقرہ۔ آیت/ ۱۷۰، سورہ مائدہ۔ آیت/ ۱۰۴، سورہ یونس۔ آیت/ ۷۸، سورہ انبیاء۔ آیت/ ۵۳، سورہ شعراء۔ آیت/ ۷۴، سورہ لقمان۔ آیت/ ۲۱،

سورہ زخرف۔ آیت/ ۲۳، ۲۲۔

^۹ سورہ ہود۔ آیت/ ۸۴، ۸۶، سورہ قصص۔ آیت/ ۷۶، ۷۹، سورہ توہ۔ آیت/ ۳۴۔

میں آجانا اور ان کی پیروی کرنا سبب بنتا تھا کہ وہ کیسے اوہام اور باطل عقائد پر ایمان رکھنے سے دست بردار ہوں اور اس ایمان کو قبول کرنے سے پرہیز کریں جسے صرف چند محروم افراد نے قبول کیا ہے جبکہ یہ لوگ معاشرے کے مالداروں اور شرفاء کی جانب سے مطرود و مردود بھی کر دیئے جاتے تھے اس کے علاوہ سماج پر حاکم فضا کے اثرات کو بے اثر نہیں سمجھا جاسکتا۔

انبیاء علیہم السلام سے ملنے کا طریقہ

مخالفین، انبیاء علیہم السلام کی تبلیغات کو ناکام بنانے کے لئے مختلف طریقے اپناتے تھے۔ الف: تحقیر و استہزاء: وہ لوگ پہلے مرحلہ میں پیغمبروں کی شخصیت کی تحقیر کرتے اور ان کا مذاق اڑاتے تھے تاکہ لوگ ان سے بدظن ہو جائیں۔ ب: ناروا بہتان: اور پھر ان پر بہتان باندھتے تھے نیز ان کی طرف ناروا نسبتیں دیتے تھے جیسے سفید و احمر اور مجنون کے نام سے پکارتے تھے^۳ اور جب کوئی معجزہ پیش کرتے تو جادو گر کا نام دیتے تھے^۴ اسی طرح الہی پیغامات کو اساطیر الاولین کہتے تھے^۵۔

ج: مجادلہ اور مغالطہ: اور جب انبیاء الہی علیہم السلام حکمت اور دلائل کے ذریعہ استدلال پیش کرتے یا جدال احسن کی صورت میں ان لوگوں سے مجادلہ کرتے یا لوگوں کو نصیحت کرتے، اور کفر و شرک کے ناگوار نتائج سے آگاہ کرتے نیز خدا پرستی کے نیک انجام کے سلسلہ میں خبر دیتے، اور مومنین کو دنیا و آخرت میں سعادت کی خوشخبری دیتے، تو کفر کے سربراہ، لوگوں کو ایسی باتوں کے سننے سے منع کرتے اور پھر اپنی ضعیف منطق کے ذریعہ ان کا جواب دیتے، اس کے علاوہ اس امر میں اپنی پوری کوشش صرف کرتے تھے تاکہ لوگوں کو ان کی باتوں کے سننے سے روک دیں^۶ وہ لوگ اپنی منطق میں اپنے آباء و اجداد اور بزرگان ملت کے دین اور ان کے رسم و رواج کا سہارا لیتے^۷ اس کے علاوہ اپنی مادی ثروت کی چمک دکھاتے اور با ایمان لوگوں کے ضعف اور ناداری

^۱ سورہ ابراہیم / آیت ۲۱، سورہ فاطر آیت ۴۷، سورہ ہود آیت ۲۷، سورہ شعراء آیت ۳۴۔

^۲ سورہ حجر۔ آیت ۱۱، یس آیت ۳۰، زخرف آیت ۷، مطففین آیت ۲۹، ۳۲۔

^۳ سورہ اعراف آیت ۶۶، سورہ بقرہ آیت ۱۳، سورہ مومنون آیت ۲۵۔

^۴ سورہ ذاریات آیت ۳۹، ۵۳، ۵۲۔

^۵ سورہ انعام آیت ۲۵، انفال آیت ۳۱، سورہ نحل آیت ۲۴، مومنون ۸۳، نمل ۶۸، قلم ۱۵، مطففین ۱۳۔

^۶ سورہ نوح ۷، سورہ فصلت ۲، انعام ۱۱۲، ۱۲۱، سورہ غافر ۵، ۳۵، اعراف ۷۰، ۷۱، کہف ۵۶۔

^۷ سورہ بقرہ ۱۷۰، مائدہ ۱۰۴، اعراف ۲۸، انبیاء ۵۳، یونس ۷۸ لقمان ۲۱۔

کو ان کے عقائد کے باطل ہونے کو دلیل بناتے اور اپنے لئے یہ بہانہ بنا لیتے کہ کیوں خدا نے اپنے رسول کو فرشتوں میں سے انتخاب نہیں کیا؟ یا ان لوگوں کے ساتھ کیوں کسی فرشتہ کو نہ بھیجا؟ یا کیوں انھیں مالدار نہیں بنایا؟^۱ اور کبھی ان کی بجاہت اس حد تک بڑھ جاتی کہ کہتے کہ ہم اسی صورت میں ایمان لائیں گے کہ جب ہم پر بھی وحی نازل ہو یا پھر خدا کو ہم دیکھ لیں اور اس کی آواز بلا واسطہ سنیں۔^۲

د۔ دھکی دینا اور طمع دلانا: ایک دوسرا طریقہ جو انبیاءِ علیم السلام کی داستانوں میں مشاہدہ ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ وہ لوگ انبیاءِ علیم السلام، اور ان کے اطاعت گزاروں کو مختلف اذیتوں، شکنجوں، شہر بدر کرنے، سنگ سار کرنے، اور قتل کرنے کی دھکی دیتے تھے؟ اس کے علاوہ مختلف چیزوں کی لالچ دلاتے تھے خصوصاً کثیر دولت کے ذریعہ لوگوں کو انبیاءِ علیم السلام کی اطاعت سے روکتے تھے۔^۵

ھ۔ خنوت اور قتل: لیکن جب وہ لوگ انبیاءِ علیم السلام کا صبر و استقامت اور صلاہت و متانت کو مشاہدہ کرتے^۶ اور دوسری طرف ان کے چاہنے والوں کے اخلاص کو دیکھتے تو اپنی تبلیغات کے ناکام ہونے اور استعمال کئے گئے ہتھکڑوں کے ناکارہ ہونے کی صورت میں اپنی دھکیوں کو عملی کر دیتے اور آزار و اذیت شروع کر دیتے جیسا کہ اسی طرح انھوں نے بہت سے انبیاءِ الہی کو قتل کر ڈالا اور انسانی معاشرہ کو عظیم نعمتوں اور قوم اور سماج کو صلح رہبروں سے محروم کر دیا۔

انسانی معاشروں کی تدبیر میں بعض سنت الہی

اگرچہ انبیاءِ علیم السلام کی بعثت کا اصلی ہدف یہ تھا کہ لوگ دنیا و آخرت کی سعادت حاصل کرنے میں ضروری تعلیمات سے

^۱ سورۃ یونس آیت/۸۸، سباء آیت/۳۵، قلم آیت/۱۴، مریم آیت/۷۷، مدثر آیت/۱۲، مزمل آیت/۱۱، احقاف آیت ۱۱

^۲ سورۃ انعام آیت/۷۰، اسراء/۹۵، فرقان/۸۴

^۳ سورۃ بقرہ آیت/۱۱۸، انعام آیت/۱۲۴، نساء آیت/۱۵۳

^۴ سورۃ ابراہیم آیت/۱۳، ہود آیت/۹۱، مریم آیت/۴۶، یس آیت/۱۸، غافر آیت/۲۶

^۵ انفال آیت/۳۶

^۶ سورۃ ابراہیم آیت/۱۲

^۷ سورۃ بقرہ آیت/۸۷، ۶۱، آل عمران آیت/۲۱۱، ۱۱۲، ۱۸۱، مائدہ آیت/۷۰، نساء آیت/۱۵۵

آشنا ہو جائیں اور ان کی عقل و تجربہ کا ضعف وحی کے ذریعہ ختم ہو جائے یا ایک دوسری تعمیر کے مطابق ان کے لئے حجت تمام ہو جائے لیکن خدا نے انبیاء کی بعثت کے دوران اپنی حکیمانہ تدبیر کے ذریعہ ان کی دعوتوں کو قبول کرنے کے لئے فضا کو ہموار بنایا، تاکہ اس طرح انسانوں کے تکامل کے لئے راستہ آسان ہو جائے اور چونکہ خدا اور اسکے رسول سے روگردانی کے عظیم عوامل میں سے لوگوں کی نہایت مشکلات کے ہوتے ہوئے ان سے غفلت اور بے نیازی تھی^۱ لہذا خدا فضاء کو اس طرح ہموار کرتا تھا کہ لوگ ان ضرورت مند کی طرف متوجہ ہو جائیں اور غرور و تکبر کی سواری سے اتر جائیں اسی وجہ سے بلاؤں کو نازل کرتا اور انہیں سختیوں سے دوچار کر دیتا تاکہ مجبور ہو کر اپنی ناتوانی کا احساس کر لیں اور خدا کی طرف متوجہ ہو جائیں^۲۔

لیکن اس عامل کا اثر ہر ایک پر مؤثر نہ تھا خصوصاً وہ لوگ جو دولت میں سرمست اور ساہما سال لوگوں پر ظلم و ستم کے ذریعہ کثیر مال و دولت جمع کر لی تھی قرآن کی تعمیر کے مطابق ان کے دل پتھر کی طرح سخت ہو چکے تھے وہ ان سب کے باوجود بھی وہ متوجہ نہیں ہوتے^۳ اسی طرح خواب غفلت میں گرفتار رہتے، اور اپنی باطل راہ پر قائم رہتے ان پر انبیاء علیہم السلام کے مواظبت، عذاب کی دھمکیاں، اور ان کی نصیحتوں کا کوئی اثر نہیں ہوتا، اور جب خدا ان سے بلاؤں کو ٹال دیتا، اور انہیں نعمتوں سے نواز دیتا، تو یہ کہتے کہ نعمتوں اور بلاؤں کا آنا جانا زندگی کا ایک لازمہ ہے اور ایسا تو ہوتا رہتا ہے نیز ایسا تو گذشتہ لوگوں کے ساتھ بھی ہوا ہے^۴ اور حسب سابق مال کو جمع کرنے اور ظلم و ستم میں مشغول ہو جاتے، حالانکہ غافل تھے کہ نعمتوں کی افزائش دنیا و آخرت میں بد بخت ہونے کے لئے ان کے واسطے ایک حیلہ ہے^۵۔ بہر حال جب بھی انبیاء الہی علیہم السلام کے پیروکار تعداد کے اعتبار سے اس حد تک ہو جاتے کہ وہ ایک مستقل جامعہ تشکیل دے سکتے اور ان میں دفاع کی قوت آجاتی تو انہیں دشمنان خدا سے جہاد کے لئے حکم دے

^۱ سورۃ نساء آیت/۶۵، طہ آیت/۱۳۴

^۲ سورۃ علق آیت/۶

^۳ سورۃ انعام آیت/۴۲، اعراف آیت/۹۴

^۴ سورۃ انعام آیت/۴۳، سورۃ مومنون آیت/۷۶

^۵ سورۃ اعراف آیت/۱۸۳، ۹۵

^۶ سورۃ اعراف آیت/۱۸۲، ۱۹۳، آل عمران آیت/۱۷۸، توبہ آیت/۵۸، ۵۵، مومنون آیت/۵۶، ۵۴

دیا جاتا تھا اور ان کے ہاتھوں جماعت کفار پر عذاب الہی نازل ہوتا تھا^۱ وگرنہ مومنین انبیاء علیہم السلام کے حکم سے کنارہ کشی اختیار کر لیتے اور پھر ان پر بازگشت اور ایمان لانے کی ناامیدی کے بعد عذاب نازل ہو جاتا تھا^۲ یہ ہے وہ سنت الہی جو کبھی بھی نہیں بدلتی^۳۔

سوالات

- ۱۔ انبیاء علیہم السلام کی دعوت کے مقابل میں لوگوں کا رد عمل کیا تھا؟
- ۲۔ انبیاء علیہم السلام سے مخالفت کے اسباب کیا ہیں؟
- ۳۔ انبیاء علیہم السلام کے مخالفین کیسے کیسے طریقے اپناتے تھے؟
- ۴۔ انبیاء علیہم السلام کی بعثت اور ان کے مقابل میں لوگوں کی مخالفت کی صورت میں سنت الہی کیا ہوتی تھی؟

^۱ سورۃ آل عمران آیت ۱۴۶

^۲ سورۃ عنکبوت آیت/۴۱۰۔ اور بہت سے دوسرے مقامات پر قرآن میں ذکر ہوا ہے

^۳ سورۃ آل عمران آیت/۱۴۶

^۴ سورۃ فاطر آیت/۴۳، غافر آیت/۸۵، اسراء آیت/۷۷

اکیسواں درس

پیغمبر اسلام ﷺ

مقدمہ

ہزاروں انبیاء علیہم السلام، مختلف ادوار میں اور مختلف سرزمینوں پر مبعوث ہوئے اور انسانوں کی تربیت و ہدایت میں اپنا ممتاز کردار پیش کیا، انسانی معاشروں میں درنشاں آثار چھوڑے، اور ان میں سے ہر ایک نے انسانوں کی ایک جماعت کی تربیت کی، اور بقیہ انسانوں پر غیر مستقیم اثر چھوڑا، بلکہ ان میں سے بعض توحیدی اور ایک عادلانہ سماج قائم کرنے اور اس کی رہبری کرنے میں کامیاب بھی ہوئے۔ انبیاء الہی کے درمیان حضرت نوح علیہ السلام، حضرت ابراہیم علیہ السلام، حضرت عیسیٰ علیہ السلام، اور حضرت موسیٰ علیہ السلام نے خدا کی جانب سے زمانے کے تقاضوں کے لحاظ سے اخلاقی و وظائف اور فردی و اجتماعی احکام و قوانین پر مشتمل کتاب، بشر کی دسترس میں قرار دی، لیکن یہ کتابیں یا تو زمانہ کے گزرنے کے ساتھ بالکل محو ہو گئیں یا ان میں لفظی اور معنوی تحریفیں کی گئیں، اور اس طرح آسمانی شریعتیں مخ ہو گئیں جب کہ جناب موسیٰ علیہ السلام کی کتاب تورات میں بے شمار تحریفیں ہوئیں اور اب حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی انجیل کے نام سے کوئی کتاب باقی نہیں رہی، بلکہ آج جو کچھ ہے وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بعد ان کے حواریوں کے نوشتہ جات میں، جنہیں کتاب مقدس کا نام دیا گیا ہے۔

اگر کوئی منصف انسان کتاب تورات اور انجیل کا مطالعہ کرے تو اسے بخوبی معلوم ہو جائے گا، کہ یہ کتابیں حضرت موسیٰ علیہ السلام اور جناب عیسیٰ علیہ السلام کی نہیں ہیں تورات کا حال تو یہ ہے کہ وہ خدا کو ایک انسان کی شکل میں بیان کرنے کے علاوہ خدا اور اس کے رسولوں کی طرف شرمناک نسبتیں دیتی ہے، کہ خدا بہت سے امور سے بے خبر ہے اور بارہا جس عمل کو انجام دیتا ہے اس

سے ہٹیمان ہو جاتا ہے اور اپنے بندوں میں سے ایک بندہ (حضرت یعقوب علیہ السلام) سے کشتی لڑتا ہے لیکن اسے مغلوب نہیں کر پاتا اور جب تھک جاتا ہے تو اس سے التماس کرتا ہے کہ اسے چھوڑ دے، تاکہ اس کی مخلوقات اپنے خدا کو اس حال میں مشاہدہ نہ کرے؛ اسی کتاب میں جناب داؤد علیہ السلام کی طرف زنا محصنہ کی نسبت دی ہے^۱ اور جناب لوط علیہ السلام کی طرف شراب نوشی اور محارم سے زنا کی نسبت بھی دی گئی ہے؛ اس کے علاوہ کتاب تورات کے لانیوالے حضرت موسیٰ کی موت کی شرح بھی بیان کرتی ہے کہ وہ کیسے اور کہاں انتقال کر گئے کیا صرف یہی نکات ہمارے سمجھنے کے لئے کافی نہیں ہیں کہ یہ تورات حضرت موسیٰ علیہ السلام کی تورت نہیں ہے؟ لیکن انجیل کا حال تو تورت سے بھی بڑا ہے اس لئے کہ اولاً جو کتاب حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوئی یہ وہی انجیل نہیں ہے اور خود مسیحوں نے بھی کوئی ایسا دعویٰ نہیں کیا ہے بلکہ آج جو کچھ بھی ان کے حواریوں کے نوشتہ جات میں یہ کتاب شراب نوشی کی تجویز کے علاوہ اسے بنانے کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے معجزات میں شمار کرتی ہے خلاصہ یہ ہے کہ ان دو اولوالعزم رسولوں پر جو کچھ بھی نازل ہوا تحریف کا شکار ہو گیا، اور اب اس میں لوگوں کی ہدایت کی صلاحیت باقی نہیں رہی، لیکن یہ تحریضیں کیسے ہوئیں اس کی بڑی مفصل داستان ہے جسے یہاں بیان کرنے کا موقع نہیں ہے۔

ہاں! حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی بعثت کے چھ سو سال بعد جب جہل اور ظلم و بربریت نے دنیا کے گوشہ گوشہ کو تاریک بنا رکھا تھا، اور ہدایت کے چراغ خاموش ہو چکے تھے، تو خداوند متعال نے اس دور کے پست ترین اور تاریک ترین سرزمین پر اپنے آخری رسول ﷺ کو مبعوث کیا تاکہ ہمیشہ کے لئے چراغ وحی کو فروزاں بنا دے، اور نخ و تحریف سے محفوظ جاودانی کتاب کو بشر کے ہاتھوں میں تھا دے اور اس طرح لوگوں کو حقیقی معارف آسمانی حکمتیں اور الہی قوانین کی تعلیم سے آراستہ کر دے نیز دنیا و آخرت

^۱ توریت، سفر پیدائش۔ چھٹا باب شمارہ ۶۔

^۲ توریت، سفر پیدائش۔ ۳۲۰ باب شمارہ ۲۴۔۳۲۔

^۳ عہد قدیم، سموئیل کی دوسری کتاب گیارہواں باب۔

^۴ توریت سفر پیدائش انیسواں باب شمارہ ۳۰۔۳۸۔

^۵ تورات سفر تشنیہ باب ۳۴۔

^۶ انجیل، یوحنا باب سوم۔

^۷ اظہار الحق، مصنف رحمۃ اللہ ہندی، الہدیٰ الی الدین المصطفیٰ مصنف علامہ بلاغی، راہ سعادت، مصنف علامہ شعرانی۔

میں سعادت کی راہ کی طرف گامزن کر دے^۱۔ امیر المؤمنین امام علی علیہ السلام آنحضرت ﷺ کی بعثت کے دور کی توصیف کرتے ہوئے فرماتے ہیں: ”خدا نے اپنے رسول ﷺ کو اس وقت مبعوث کیا جب گذشتہ انبیاء علیہ السلام کی بعثتوں سے کافی فاصلہ واقع ہو چکا تھا، لوگ گمراہی میں پڑے سو رہے تھے، دنیا کے گوشہ گوشہ میں قون کے شعلے بھڑک رہے تھے، امور پر اکندہ تھے، جنگ کے شعلے بھڑک رہے تھے، گناہ اور جہالت کی تاریکی چھائی ہوئی تھی، دھوکہ دھڑی اور حیلہ گری آشکار تھی، حیات بشر کا تناور درخت مرجھایا ہوا تھا اور اس کے سرسبز ہونے کی کوئی امید بھی نہ تھی، پانی کی قلت، مثل ہدایت خاموش، گمراہی کے پرچم لہرا رہے تھے، بشر کو بد بختیوں نے گھیر رکھا تھا، اور اپنا کریمہ چہرہ نمایاں کر دیا تھا، ایسی گمراہی و جہالت اور بد اخلاقی کی وجہ سے فتنہ کے سراٹھانے کا ہر دم خطرہ تھا، لوگوں پر ناامیدی، ڈر، اور ناامنی کے تاریک بادل چھائے ہوئے تھے، اور اپنے لئے شمیر کے علاوہ کسی اور ہیز کو پناہ گاہ نہیں سمجھتے تھے“^۲۔

آنحضرت ﷺ کے ظہور کے بعد بشر کے لئے خدا شناسی، حقیقت جوئی، نبوت کے سلسلہ میں جستجو تحقیق، اور دین اسلام کی حقانیت جیسے اہم موضوعات تصور کئے جاتے رہے ہیں، ان موضوعات کے اثبات کے ساتھ نسخ و تحریف سے محفوظ قرآن کریم کی حقانیت اور اس کا کتاب الہی و آسمانی ہونا نیز تاقیامت بشر کے لئے ضمانت شدہ راستہ تمام صحیح عقائد کے اثبات اور تمام احکامات کا تعارف رہتی دنیا تک کے لئے کی گئی ہے، جس کے ذریعہ تمام معارف ہستی کے مسائل کو حل کیا جاسکتا ہے۔

مہینمبر اسلام ﷺ کی رسالت کا اثبات

جیسا کہ ہم نے تائیدوں درس میں بیان کیا کہ کسی بھی نبی کی نبوت کو ثابت کرنے کے لئے تین راستے ہیں۔ ا۔ پہلا راستہ، اس نبی کی گذشتہ زندگی سے آشنائی اور حالات و قرائن سے مدد لینا۔

^۱ سورۃ جمعہ ۳، ۲۔

^۲ نہج البلاغہ خطبہ ۱۸۷

۲۔ دوسرا راستہ، گذشتہ نبی کی پیشینگوئی۔

۳۔ تیسرا راستہ، انبیاء علیہم السلام کا معجزہ دکھانا ہے۔

آنحضرت ﷺ کی نبوت کے اثبات کے لئے یہ تینوں راستہ موجود تھے مکہ والوں نے آپ کی چالیس سالہ زندگی کو نزدیک سے مشاہدہ کیا تھا اور بخوبی انھیں معلوم تھا کہ آپ ﷺ کی زندگی میں کوئی ضعیف پہلو نہیں ہے اور اس حد تک آپ ﷺ کو سچا اور امانتدار سمجھتے تھے کہ آپ کو امین کے لقب سے یاد کرتے تھے، لہذا ایسے شخص کی طرف جھوٹ بولنے اور جھوٹے دعویٰ کرنے کی نسبت نہیں دی جاتی تھی، اس کے علاوہ گذشتہ نبیوں نے آپ کے ظہور کی بشارت دی تھی اور اہل کتاب کا ایک گروہ واضح نشانوں اور علامات کے ساتھ انتظار میں تھا^۲۔

یہاں تک کہ یہ لوگ مشرکین عرب سے کہا کرتے تھے کہ حضرت اسماعیل علیہ السلام کی نسل سے ایک رسول مبعوث ہونے والا ہے کہ جس کی خبر گذشتہ انبیاء علیہم السلام نے دی ہے اور وہ ادیان توحیدی کی تصدیق بھی کرے گا^۳۔ اسی وجہ سے یہود و نصاریٰ کے بعض علماء انھیں علامتوں کے پیش نظر آپ پر ایمان لائے^۴ اگرچہ ان میں سے بعض نے نفاہی اور شیطانی خواہشات کی وجہ سے اسلام کو قبول کرنے سے روگردانی کر لی، قرآن کریم اس سلسلے میں فرماتا ہے: (اَوَلَمْ يَكُنْ لَكُمْ اَيَّةٌ اَنْ يَعْلَمَ اُولَئِكَ اَنْبِيَائُكُمْ اِنْ كُنْتُمْ اَوَّلِيْنَ) کیا ان کے لئے یہ نفاہی کافی نہیں ہے کہ آپ ﷺ کو علماء بنی اسرائیل جانتے ہیں۔

جس طرح علماء بنی اسرائیل کی طرف سے آنحضرت ﷺ کے سلسلہ میں خبر دینا، اور گذشتہ نبیوں کی پیشینگوئیاں، آنحضرت ﷺ کی رسالت پر اہل کتاب کے لئے روشن گواہیاں تھیں اسی طرح دوسروں کے لئے گذشتہ نبیوں کی حقانیت نیز خود آنحضرت ﷺ کی

^۱ سورہ صف آیت/۶

^۲ سورہ اعراف۔ آیت /۱۵۷، بقرہ آیت/۱۴۶، سورہ انعام آیت/۲۰

^۳ سورہ بقرہ۔ آیت /۸۹

^۴ سورہ مائدہ آیت /۸۳، احقاف آیت/۱۰

^۵ سورہ شعراء۔ آیت /۱۹۷

حقانیت پر حجت تھی، اس لئے کہ وہ لوگ ان پٹنگوئیوں کی صداقت اور علامتوں کو بخوبی مشاہدہ کرتے تھے اور اپنی عقل کی بنیاد پر اچھی طرح تشخیص بھی دیتے تھے۔ اور سب سے عجیب بات تو یہ ہے کہ آج کی تورات و انجیل میں ایسی بھارتوں کو تحریف اور محو کر دینے کی تمام سعی و کوشش کے باوجود اس میں ایسے نکات اب بھی موجود ہیں جو حق کے طلبگاروں پر حجت تمام کر دیتے ہیں، جیسا کہ علما یہود و نصاریٰ میں سے ایک کثیر تعداد انہیں نکات کے پیش نظر حق طلبی کی وجہ سے دین اسلام پر ایمان لا چکی ہے۔ اسی طرح آنحضرت ﷺ نے بے شمار معجزے پیش کئے جو احادیث کی صحیح کتابوں میں تواتر کے ساتھ نیز تاریخ کے دامن میں آج محفوظ ہیں، لیکن آخری رسول اور جاودانی دین کو پہنچوانے میں عنایت الہی کا تقاضا یہ تھا، کہ ان معجزات کے علاوہ جو اتمام حجت کر دیتے ہیں، آنحضرت ﷺ کو ایک ایسا ابدی معجزہ عطا کرے کہ جو قیامت تک آنے والے انسانوں کے لئے حجت رہے، ہاں وہ قرآن ہے، اسی وجہ سے آئندہ درس میں ہم اس کتاب کی اعجازی شان بیان کریں گے۔

سوالات

- ۱۔ سابق رسولوں کی کتابوں کا حال بیان کریں؟
- ۲۔ تورات میں موجود تحریفوں میں سے چند تحریفوں کو ذکر کریں؟
- ۳۔ موجودہ انجیل کے غیر معتبر ہونے کی وضاحت کریں؟
- ۴۔ آنحضرت ﷺ کی رسالت کی اہمیت کو بیان کریں؟
- ۵۔ آنحضرت ﷺ کی رسالت کو ثابت کرنے والے راستہ کو بیان کریں؟

^۱ ان علماء میں مرزا محمد رضا (جنکا شمار تہران کے عظیم یہودی دانشمندیوں میں ہوتا ہے) اور ”اقامۃ الشہود فی رد الیہود“ کے مصنف بھی ہیں، یزد کے علماء یہود میں سے حاج بابا قزوینی صاحب کتاب ”محضر الشہود فی رد الیہود“ بھی ہیں۔ مسیحیوں کے مطابق اسقف پروفیسر عبد الاحد داؤد صاحب کتاب ”مجد در تورات و انجیل“ ہیں۔ بحار الانوار ج ۲۷، ص ۲۲۵، اتک ۱۸، اور تمام حدیث و تاریخ کی کتابیں ملاحظہ فرمائیں

بیٹھو! درس

اعجاز قرآن

قرآن کا معجزہ ہونا

قرآن تنہا ایک ایسی آسمانی کتاب ہے کہ جس نے پورے دعویٰ کے ساتھ اعلان کر دیا ہے کہ کسی میں بھی اس کی مثل لانے کی طاقت نہیں ہے یہاں تک کہ تمام جن و انس اکٹھا ہو جائیں، پھر بھی وہ اس کتاب کی نظیر لانے سے ناتواں ہیں بلکہ وہ اس جیسی کتاب تو کیا، اس کے دس سورہ بلکہ ایک ہی سورہ یہاں تک کہ تنہا ایک سطر کا جواب لانے سے، حد درجہ ناتواں ہیں۔ اس کے علاوہ نہایت تاکید کے ساتھ تمام انسانوں کو چیلنج کرتا ہے اور اس کتاب کے جواب نہ لانے کی قدرت کو اس کتاب اور اس کتاب کے لانے رسول اللہ ﷺ کا خدائی ہونے کی دلیل قرار دیتا ہے۔^۱

لہذا اس امر میں کوئی شک نہیں ہے کہ خود اس کتاب نے اپنے معجزہ ہونے کی خبر دی ہے اور اسے لانے والے رسول اللہ ﷺ نے اس کتاب کے ابدی ہونے اور اپنی رسالت کی حقانیت پر جاودانی معجزہ قرار دیا ہے بلکہ آج بھی چودہ صدیاں گزر جانے کے باوجود مختلف وسائل کے ذریعہ دوست و دشمن کے کانوں تک اس کے پیغامات پہنچ رہے ہیں اور اس طرح انسانوں پر حجت تمام ہو رہی ہے۔ اور ہمیں بخوبی معلوم ہے کہ جب رسول اکرم ﷺ نے اپنی رسالت کا آغاز کیا تو سب سے پہلے آپ کو اپنے سخت ترین دشمنوں سے مقابلہ کرنا پڑا کہ جنہوں نے اس دین کو نابود کرنے کے لئے اپنی کسی بھی کوشش سے دریغ نہیں کیا، اور جب آپ کے دشمن اپنی دھکیوں اور طمع دلانے وغیرہ سے مایوس ہو گئے تو آپ کے قتل کے لئے مکر بہت باندھ لی، لیکن یہ بھی خدا کی

^۱ سورہ بنی اسرائیل آیت / ۸۸

^۲ سورہ ہود آیت / ۱۳

^۳ سورہ بقرہ آیت / ۲۴، ۲۳

جانب سے وحی کے مطابق مکہ سے مدینہ کی جانب ہجرت کے ذریعہ باطل ہو گیا، اور آپ نے اپنی بقیہ عمر مکہ مشرکین اور دھوکے باز یہودیوں سے جنگ میں گزار دی، اور آپ کے چراغ حیات کے گل ہوتے ہوئے آج تک داخلی اور خارجی منافقین اس نور الہی کو خاموش کرنے کے درپے ہیں جنہوں نے اسے خاموش کرنے کے لئے اپنی کسی بھی کوشش سے دریغ نہیں کیا اور اگر قرآن بھی کتاب لانا، ان کے بس میں ہوتا، تو وہ ایک لمحہ کی تاخیر بھی نہ کرتے۔ آج جب دنیا کی ظالم طاقتوں نے اپنے جبری تسلط کی راہ میں اسلام کو سب سے بڑے دشمن کے عنوان سے پہچان لیا ہے اور اس سے مقابلہ کے لئے اپنی پوری توانائی کے ساتھ جد و جہد شروع کر دی ہے، تمام مالی، سیاسی، تبلیغاتی، علمی، امکانات کو اکٹھا کر لیا ہے اگر ان لوگوں میں اتنی بساط ہوتی کہ قرآن کی صرف ایک سطر کے ماند کوئی عبارت بنا لیتے تو اپنے وسائل اور تبلیغات کے ذریعہ دنیا کے چہ چہ میں اس کا اعلان کر دیتے، اس لئے کہ اسلام سے مقابلہ کے لئے یہ آسان ترین راستہ ہے۔

لہذا اگر انسان سمجھ دار اور باشعور ہو تو ایسے قرائن اور حالات کو دیکھتے ہوئے مان لے گا کہ قرآن ایک لاثانی اور جاودانی کتاب ہے بلکہ کوئی فرد یا جماعت تعلیم و تدریس یا تمرین کے ذریعہ اس جیسی کتاب نہیں لاسکتا، یعنی یہ کتاب ایک معجزہ کی تمام خصوصیات کا (خارق عادت ہونا) الہی اور غیر قابل تقلید ہونا، نبوت کے دعویٰ کی حقانیت کی دلیل بننے کی مالک ہے اسی وجہ سے آنحضرت ﷺ کی دعوت اور دین اسلام کی حقانیت پر دلیل قاطع ہے، اور بشر کے لئے سب سے عظیم نعمت اور کیا ہو سکتی ہے کہ اس نے اس کتاب کو اس طرح نازل کیا ہے کہ تا ابد معجزہ بنی رہے، نیز اپنی صداقت کی دلیل سے سرفراز رہے وہ بھی ایسی دلیل کہ جس کی دلالت کو سمجھنے کے لئے تحصیل اور تہارت کی ضرورت نہیں ہے بلکہ ہر شخص کے لئے قابل فہم ہے۔

اعجاز قرآن کی صورتیں: اب تک ہمیں یہ اجمالاً معلوم ہو گیا ہے کہ قرآن خدا کا کلام اور معجزہ ہے لہذا اس کے بعد اس کے معجزہ ہونے کی صورتوں کی طرف اشارہ کریں گے۔

الف۔ قرآن کی فصاحت و بلاغت: قرآن کے اعجاز کی پہلی صورت اس کی فصاحت و بلاغت ہے یعنی خداوند متعال نے اپنے مقصود کو بیان کرنے کے لئے خوبصورت اور پُر معنی ترین الفاظ کے ذریعہ منظم اور بہترین ترکیب کے ساتھ پیش کیا ہے تاکہ معنی مقصود کو آسان اور بخواہن اپنے مخاطبین کو سمجھا سکے لہذا ایسے الفاظ کا انتخاب اور انھیں بلند معانی کے لئے مناسب جملوں کی خوبصورت لڑیوں کی ترکیب صرف اسی ذات کے بساط میں ہے کہ جو پوری طرح الفاظ کی خصوصیات معانی کے دقائق، اور ان دونوں میں موجود رابطوں پر تسلط ہو، نیز معانی کی بلندیاں اور مقام و محل کی رعایت کرتے ہوئے بہترین الفاظ اور عبارتوں کا انتخاب کرنے اور ایسا وسیع احاطہ، وحی اور الہام الہی کے بغیر کسی بھی انسان کے لئے میسر نہیں ہے۔

قرآن کا ملکوتی طرز سخن اور لاجواب سخن نیز الفاظ و معانی کی وسعت و گہرائی، عربی زبان سے آشنا نیز فن فصاحت و بلاغت کے ماہرین کے لئے قابل درک ہے، لیکن فصاحت و بلاغت کے معجزہ ہونے کی تشخیص انھیں لوگوں کے بس میں ہے جو مختلف فنون میں بد طولی سے سرفراز ہوں، قرآن کے مقابلہ میں دوسری فصیح و بلیغ عبارتوں کے علاوہ اپنی توانائیوں اور مہارتوں کو آزما چکے ہوں، اور یہ کام صرف عرب کے ماہر اور زبردست شعرا کر سکتے تھے، اس لئے کہ عربوں کے لئے سب سے بڑا ہنر شعر گوئی تھی جو آنحضرت ﷺ کی بعثت کے دوران اپنے عروج پر پہنچ چکی تھی، شعرا اپنے بہترین اشعار کو ادبی تنقید وں کے بعد اے بہترین ہنر کے عنوان سے پیش کرتے تھے۔ بنیادی اعتبار سے حکمت الہی کا تقاضا یہ ہے کہ کسی بھی نبی کا معجزہ اس زمانہ کے علم و ہنر کے تناسب و تقاضے کے مطابق ہو، تاکہ اس زمانہ کے لوگ اس معجزہ کے اعجاز کو علوم بشری کے مقابلہ میں درک کر سکیں، جیسا کہ امام ہادی علیہ السلام سے جب ابن سکیت نے سوال کیا کہ کیوں خدا نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کا معجزہ، ید بیضاء، اور عصا کو اژدھا میں تبدیل کر دینا، اور اسی طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا معجزہ، بیماروں کو شفا دینا، اور حضرت رسول اکرم ﷺ کا معجزہ، قرآن کو قرار دیا، ؟ تو آپ (علیہ السلام) نے جواب میں فرمایا، ”حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں راج ہنر، بحر اور جادو تھا، اسی وجہ سے خدا نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کا معجزہ، جادو سے مشابہ قرار دیا تاکہ وہ لوگ معجزہ جیسے عمل کی ناتوانی کو درک کر سکیں، اور حضرت عیسیٰ

علیہ السلام کے دور میں طبابت اپنے عروج پر تھی لہذا خدا نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا معجزہ لا علاج بیماروں کو شفا دینا قرار دیا، تا کہ لوگ اس معجزہ کے اعجاز کو بخوبی درک کر سکیں، لیکن آنحضرت ﷺ کے دور میں رائج ہنر سخن سرائی اور شعر گوئی تھی، لہذا خدا نے قرآن کو بہترین اسلوب کے ساتھ نازل کیا، تا کہ قرآن کے اعجاز کی برتری کو بخوبی درک کیا جاسکے۔^۱ ہاں اس دور کے زبردست ادباء جیسے، ولید بن مغیرہ مخزومی، عقبہ بن ربیعہ، اور طفیل بن عمرو، نے قرآن کی فصاحت و بلاغت اور بشر کے بہترین کلاموں پر اس کی برتری کا اقرار کیا^۲ یہاں تک کہ ایک صدی کے بعد ابن ابی العوجاء، ابن مقفع، ابو شاکر دیصانی، اور عبد الملک بصری، جیسے افراد نے قرآن کے مقابلہ میں زور آزمائی کرنے کی کوشش کی اور مسلسل ایک سال تک اس کا جواب لانے میں سعی و کوشش کرتے رہے لیکن وہ جواب میں ایک حرف بھی پیش نہ کر سکے، یہاں تک کہ مجبور ہو کر قرآن کی عظمت کے مقابلہ میں گھٹنے ٹیک دئے، اور جب وہ لوگ مسجد احرام میں اپنی ایک سال کی زحمات کا نتیجہ جمع کرنے کے لئے اکٹھا ہوئے تو اسی ہنگام امام صادق علیہ السلام ان لوگوں کے پاس سے گذرے اور اس آیت کی تلاوت فرمائی: (ثَلَّ لَعْنُ الْجَمْعَةِ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلٰی اَنْ يَّاتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا يَاتُوْنَ بِمِثْلِهِ وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِيرًا^۳) اے رسول! اللہ ﷺ ان سے کہدو کہ اگر دنیا کے سارے جن و انس اس بات پر اکٹھے ہو جائے کہ اس قرآن کا مثل لے آئیں تو اس کا مثل نہیں لاسکتے اگر چہ اس بابت ایک دوسرے کی مدد بھی کریں۔

ب۔ قرآن لانے والے کا امی ہونا۔ قرآن اپنے معمولی حجم کے باوجود فردی و اجتماعی احکام و قوانین نیز اسلامی معارف کا سمندر کو اپنے اندر سیٹے ہوئے ہے، جنہیں جمع کرنے اور اس سلسلہ میں تحقیق کے لئے علوم و فنون میں ماہر افراد کی ایک جماعت کی ضرورت ہے جو سالہا سال اس مسئلہ کے تحت جستجو و تحقیق کریں اور آہستہ آہستہ اس میں موجود اسرارہ سے پردہ کھائی کریں اگرچہ اس کے تمام حقائق اور اسرارہ سے پردہ کھائی فقط انہیں لوگوں کے بساط میں ہے کہ جو علم الہی کے مالک اور خدا کی جانب سے تائید شدہ ہوں قرآن میں موجود بلند معارف کے مجموعے، اخلاقی دستورات کے باارزش خزانے، عادلانہ اور منظم قوانین، عبادتوں کے باب

^۱ اصول کافی، ج-۱، ص ۲۴۔

^۲ اعلام الوری ص ۲۷، ۲۸، سیرہ ابن ہشام ج ۱، ص ۴۱۰۔

^۳ سورہ بنی اسرائیل آیت ۸۸۔ تفسیر نور الثقلین اسی آیت کے ضمن میں رجوع کریں۔

میں فردی و اجتماعی احکامات کا حکمت کی بنیاد پر استوار ہونا، مفید ترین نصیحتیں، عبرتوں سے بھرپور داستانیں، تعلیم و تربیت کے طور طریقے یا ایک جملہ میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ قرآن ان تمام اصول و قوانین پر مشتمل ہے جو انسان کی دنیوی و آخروی سعادتوں کے لئے ضروری ہیں، جسے بہترین اسلوب کے ساتھ اس طرح جمع کر دیا ہے کہ جس سے ایک سماج کے مختلف افراد اپنی استعداد کے مطابق سمجھ سکیں۔ حقائق و معارف کے ایسے مجموعہ کو جمع کرنا عادی انسانوں کی بساط کے باہر ہے لیکن جو چیز آنکھوں کو خیرہ کر دیتی ہے وہ یہ کہ ایسی با عظمت کتاب ایک ایسے شخص کے ہاتھوں پیش کی گئی ہے جس نے نہ مکتب دیکھا، نہ قلم کو ہاتھ لگایا، بلکہ ایسے سماج میں تربیت پائی جو تمدن سے کوسوں دور تھا، اور اس سے بھی عجیب غریب بات یہ ہے کہ بعثت سے پہلے چالیس سال تک ایسا کوئی کلام بھی اس ذات سے سننے میں نہیں آیا، اور رسالت کے دوران جو کچھ بھی وحی کے عنوان سے پیش کیا،

ایک ایسے مخصوص اسلوب و ترکیب پر مشتمل تھا جو اسے دوسرے کلاموں کے درمیان ممتاز کر دیتا تھا یہاں تک کہ خود وحی اور آنحضرت ﷺ کے ذاتی کلام میں فرق واضح و روشن رہتا تھا۔ قرآن اسی نکتہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے: (وَمَا كُنْتَ تَسْمَعُ مِنْ قَبْلِهِ مِنْ كِتَابٍ وَلَا تَخِطُّهُ بِيَمِينِكَ إِذَا لَأَتَاكَ الْبَطْلُونَ^۱) اے رسول! قرآن سے پہلے نہ تو تم کوئی کتاب پڑھتے تھے اور نہ اپنے ہاتھ سے تم لکھا کرتے تھے ایسا ہوتا تو یہ جھوٹے ضرور تمہاری نبوت میں شک کرتے۔ اسی طرح ایک اور مقام پر فرماتا ہے: (قُلْ لَوْ أَنِّي لَمَعْلُومٌ^۲) اگر خدا چاہتا تو میں یہ کتاب تمہارے سامنے پیش نہ کرتا اور اس سے آگاہ نہ کرتا جیسا کہ اس سے پہلے تمہارے درمیان زندگی گذاری کیا تم لوگ کچھ سمجھ سکتے ہو شاید قرآن میں سورہ بقرہ کی آیت (۲۳) ”فَأَتُوا بُرُوجَ مَن مِّثْلِهِ“ اسی اعجاز کی طرف اشارہ ہو یعنی احتمال یہ ہے کہ (مثلاً) کی ضمیر (عبدنا) کی طرف پلٹ رہی ہو۔ اگر فرض محال کو ممکن مان لیا جائے کہ ہزاروں دانشمند افراد ایک دوسرے کی مدد سے ایسی کتاب کے جواب لانے میں کامیاب ہو جائیں لیکن کسی بھی صورت میں ایک مکتب میں جانے والے اور

^۱ سورہ عنکبوت - آیت ۴۸

^۲ سورہ یونس آیت ۱۶

درس نہ پڑھنے والے شخص سے ایسی کتاب کا جواب لانا غیر ممکن ہے۔ لہذا ایک اُمّی شخص کے ذریعہ ایسی بے نظیر خصوصیات پر مثل کتاب کا ظاہر ہونا قرآن کے اعجاز کے دوسرے پہلوؤں کی طرف ایک اشارہ ہے۔

ج۔ اتفاق نظر اور عدم اختلاف۔ قرآن مجید ایک ایسی کتاب ہے جو (۲۳) سال کی مدت میں تلخ و شیریں حوادث، نشیب و فراز سے بھرپور حالات کے باوجود اس کے مطالب میں روانی اور اعجاز کے پہلو برقرار ہیں۔ لہذا ظاہر و باطن، الفاظ و معانی میں روانی قرآن کے اعجاز کی ایک دوسری صورت ہے خود قرآن میں اسی نکتہ کی طرف ایک اشارہ موجود ہے: (أَفَلَا يَتَذَكَّرُونَ الْقُرْآنَ وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللَّهِ لَوَجَدُوا فِيهِ اخْتِلَافًا كَثِيرًا^۱) تو کیا یہ لوگ قرآن میں غور و فکر نہیں کرتے اور یہ خیال نہیں کرتے کہ اگر خدا کے سوا کسی اور کی طرف سے آیا ہوتا تو ضرور اس میں اختلاف پاتے۔

وضاحت: ہر انسان ہمیشہ دو قسم کی حالتوں سے دوچار ہوتا ہے، پہلے یہ کہ برابر اس کی معلومات اور مہارتوں میں اضافہ ہوتا رہتا ہے اور یہ افزائش اس کے کلام میں پوری طرح اثر انداز بھی ہوتی ہے اور طبعی اعتبار سے بیس سال کے اندر نمایاں فرق آجاتا ہے۔ دوم: یہ کہ زندگی کے مختلف حوادث اور مختلف حالات جیسے یاس و امید، خوشی و غم اور اضطراب و آرام، احساسات و خیالات کی تبدیلی کا باعث بنتے ہیں، لہذا اس کے حالات کا اس طرح سے متغیر ہوتے رہنا اس کے کلام میں شدید اختلاف اور ضد و نقیض کا سبب بنتا ہے، دراصل رفتار و گفتار میں تبدیلی روحی حالات کے متغیر ہونے کا سبب ہوتے ہیں کہ جو خود طبعی اور اجتماعی اوضاع و احوال کے تابع ہیں۔

اب اگر ہم یہ فرض کر لیں کہ قرآن کریم آنحضرت ﷺ کی اپنی لکھی ہوئی کتاب ہے تو آپ کی زندگی کے حوادث تلخ و شیریں حالات کی وجہ سے یہ کتاب بے شمار اختلافات اور ضد و نقیض سے پُر ہونی چاہیے تھی لیکن ہم ایسے اختلاف کا مشاہدہ نہیں کر رہے ہیں۔

^۱ سورۃ نساء۔ آیت ۸۲

لہذا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ قرآن کے مضامین میں عدم اختلاف اور اتحاد کا ہونا، اس کی فصاحت و بلاغت کا معجزہ ہے نیز اس بات کی دلیل ہے کہ اس کتاب کا سرچشمہ خداوند متعال کی ذات ہے جو بدلتے ہوئے حالات پر مسلط اور طبیعت پر حاکم ہے۔

سوالات

- ۱۔ قرآن کس طرح اپنے معجزہ ہونے کا دعویٰ کر رہا ہے وضاحت فرمائیں؟
- ۲۔ اعجاز قرآن پر اجالی دلیل کیا ہے؟
- ۳۔ کیا یہ احتمال دیا جاسکتا ہے کہ اب تک کسی نے بھی اس کا جواب دینا مناسب نہ سمجھا، یا اس کا جواب لائے ہوں اور ہم اس سے بے خبر ہوں؟ کیوں؟
- ۴۔ قرآن کی حیرت انگیز بلاغت کی تشریح کریں؟
- ۵۔ اعجاز قرآن اور آنحضرت ﷺ کے اُمتی ہونے میں کیا کوئی ربط برقرار ہے؟
- ۶۔ قرآن میں اختلاف کا نہ ہونا کیونکر اس کے معجزہ ہونے پر دلالت کرتا ہے؟

تشیواں درس

قرآن کا تحریف سے محفوظ رہنا

مقدمہ

جیسا کہ ہم نے پہلے اشارہ کر دیا ہے کہ ضرورتِ نبوت کی دلیل کا تقاضا یہ ہے کہ الہی پیغامات صحیح و سالم انسانوں تک پہنچیں، تاکہ اس پر عمل کرتے ہوئے انسان اپنی دنیا و آخرت کی سادتوں تک رسائی حاصل کر سکے۔ لہذا قرآن کا لوگوں تک پہنچنے تک محفوظ رہنا دوسری آسمانی کتابوں کی طرح محتاجِ بحث نہیں ہے لیکن ہمیشہ کہاں سے معلوم کہ دوسری آسمانی کتابیں بشر کے اختیار میں آنے کے بعد تحریفات کا شکار ہوئیں یا ایک مدت گزرنے کے بعد طاق نیاں کا شکار ہو گئیں، جیسا کہ آج ہمارے درمیان حضرت ابراہیم و حضرت نوح علیہما السلام کی کتابوں کا کوئی اثر موجود نہیں ہے۔

اور حضرت موسیٰ و حضرت عیسیٰ علیہما السلام کی کتابیں اپنی اصلی حالت میں باقی نہیں ہیں۔ لہذا ان مطالب کے پیش نظر یہ سوال اٹھتا ہے کہ آج ہمارے پاس جو آسمانی کتاب کے عنوان سے قرآن موجود ہے کیا یہ وہی کتاب ہے جو آنحضرت ﷺ پر نازل ہوئی اس میں کسی بھی قسم کی کوئی تحریف، کمی و زیادتی نہیں ہوئی ہے؟ البتہ وہ لوگ کہ جنہیں اسلام اور مسلمین کی تاریخ کا تھوڑا، بہت بھی علم ہے، وہ جانتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ اور آپ کے جانشین ائمہ علیہم السلام نے قرآن کی کتابت اور اس کی آیات کے حفظ کرنے میں کیا اہتمام کیا ہے، یہاں تک کہ تاریخ کے مطابق تھا ایک جنگ میں قرآن کے حافظین میں سے ستر افراد شہید کر دئے گئے، چودہ صدیوں سے قرآن کو تواتر سے نقل کرنے اور اس کی آیات و کلمات اور حروف کی تعداد کو شمار کرنے میں مصروف ہیں وہ اس بات سے باخبر ہیں ایسے لوگ کبھی بھی قرآن میں معمولی تحریف کا امکان بھی نہیں دے سکتے، لیکن اگر تاریخ کے ایسے قطعی قرائن سے صرف نظر کر لیا جائے تو عقلی و نقی دلائل کے ذریعہ قرآن کے سالم رہنے کو ثابت کیا جاسکتا ہے، یعنی پہلے مرحلہ میں دلیل عقلی

کی بنیاد پر قرآن میں کسی بھی چیز کے زیادہ ہونے کو ثابت کرنے کے بعد خود قرآن کی آیات کے سہارے اس میں سے کسی بھی چیز کے کم نہ ہونے کو ثابت کیا جاسکتا ہے۔ اسی وجہ سے قرآن کے سالم رہنے کی بحث کو دو مختلف حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

قرآن میں کسی چیز کا اضافہ نہ ہونا

قرآن میں کسی بھی چیز کے زیادہ نہ ہونے کا مسئلہ تمام مسلمین بلکہ جہان کے تمام باخبر افراد کے نزدیک قبول شدہ ہے، بلکہ کوئی ایسا حادثہ بھی رونما نہیں ہوا کہ جس کی وجہ سے قرآن میں کسی بھی چیز کے زیادہ ہونے کا احتمال دیا جاسکے اور اسی اضافہ کے لئے کسی سند کا کوئی بھی وجود نہیں ہے، بلکہ عقلی دلیل کی بنیاد پر اس مسئلہ کو اس طرح باطل کیا جاسکتا ہے کہ اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ قرآن کے معانی میں کسی کامل معنی کا اضافہ ہوا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوگا قرآن کا مثل یا نظیر لانا ممکن ہے، حالانکہ اعجاز قرآن اور بشر کی ناتوانی کے پیش نظر یہ امر باطل ہے۔

اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ تنہا ایک کلمہ یا ایک چھوٹی آیت کا صرف اضافہ ہوا ہے تو اس کا لازمہ یہ ہے کہ نظم سخن میں خلل وارد ہوا ہے اور قرآن اپنی اعجاز آمیز شکل و صورت سے خارج ہو گیا ہے، اور اس صورت میں قابل تقلید اور اس کے مثل لانے کا امکان پیدا ہو جائے گا، اس لئے کہ قرآن، آیتوں کے اعجاز آمیز نظم، کلمات و حروف کے انتخاب پر منحصر ہے، لہذا ان میں خلل اور تغیر کے وارد ہوتے ہی وہ اپنی اصلی حالت سے خارج ہو جائے گا۔

لہذا جس دلیل کے ذریعہ قرآن کا اعجاز ثابت ہے اسی دلیل کے ذریعہ قرآن کا اضافات سے محفوظ رہنا ثابت ہے، نیز اسی دلیل کے ذریعہ کسی کلمہ یا جملہ کا کم ہونا اس کے کم ہوتے ہی حالت اعجاز کے ختم ہو جانے کی نفی کرتا ہے، لیکن قرآن سے کسی کامل سورہ کے کم نہ ہونے یا قرآن سے ایک کامل مطلب کا اس طرح سے خارج ہو جانا کہ اس کے اعجاز میں خلل وارد نہ ہو، اس کے نہ ہونے کو ثابت کرنے کے لئے دوسرے دلائل کی ضرورت ہے۔

قرآن سے کسی چیز کا کم نہ ہونا

آج تک علماء اسلام خواہ سنی ہوں یا شیعہ برابر اس امر کی تاکید کرتے رہے ہیں کہ جس طرح قرآن میں کسی چیز کا اضافہ نہیں ہوا اسی طرح اس سے کچھ کم بھی نہیں ہوا ہے انھوں نے اپنے اس مطلب کے لئے بے شمار دلیلیں پیش کی ہیں، لیکن احادیث کی کتابوں میں بعض من گھڑت حدیثوں کو نقل کرنے کی وجہ سے بعض معتبر روایتوں سے غلط مفہوم کو حاصل کرتے ہوئے بعض نے اس مطلب کا احتمال اور بعض نے قرآن سے بعض آیات کے کم ہونے کی تائید بھی کی ہے۔ قرآن کا کسی بھی قسم کی تحریف خواہ اضافہ کے معنی میں ہو یا کم ہونے کے معنی میں۔ اس سلسلہ میں تاریخ کے قطعی قرائن ہونے کے علاوہ قرآن سے ایسے مطالب کا حذف ہو جانا جو اس کے اعجاز کو ختم کر دے، دلیل اعجاز کے ذریعہ باطل ہے بلکہ قرآن کی ایک سورہ یا ایک آیت کے حذف ہونے سے محفوظ رہنے کو خود قرآن کریم کے ذریعہ ثابت کیا جاسکتا ہے۔

یعنی جب یہ امر واضح ہو گیا کہ تمام قرآن خدا کا کلام ہے اور اس میں ایک حرف کا بھی نہیں ہوا ہے لہذا اس کی آیات کے مفاہیم نقلی و تعبیری دلائل کے عنوان سے حجت میں، لہذا قرآن کی آیت سے حاصل ہونے والے مفاہیم میں سے ایک مفہوم قرآن کا خدا کی جانب سے ہر قسم کی تحریف سے محفوظ رہنے کی ضمانت لینا ہے، جبکہ دوسری آسمانی کتابوں کی حفاظت خود اسی امت کے حوالہ تھی یہی مفہوم سورہ حجر کی آیت نمبر (۹) میں موجود ہے (’إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ‘) یہ آیت دو جملوں پر مشتمل ہے، پہلا جملہ (إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ) اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ قرآن کو خدا نے نازل کیا ہے اور نزول کے دوران اس میں کسی بھی قسم کا کوئی تصرف بھی نہیں ہوا ہے اور دوسرا جملہ (وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ) اس جملہ میں نہایت تاکید ہوئی ہے جو اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ

^۱ جیسے کہ وہ روایات جو آیتوں کی تفسیر یا اس کے بیان کرنے یا غلط تفسیروں اور معنوی تحریفوں کو باطل کرنے والی ہیں، جن سے یہ سمجھا گیا ہے کہ وہ قرآن کے کلمات کے حذف ہونے پر دلالت کرتی ہیں۔

^۲ جیسا کہ سورہ مائدہ کی آیت نمبر (۴۴) میں علماء یہود و نصاریٰ کے سلسلہ میں فرماتا ہے -

’بما استحفظوا من کتاب اللہ وکانوا علیہ شہداء‘

بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ قرآن جس مقدار میں نازل ہوا ہے اسی طرح انسانوں کے درمیان کم و زیادتی کے بغیر موجود ہے تا کہ طالبان حقیقت اپنا مقصود حاصل کر سکیں، لہذا قرآن کے بعض نسخوں کا ناقص یا کتابت کے اعتبار سے غلط ہونا قرآن کے اختلاف یا نزول قرآن کے مطابق آیات اور سورتوں کا منظم نہ ہونا مختلف تفسیریں اور معنوی تحریفوں کا ہونا قرآن کا تحریف سے محفوظ رہنے کے خلاف نہیں ہے۔

خدا نے اس میں کسی بھی قسم کی تحریف نہ ہونے کی ضمانت لے رکھی ہے یہ آیت اگرچہ قرآن میں کسی بھی قسم کے اضافہ کی نفی کر رہی ہے لیکن ایسی تحریف کے نہ ہونے پر اس آیت سے بھی استدلال نہیں کیا جاسکتا ہے اس لئے کہ قرآن میں کسی بھی آیت کے اضافہ کے فرض میں وہ آیت خود بھی شامل ہے، لہذا اس آیت کے ذریعہ اس فرض کو باطل کرنا صحیح نہیں ہے، اسی وجہ سے ہم نے قرآن کے معجزہ ہونے کے ذریعہ اس فرض کو باطل کیا ہے اور پھر اسی آیت کے ذریعہ کسی آیت یا سورہ کا اس طرح سے حذف ہونا جو قرآن کے اعجاز آمیز نظم میں خلل وارد نہ کرے اس قسم کے حذف سے قرآن کے محفوظ رہنے کو بھی ثابت کر دیا ہے، پس اس طرح قرآن کا تحریف (خواہ اضافہ کے ساتھ ہو یا حذف ہونے کے ساتھ) سے محفوظ رہنا عقلی اور نقلی دلائل کی ترکیب سے ثابت ہو جاتا ہے۔ اس بحث کے آخر میں اس نکتہ کی طرف اشارہ کرنا لازم سمجھتے ہیں کہ قرآن کا تحریف سے محفوظ رہنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ قرآن جہاں بھی ہو کثابت یا قرائت کے اعتبار سے محفوظ یا غلط تفسیر اور تحریف معنوی سے پوری طرح پاک ہو، یا نزول کے مطابق اس کے سورہ اور آیتیں منظم ہوں۔

سوالات

۱۔ قرآن کا تحریف سے محفوظ رہنے کے مسئلہ کو بیان کریں؟

۲۔ تاریخی اعتبار سے قرآن کے تحریف سے محفوظ رہنے پر دلائل کیا ہیں؟

۳۔ قرآن کا محفوظ رہنا کس طرح ثابت کیا جاسکتا ہے؟

۴۔ قرآن میں زیادتی کے نہ ہونے کو ثابت کریں؟

۵۔ کس دلیل کی بنیاد پر قرآن سے کچھ بھی کم نہیں ہوا ہے؟

۶۔ کیا انہیں دلیلوں کے ذریعہ قرآن میں اضافہ نہ ہونے کو ثابت کیا جاسکتا ہے؟ کیوں اور کیسے؟

۷۔ اس امر کی وضاحت کریں کہ قرآن کا قرائت یا کتابت کے اعتبار سے ناقص ہونا معنوی تحریفوں اور مختلف تفسیروں کا ہونا یونکر

قرآن کا کسی بھی قسم کی تحریف سے محفوظ رہنے کے مسئلہ کے خلاف نہیں ہے۔؟

چونتواں درس

اسلام کا جہانی اور جاودانی ہونا

مقدمہ

ہمیں یہ معلوم ہو چکا ہے کہ تمام انبیاء علیہم السلام پر ایمان لانا اور ان کے پیغامات پر یقین کرنا لازم ہے، لہذا انبیاء علیہم السلام میں سے کسی نبی کا انکار یا ان کے پیغامات میں سے کسی پیغام کا منکر ہونا ربوبیت تشریعی کے انکار اور شیطان کے کفر کے مانند ہے۔ لہذا آنحضرت ﷺ کی رسالت کے ثابت ہو جانے کے بعد آپ پر اور ان سبھی احکام پر ایمان لانا کہ جو خدا کی طرف سے نازل ہوئے ہیں ضروری اور واجب ہے، لیکن کسی بھی نبی اور اس کی کتاب پر ایمان لانے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اس کی شریعت پر عمل کرنا بھی ضروری ہو، جیسا کہ مسلمین تمام انبیاء علیہم السلام اور ان کی کتابوں پر ایمان رکھتے ہیں لیکن وہ گزشتہ شریعتوں پر عمل نہیں کر سکتے، جس طرح سے کہ ہم نے پہلے اشارہ کیا کہ ہر امت پر اسی دور کے نبی کی شریعت پر عمل کرنا واجب ہے لہذا آنحضرت ﷺ کی شریعت پر عمل کرنا تمام انسانوں پر اسی وقت واجب ہوگا کہ جب آپ کی رسالت کسی خاص قوم سے مخصوص نہ ہو اور آپ کے بعد کسی دوسرے نبی کی بعثت نہ ہوئی ہو کہ جسکی وجہ سے شریعت اسلام کے منسوخ ہونے کا سوال پیدا ہو۔

اسی وجہ سے اس مسئلہ پر بحث کرنا ضروری ہے، کہ کیا آنحضرت ﷺ کی رسالت جہانی اور جاودانی ہے یا پھر کسی خاص قوم اور زمانے سے مخصوص ہے؟ اس مسئلہ کو مد نظر رکھتے ہوئے اسے صرف عقلی بنیاد پر حل نہیں کیا جاسکتا، بلکہ نقلی علوم اور تاریخ میں تحقیق و جستجو کرنی ہوگی یعنی اس کو حل کرنے کے لئے معتبر اسناد کی طرف رجوع کرنا ہوگا۔ اور جس کے لئے قرآن کریم کی حقانیت

^۱ اسی کتاب کے انتیسویں درس کی طرف رجوع کیا جائے

اور آنحضرت ﷺ کی نبوت و عصمت آشکار ہو چکی ہو اس کے لئے کتاب و سنت سے زیادہ معتبر مدرک کچھ اور قرار نہیں دیا جا سکتا۔

اسلام کا جہانی ہون

اسلام کا جہانی ہونا اور کسی خاص قوم سے مخصوص نہ ہونا اس دین کی ضروریات میں سے ہے، یہاں تک کہ وہ لوگ جو اسلام کو نہیں مانتے ان لوگوں کو بھی بخوبی معلوم ہے کہ اسلام جہانی ہے اور کسی خاص سرزمین سے مخصوص نہیں ہے۔ اس کے علاوہ تاریخی شواہد بے شمار ہیں جو اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے قیصر روم، بادشاہ ایران، مصر و حبشہ کے حاکم، اور شامات کے فرمانروا، نیز عرب کے قبیلوں کے رئیسوں کے نام، خاص خطوط تحریر فرمائے، اور انھیں اسلام کی طرف دعوت دیتے ہوئے، اُسے قبول نہ کرنے کی صورت میں عذاب سے ڈرایا، لہذا اگر دعوت اسلام عمومی نہ ہوتی تو دوسری سرزمینوں کے بادشاہوں کے نام دعوت اسلام کے لئے خطوط روانہ نہ کرتے۔ لہذا کوئی بھی شخص حقانیت اسلام پر ایمان اور اس کی شریعت پر عمل کرنے میں فرق کا قائل نہیں ہو سکتا، اور کوئی بھی اس شریعت پر عمل کرنے اور اس کی پیروی کرنے سے مشغی نہیں ہے۔

اسلام کے جہانی ہونے پر قرآنی دلائل

جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا کہ ایسے مطالب کو ثابت کرنے کے لئے بہترین دلیل قرآن کریم ہے کہ جس کی حقانیت اور معتبر ہونا گذشتہ دروس میں ثابت ہو چکا ہے، لہذا اگر کوئی ایک فرد بھی قرآن کا اجمالی مطالعہ کرے تو اسے بخوبی معلوم ہو جائے گا کہ اس کی دعوت جہانی ہے، اور کسی خاص قوم یا سرزمین سے مخصوص نہیں ہے، جیسا کہ بہت سی آیات میں (يَا أَيُّهَا النَّاسُ) اے لوگو! یا پھر (يَا بَنِي آدَمَ) اے اولاد آدمؑ جیسے عناوین کے ذریعہ لوگوں کو خطاب کیا ہے، اور اپنی ہدایت کو (النَّاسُ وَالْعَالَمِينَ) تمام انسانوں کے

^۱ یہ خطوط تاریخ میں درج ہیں جنہیں ”مکاتیب الرسول“ نامی کتاب میں جمع کر دیا گیا ہے۔

^۲ سورہ بقرہ۔ آیت ۲۱، نساء۔ آیت ۱۷۴، فاطر آیت ۱۵

^۳ سورہ اعراف۔ آیت ۲۶، ۲۷، ۲۸، ۳۱، ۳۵، سورہ یس۔ آیت ۶۰

^۴ سورہ بقرہ۔ ۱۸۵، ۱۸۷، سورہ آل عمران۔ ۱۳۸، ابراہیم۔ ۱، ۵۲، جاثیہ۔ ۲۰، زمر۔ ۴۱، نحل۔ ۴۴، کہف۔ ۵۴، حشر۔ ۲۱۔

^۵ سورہ انعام۔ ۹۰، یوسف۔ ۱۰۴، ص۔ ۸۷، تکویر۔ ۲۷، قلم۔ ۵۲

لئے قرار دیا ہے، اس کے علاوہ بہت سی آیات میں آنحضرت ﷺ کی رسالت کو تمام انسانوں (الناس و العالمین) ^۱ کے لئے مقرر کیا ہے اور ایک آیت میں اس کی دعوت کو ہر اس شخص سے مخصوص، اور شامل ہو جانا ہے جو اس سے باخبر ہو جائے ^۲ اسی طرح دوسرے مقامات پر ادیان آسمانی کے ماننے والوں کو اہل کتاب کے عنوان سے خطاب کیا ہے ^۳ اور انھیں آنحضرت ﷺ کی رسالت کو قبول کرنے کی طرف دعوت دی ہے، نیز آنحضرت ﷺ پر قرآن کے نزول کے حدف کا دوسرے ادیان پر اسلام کی کامیابی کو قرار دیا ہے ^۴۔ ان آیات کو مد نظر رکھتے ہوئے قرآن کی دعوت کے عمومی ہونے اور اسلام کے جہانی ہونے میں کوئی شک باقی نہیں رہتا۔

اسلام کا جاودانی ہونا

گذشتہ آیات جس طرح عمومی کلمات ”بنی آدم، العالمین، الناس“ کے استعمال اور غیر عرب قوموں کو خطاب کرنے کے علاوہ بقیہ آسمانی ادیان کے ماننے والوں کو مخاطب کر کے اسلام کے جہانی ہونے کو ثابت کرتے ہیں، اسی طرح زمان کو مطلق قرار دیتے ہوئے کسی خاص زمانہ سے مخصوص ہونے کی نفی کرتی ہے بلکہ اس آیت کی تعمیر (لیظہ علی الدین ^۵) کسی بھی قسم کے ثبوت کو زائل کر دیتی ہے، اسی سورہ فصلت کی (۴۲) آیت کے ذریعہ استدلال کیا جاسکتا ہے کہ جس میں خدا فرماتا ہے: (وَإِنَّ الْكُتُبَ *عَزِيزًا لَّيَأْتِيَهُ الْبَاطِلُ مِنْ يَدَيْنِهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهِ تَنْزِيلٌ مِّنْ حَكِيمٍ حَمِيدٍ) اور اس نکتہ کی طرف بھی اشارہ کرتی ہے کہ قرآن کبھی بھی مقام اعتبار سے ساقط نہیں ہو سکتا، نیز یہ آیت آنحضرت ﷺ کی خاتمیت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کسی دوسرے نبی اور اس کی شریعت کے ذریعہ دین اسلام کے منسوخ ہونے کو بھی رد کرتی ہے، اس کے علاوہ اسی طلب کے تحت بے شمار روایتیں بھی وارد ہوئیں ہیں: (حلال

^۱ سورہ نساء۔ ۷۹، حج۔ ۴۹، سباء۔ ۲۸

^۲ سورہ انبیاء۔ ۱۰۷، فرقان۔ ۱

^۳ انعام۔ ۱۹

^۴ سورہ آل عمران۔ ۶۵، ۷۰، ۷۱، ۹۸، ۹۹، ۱۱۰، مائدہ۔ ۱۵، ۱۹

^۵ سورہ توبہ۔ ۳۳، فتح۔ ۳۸، صف۔ ۹

^۶ سورہ توبہ۔ ۳۳، فتح۔ ۳۸، صف۔ ۹

محمد حلال الی یوم القیامۃ، و حرامہ حرام الی یوم القیامۃ^۱) جس طرح سے اسلام جہانی ہے اسی طرح سے جاودانی بھی ہے جو دین کی ضروریات میں سے ہونے کے علاوہ کسی بھی دلیل سے بے نیاز ہے۔

چند شبہات کا حل

اسلام کے دشمن جنہوں نے اسلام کو نابود کرنے کے لئے اپنی کسی بھی کوشش سے دریغ نہیں کیا، اور برابر اس سے برسرِ پیکار رہے، اور ہمیشہ اس کے خلاف اپنی مہم جاری رکھی، انہوں نے یہ شبہ ظاہر کیا ہے جن کے ذریعے یہ کہنا چاہتے ہیں کہ اسلام عربوں سے مخصوص ہے اور بقیہ انسانوں کا اس سے کوئی سروکار نہیں۔ انہوں نے اپنے اعتراض کی تائید میں یہ آیت پیش کی ہے کہ جو آنحضرت ﷺ کو اپنے رشتہ داروں کو اکٹھا کر کے انہیں اسلام کی طرف دعوت دینے کا حکم دیتی ہے، اسی طرح سورہ مائدہ کی ۶۹، آیت کو بھی اپنی سند بناتے ہیں کہ جس میں خدا یہود و نصاریٰ اور صائبین کی طرف اشارہ کرنے کے بعد سعادت کے لئے ایمان کو معیار قرار دیتا ہے اور سعادت کے لئے اسلام کو قبول کرنے کی طرف کوئی اشارہ نہیں کرتا، اس کے علاوہ اسلامی فقہ میں اہل کتاب کا شمار مشرکین میں نہیں ہے بلکہ جزیہ کو ادا کرنے کے ذریعہ دامن اسلام میں ان کے مال و جان محفوظ ہیں اور وہ اپنی شریعت کے مطابق اعمال انجام دے سکتے ہیں، لہذا اس طرح انہیں اجازت دینا گویا ان ادیان کی حقانیت کو تسلیم کرنا ہے۔

اس شبہ کے جواب میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ وہ آیت جس میں آنحضرت ﷺ کے رشتہ داروں اور اہل مکہ کا تذکرہ ہے، دراصل وہ آیت آنحضرت ﷺ کی دعوت کے پہلے مرحلہ کو بیان کرنے والی ہے اور اس کے بعد اہل مکہ اور اس کے اطراف میں رہنے والوں اور اسی طرح پھیلتے پھیلتے تمام انسانوں کو اپنے دائرے میں شامل کر لیتی ہے، لہذا ایسی آیت کو ان آیتوں کے لئے (مخصوص کرنے والی) نہیں مان سکتے کہ جو اسلام کے جہانی ہونے پر دلالت کرتی ہیں، اس لئے کہ یہ آیات عمومی طور پر لوگوں کو اپنا مخاطب بناتی ہیں اور انہیں تخصیص سے کوئی سروکار نہیں ہے۔ لیکن سورہ مائدہ کی مذکورہ آیت اس نکتہ کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ تنہا اسی

دین یا فلاں دین سے منسوب ہونا سعادت حقیقی کے حصول کے لئے کافی نہیں ہے بلکہ سعادت کے لئے ایمان واقعی اور ان وظائف پر عمل کرنا بھی ضروری ہے جسے خدا نے اپنے بندوں کے لئے مقرر فرمایا ہے اور ان دلائل کی بنیاد پر جو اسلام کے جہانی اور جاودانی ہونے کو ثابت کرتے ہیں وہ اس امر کی طرف بھی اشارہ کرتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ کے ظہور کے بعد ان قوانین پر عمل ضروری ہے جو آپ پر نازل ہوئے۔ لیکن اہل کتاب کا مشرکین کے مقابلہ میں ممتاز ہونے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ لوگ اسلام کو قبول کرنے اور اس کے قوانین پر عمل کرنے سے معاف کر دئے گئے ہیں، بلکہ ایک دنیوی مصلحت ہے جو ان کے لئے رکھی گئی ہے، بلکہ شیعوں کے اعتقاد کے مطابق یہ چھوٹ بھی ایک معین مدت کے لئے ہے کہ جب امام زمان عجل اللہ تعالیٰ فرجہ الشریف کا ظہور ہوگا تو ان سے یہ اختیار بھی چھین لیا جائے گا اور ان سے بھی اسی طرح کا برتاؤ ہوگا کہ جس طرح مشرکین سے ہوا ہے، اس مطلب کو اس جملہ سے استفادہ کیا جاسکتا ہے (لیظہرہ علی الدین کلمہ)۔

سوالات

- ۱۔ کس صورت میں تمام انسانوں پر اسلام کی پیروی کرنا واجب ہے؟
- ۲۔ اسلام کے جہانی اور جاودانی ہونے پر قرآنی دلائل کیا ہیں؟
- ۳۔ اس مطلب کے لئے ان دلائل کے علاوہ کیا کوئی اور دلائل پیش کئے جاسکتے ہیں؟
- ۴۔ اس امر کی وضاحت پیش کریں کہ وہ آیت جو آنحضرت ﷺ کو ان کے رشتہ داروں کو دعوت اسلام کا حکم دیتی ہے کیا وہ آیت آنحضرت ﷺ کی رسالت کو ان کے رشتہ داروں سے مخصوص ہونے پر دلالت کرتی ہے؟

۵۔ اس مطلب کی وضاحت کریں کہ کیا سورہ مائدہ کی آیت (۶۹) دوسری امتوں کا اسلام کی پیروی سے معاف ہونے پر دلالت کرتی ہے؟

۶۔ کیا اہل کتاب کا اپنی شریعت کے مطابق عمل کرنا شریعت اسلام کے احکام کی پیروی سے معذور ہونے کی دلیل ہے؟

پیشگوئیاں درس

خاتمیت

مقدمہ

۱۔ دین اسلام کے جاودانی ہونے کی وجہ سے شریعت اسلام کا کسی دوسرے نبی کی بعثت سے فسخ ہونے کا احتمال ختم ہو جاتا ہے، لیکن یہ احتمال باقی رہتا ہے کہ کوئی ایسا نبی مبعوث ہو جو خود دین اسلام کی ترویج کرے اور اس کا مبلغ ہو، جیسا کہ گذشتہ انبیاء علیہم السلام میں سے بہت سے نبی ایسی ہی ذمہ داریوں کے پابند تھے یہ انبیاء علیہم السلام خواہ صاحب شریعت نبی کے زمانہ میں رہے ہوں جیسے جناب لوط علیہ السلام، صاحب شریعت پیغمبر جناب ابراہیم علیہ السلام کے زمانہ میں تھے اور ان کی شریعت کے تابع تھے یا بنی اسرائیل کے درمیان مبعوث ہونے والے اکثر انبیاء علیہم السلام صاحب شریعت نبی کے بعد مبعوث ہوئے اور ان کی شریعت کے تابع تھے اسی وجہ سے آنحضرت ﷺ کی خاتمیت کے لئے ایک جداگانہ بحث کرنا ضروری ہے تاکہ ایسے توہمات ختم ہو جائیں۔

خاتمیت پر قرآنی دلائل

اسلام کے ضروریات میں سے ایک یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام کا سلسلہ آنحضرت ﷺ پر تمام ہو گیا ہے یعنی (آنحضرت ﷺ خاتم میں) اور آپ کے بعد نہ کوئی نبی مبعوث ہوا ہے اور نہ ہی آئندہ کوئی نبی مبعوث ہونے والا ہے یہاں تک کہ غیر مسلموں کو بھی معلوم ہے کہ یہ اسلام کے اعتقادات میں سے ہے اور اس پر ایمان رکھنا ہر مسلمان کا فرض ہے اسی وجہ سے دوسری ضروریات کی طرح اس کے لئے استدلال کی ضرورت نہیں ہے، اس کے علاوہ اس مطلب کو قرآن اور متواتر دلیلوں کے ذریعہ ثابت کیا جاسکتا ہے۔ جیسا کہ قرآن کریم فرماتا ہے: (مَا كَانَ مُحَمَّدٌ أَبَا أَحَدٍ مِّن رِّجَالِكُمْ وَلَكِن رَّسُولَ اللَّهِ وَخَاتَمَ النَّبِيِّينَ) (۱) محمد ﷺ تم مردوں میں سے

کسی کے باپ نہیں ہیں بلکہ اللہ کے رسول اور خاتم النبیین ہیں۔ یہ آیت واضح انداز میں آپ کے خاتم ہونے کو بیان کرتی ہے، لیکن اسلام کے دشمنوں نے اس آیت پر دو اعتراض کئے ہیں۔ پہلا اعتراض یہ ہے کہ ہم یہ مان لیتے ہیں کہ اس (کلمہ خاتم) کے وہی معنی مراد ہیں جو مشہور ہیں نیز یہ آیت سلسلہ انبیاء علیہم السلام کے ختم ہونے کی خبر بھی دے رہی ہے لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ رسولوں کی بعثت کا سلسلہ بھی ختم ہو گیا ہے۔ دوسرا اعتراض یہ ہے کہ بالفرض اگر ہم تسلیم کر لیں کہ مفاد آیت وہی ہے جو آپ نے بیان کیا ہے یعنی آنحضرت سلسلہ نبوت کو ختم کرنے والے ہیں، لیکن اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ نبوت کے ساتھ، رسالت کا سلسلہ بھی ختم ہو جائے،

پہلے اعتراض کا جواب یہ ہے کہ خاتم کے معنی ختم کرنے اور تمام کرنے والے کے ہیں اور خاتم کو اسی وجہ سے انگوٹھی کے معنی میں استعمال کیا جاتا ہے کہ اس کے لگنے کے بعد تحریر مکمل ہو جاتی ہے دوسرے اعتراض کا جواب یہ ہے کہ جو بھی نائنہ خدا مقام رسالت سے سرفراز ہو وہ مقام نبوت کا بھی مالک ہے، لہذا انبیاء علیہم السلام کے سلسلہ کے ختم ہوتے ہی رسولوں کا سلسلہ بھی تمام ہو جاتا ہے اور جیسا کہ ہم نے پہلے بھی بیان کیا کہ اگرچہ مفہوم نبی رسول سے اعم نہیں ہے لیکن یہاں پر خود نبی رسول سے عام ہے۔

خاتمیت پر روائی دلائل

آنحضرت ﷺ کی خاتمیت کے سلسلہ میں سیکڑوں روایات موجود ہیں جو اس بات کی وضاحت اور تاکید کرتی ہیں جیسے کہ حدیث منزلت جو آنحضرت ﷺ سے نقل ہوئی ہے اسے شیعہ اور سنی علماء نے تواتر کے ساتھ نقل کی ہیں جس کی وجہ سے اس کی صحت اور مضمون میں کسی بھی قسم کا شبہ باقی نہیں رہتا اور وہ روایت یہ ہے۔ جب آنحضرت ﷺ نے جنگ تبوک کے لئے مدینہ سے خارج ہونا چاہا تو حضرت علی علیہ السلام کو مسلمانوں کی دیکھ بھال اور ان کے امور کی انجام دہی کے لئے اپنا نائب بنا کر مدینہ چھوڑ

^۱ سورۃ احزاب۔ آیت ۴۰۔

^۲ اس کتاب کے انتیسویں درس کی طرف رجوع کیا جائے۔

گئے، لیکن حضرت علی علیہ السلام اس فیض الہی سے محروم ہونے کے سبب غمگین و رنجیدہ خاطر تھے اور آپ کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے، یہ دیکھ کر حضرت رسول اکرام ﷺ نے آپ سے فرمایا۔ ”أَمَا تَرْضَىٰ أَنْ تَكُونَ مِنِّي بِمِثْلِ هَارُونَ مِنْ مُوسَىٰ إِلَّا أَنَّهُ لَا نَبِيَّ بَعْدِي كَمَا تَمَّ اسْمُ بَاتٍ سَ رَاضِي نَہیں ہو کہ تم کو مجھ سے وہی نسبت ہے جو ہارون علیہ السلام کو موسیٰ علیہ السلام سے تھی؟ اور اسی جملہ کے فوراً بعد فرمایا: (إِلَّا أَنَّهُ لَا نَبِيَّ بَعْدِي) بس فرق اتنا ہے کہ میرے بعد کوئی نبی نہیں ہوگا یہ جملہ آپ کی خاتمت کے سلسلہ میں بھی ہر قسم کے شبہ کو دفع کر دیتا ہے۔

ایک دوسری روایت میں آپ ﷺ سے نقل ہوا ہے کہ آپ فرماتے ہیں: (إِنَّمَا النَّاسُ إِنْ لَمْ يَلْبَسُوا لِبَاسَ بَعْدِي وَلَا أُمَّةَ بَعْدِي)؛ اے لوگو! میرے بعد کوئی نبی اور تمہارے بعد کوئی امت نہیں آئے گی۔ اسی طرح ایک دوسری روایت میں فرماتے ہیں: (إِنَّمَا النَّاسُ إِنْ لَمْ يَلْبَسُوا لِبَاسَ بَعْدِي وَلَا أُمَّةَ بَعْدِي) اے لوگو! میرے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا اور میری سنت کے بعد کوئی سنت نہیں ہوگی

ختم نبوت کا راز

جیسا کہ ہم نے اس مطلب کی طرف گذشتہ صفحات پر بھی اشارہ کیا ہے کہ پے در پے نبیوں کے مبعوث ہونے کی حکمت ایک طرف زمین کے مختلف گوشوں میں رہنے والوں تک پیغامات الہی کا پہنچانا اس قدر آسان نہیں تھا اور دوسری طرف اجتماعی روابط کا پھیلنے کی وجہ سے حالات کا پیچیدہ ہو جانا کہ جس کے سبب نئے آئین اور جدید قوانین کی ضرورت تھی، اس کے علاوہ زمانہ کے گزرنے کے ساتھ افراد یا جماعتوں کے درمیان تبدیلی اور جاہلانہ دخالتوں کی وجہ سے، وجود میں آنے والی تحریفات کا تقاضا یہ تھا کہ کسی جدید نبی کی بعثت کے ذریعہ تعلیم الہی کو آگے بڑھایا جائے اور تحریفات کا خاتمہ ہو۔ لہذا جب پوری کائنات کے لئے تبلیغ رسالت

^۱ بحار الانوار - ج ۳۷، ص ۲۵۴، ۲۸۹۔ صحیح بخاری - ج ۳، ص ۵۸۔ صحیح مسلم - ج ۲، ص ۳۲۳۔ سنن ابن ماجہ - ج ۱، ص ۲۸۔ مستدرک حاکم - ج ۳، ص ۱۰۹۔ مسند ابن حنبل - ج ۱، ص ۳۳۱ و ج ۲، ص ۴۳۷، ۳۶۹۔

^۲ وسائل الشیعہ - ج ۱، ص ۱۵۔ خصال - ج ۱، ص ۳۲۲ خصال - ج ۲، ص ۴۸۷۔

^۳ وسائل الشیعہ، ج ۱۸، ص ۵۵۵۔ من لا یحضرہ الفقی، ج ۴، ص ۱۶۳۔ بحار الانوار، ج ۲۲، ص ۵۳۱۔ کشف الغمہ، ج ۱، ص ۲۱۔

الہی کی ذمہ داری صرف ایک رسول اور اس کے حامیوں اور جانشینوں کی مدد سے ممکن ہو جا اور اس کی شریعت کے احکام و قوانین حال و آئندہ کی احتیاجات کے جواب دینے پر قادر ہوں نیز مسائل جدید کو حل کرنے کے لئے اس شریعت میں آنی صلاحیت ہو اور اس کے علاوہ تحریف سے محفوظ رہنے کی ضمانت اسے دی گئی، ہو تو پھر اس صورت میں کسی دوسرے پیغمبر کی بعثت کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ لیکن بشری علوم ایسے شرائط کی تشخیص سے ناتواں اور عاجز ہے، فقط خدا ہے جو اپنے لاتناہی علم کی وجہ سے ایسے زمان و شرائط کے تحقق سے باخبر ہے جیسا کہ اس نے آخری نبی اور اس کی کتاب کے ساتھ انجام دیا۔

لیکن سلسلہ نبوت کے ختم ہو جانے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ خدا اور اس کے بندوں کے درمیان اب کوئی رابطہ نہیں رہتا، بلکہ اگر خدا چاہے تو کسی بھی وقت اپنے شائستہ بندوں کو علم غیب کے ذریعہ اضافہ کر سکتا ہے اگرچہ وحی کی صورت ہی میں کیوں نہ ہو، جیسا کہ شیعوں کے عقیدہ کے مطابق خدا نے ائمہ علیہم السلام کو ایسے علوم سے نوازا ہے، انشاء اللہ آئندہ دروس میں امامت سے متعلق مباحث کے سلسلہ میں بیان کریں گے۔

چند شبہات کے جوابات

گذشتہ بیان سے یہ سمجھ میں آتا ہے کہ ختم نبوت کا راز۔ ایک یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ اپنے اصحاب کی مدد سے پیغامات الہی کو تمام انسانوں تک پہنچا سکتے تھے دوسرے یہ کہ آپ ﷺ کی کتاب (قرآن) کے سلسلہ میں کسی بھی قسم کی تحریف سے محفوظ رہنے کی ضمانت لے لی گئی ہے، دوسرے یہ کہ۔ شریعت اسلام تا قیامت پیش آنے والی ضرورتوں کو پورا کر سکتی ہے۔ لیکن یہ ممکن ہے کہ ان مطالب کے پیش نظر کوئی یہ شبہ پیش کرے، جیسا کہ گذشتہ ادوار میں اجتماعی اور اقتصادی روابط کے پیچیدہ ہونے کی وجہ سے جدید احکامات یا ان میں تغیرات کی ضرورت پڑھ جاتی تھی، یا پھر کسی دوسرے نبی کی بعثت کی ضرورت ہوتی تھی اسی طرح آنحضرت ﷺ کے بعد بھی نمایاں تغیرات وجود میں آئے ہیں، اور اجتماعی روابط پیچیدہ ہو گئے ہیں، لہذا اس صورت میں ہمیں کہاں سے معلوم کہ آئندہ حالات کے بدلنے کی وجہ سے کسی دوسرے نبی کی بعثت کی ضرورت نہ پڑے؟ اس شبہ کے جواب میں ہم صرف اتنا کہیں

گے کہ کس طرح کے تغیرات بنیادی قوانین کے بدل جانے کے موجب ہوتے ہیں، اس کی تشخیص بشر کے ہاتھ میں نہیں ہے اس لئے کہ ہمیں احکام و قوانین کی حکمتیں اور علتوں پر تسلط نہیں ہے بلکہ ہم نے تو اسلام کے جاودانی ہونے کے دلائل آنحضرت ﷺ کی خاتمیت کے ذریعہ کشف کئے ہیں کہ اب اس کے بعد اسلام کے بنیادی قوانین کو بدلنے کی ضرورت نہیں ہے۔ البتہ ہم بعض اجتماعی مسائل کی پیدائش کا انکار نہیں کرتے کہ جن کے لئے نئے قوانین کی ضرورت ہے، لیکن اسلام نے اپنے مسائل کے قوانین کو وضع کرنے کے لئے ایسے اصول و قواعد وضع کر دئے کہ جس کی مدد سے باصلاحیت افراد ضروری احکامات کو حاصل کر کے انہیں جاری کر سکتے ہیں، اور ان مطالب کی تفصیلی بحث کو فقہ اسلام کی بحث حکومت اسلامی (امام معصوم اور ولی فقیہ) کے اختیارات کے حصہ میں تلاش کیا جاسکتا ہے۔

سوالات

- ۱۔ اسلام کے جاودانی ہونے کے اثبات کے بعد خاتمیت کے سلسلہ میں بحث کی کیا ضرورت ہے؟
- ۲۔ قرآنی دلیل کے ذریعہ کیسے خاتمیت کو ثابت کیا جاسکتا ہے؟
- ۳۔ اس دلیل کے سلسلہ میں موجودہ شہادت کو ذکر کریں اور ان کے جوابات تحریر فرمائیں؟
- ۴۔ خاتمیت پر دلالت کرنے والی روایتوں میں سے تین روایت کو ذکر کریں؟
- ۵۔ کیوں آنحضرت ﷺ کی بعثت کے بعد سے انبیاء علیہم السلام کی بعثت کا سلسلہ ختم ہو گیا؟
- ۶۔ کیا ختم نبوت کا مطلب یہ ہے کہ اس کے بعد، علوم سے استفادہ کا راستہ بند ہو گیا ہے؟ کیوں؟
- ۷۔ کیا آنحضرت کے بعد وجود میں آنے والے سماجی تغیرات کے لئے جدید شریعت کی ضرورت نہیں ہے؟ کیوں؟

۸۔ جدید مسائل کے پیدا ہونے کی وجہ سے سماج کی ضرورتوں کو آئین اسلام کے ذریعہ کیسے حل کیا جاسکتا ہے۔

چھٹیواں درس

امامت

مقدمہ

حضرت رسول اکرم ﷺ مکہ سے مدینہ کی طرف ہجرت کر کے جب اس شہر میں پہنچے تو اس شہر کے لوگوں اور وہاں بسنے والے مہاجر مسلمانوں نے بڑے زور و شور سے آپ کا استقبال کیا اسی وجہ سے انھیں انصار اور ہجرت کرنے والوں کو مہاجر کا نام دیا گیا، آپ نے وہاں ایک اسلامی سماج کی بنیاد ڈالی اور اس کی باگ ڈور اپنے ہاتھوں میں لی، مسجد النبی محل عبادت اور تبلیغ رسالت کے علاوہ لوگوں کی تعلیم و تربیت کا مرکز ہونے کے ساتھ مہاجروں اور ناداروں کی پناہ گاہ بھی تھی، وہاں پر لوگوں کی اقتصادی و معاشرتی ضرورتوں کو پورا کیا جاتا تھا، اس طرح وہ جگہ محلِ قنات اور جھگڑوں کے حل و فصل اور جنگ کے لئے مشورہ، فوج کو میدان جنگ کی طرف حرکت دینے اور ان کی مدد کرنے کا مرکز تھی، غرض کہ حکومت کے تمام مسائل اسی مسجد میں حل و فصل ہوتے تھے بلکہ لوگوں کی دنیا اور ان کے دین کے تمام امور آنحضرت ﷺ کے ہاتھ میں تھے اور خود مسلمان بھی آپ کی اطاعت میں کوشاں رہتے تھے اس لئے کہ خدا نے آنحضرت ﷺ کی اطاعت کا مطلق حکم دیا تھا بلکہ خدا نے سیاسی، قضائی اور جنگی مسائل میں آنحضرت ﷺ کی اطاعت کے لئے نہایت تاکید کی تھی^۱۔

ایک دوسری تعبیر کے مطابق آنحضرت ﷺ منصب نبوت و امامت نیز تعلیم و تربیت کے فرائض اور سماج کے امور کو حل و فصل کرنے پر بھی مامور تھے، اور جس طرح اسلام و وظائف عبادی، سیاسی، اخلاقی، اقتصادی، اور حقوقی وغیرہ سے سرفراز ہے، اسی

^۱ سورۃ آل عمران- ۱۳۲، نساء- ۱۲، ۸۰، مائدہ- ۹۲، انفعال- ۴۶، توبہ- ۷۱، نور- ۵۱، ۵۴، ۵۶، احزاب- ۶۶، ۷۱، حجرات- ۱۴، فتح- ۱۷، ۱۶، محمد- ۳۳، مجادلہ- ۱۲، ممتحنہ- ۱۲، تغابن- ۱۲، جن- ۲
^۲ سورۃ آل عمران- ۱۵۲، نساء- ۴۲، ۵۹، ۶۵، ۱۰۵، مائدہ- ۴۸، حج- ۶۷، احزاب- ۳۶، ۶، مجادلہ- ۸، ۹، حشر- ۷۔

طرح آنحضرت ﷺ تعلیم و تربیت اور تبلیغ کے وظائف کو بیان کرنے کے ذمہ دار ہونے کے علاوہ قوانین الہی کو جاری کرنے کے عہدہ دار اور حکومتی منصب کے مالک تھے۔ اس لئے کہ یہ امر آشکار ہے کہ وہ دین جو تاقیامت تمام انسانوں کی رہبری کا دعویدار ہے وہ ان مسائل کے مقابل میں سہل انگاری سے کام نہیں لے سکتا، اور وہ سماج جو اس دین کی بنیادوں پر قائم ہو وہ سیاسی اور حکومتی مناصب سے مبرا نہیں ہو سکتا وہ منصب جو عنوان امامت کے ضمن میں شمار کئے جاتے ہیں۔ لیکن اصل مسئلہ یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ کے بعد کون اس مقام کا عہدہ دار و سزاوار ہے کون اسے سنبھالے؟ کیا جس طرح خدا نے یہ منصب اپنے رسول ﷺ کو عطا کیا تھا اسی طرح کسی اور کو عطا کیا ہے؟ کیا یہ منصب صرف اسی صورت میں قابل قبول ہے کہ جب خدا اُسے عطا کرے؟ یا پھر خدا کی جانب سے اس منصب کو عطا کرنا صرف رسول ﷺ سے مخصوص تھا، اور آپ کے بعد اس منصب کی ذمہ داری کو خود عوام تعین کرے؟ کیا عوام کو ایسا کوئی حق ہے یا نہیں؟۔

اور یہی مسئلہ سنی اور شیعہ حضرات کے درمیان نقطہ اختلاف ہے، اس لئے کہ شیعوں کا عقیدہ ہے کہ یہ منصب الہی خود خدا کی جانب سے باصلاحیت لوگوں کو عطا کیا جاتا ہے، لہذا آنحضرت ﷺ نے خدا کی جانب سے اس امر کو انجام دیا ہے اور حضرت علی علیہ السلام کو اپنا بلا فصل خلیفہ بنا دیا نیز ان کے بعد ان کے گیارہ فرزندان کو اس منصب کی عہدہ داری کے لئے مقرر فرما دیا تھا، لیکن اہل سنت کا نظریہ یہ ہے کہ امامت بھی رسالت و نبوت کے منصب کی طرح آنحضرت ﷺ کی رحلت کے ساتھ تمام ہو گیا ہے، اور اس کے بعد سے امام کا انتخاب لوگوں کے اختیار میں دے دیا گیا ہے، یہاں تک کہ بعض اہل سنت کے بزرگ علماء کا کہنا ہے کہ اگر کوئی اسلحہ کی بنیاد پر مسلط ہو جائے تو اس کی اطاعت کرنا واجب ہے۔ لہذا معلوم ہے کہ یہ نظریہ جباروں اور ظالموں کے لئے ایک موقع غنیمت ہے جو اپنے زور و ظلم کی بنیاد پر جس حد تک چاہیں سوء استناد کر سکتے ہیں، اور اس طرح مسلمانوں کے ضعف اور ان کی بد بختی کا سبب بن سکتے ہیں۔ درحقیقت اہل سنت نے امامت کو خدا کی جانب سے منصوب کئے بغیر قبول کر کے دین اور سیاست

^۱ ابو یعلیٰ کی کتاب "الاحکام السلطانیہ" اور ابو القاسم سمرقندی کی کتاب کا ترجمہ السواء والاظم" ص ۴۰، ص ۴۲ کی طرف رجوع کریں۔

میں جدائی کی بنیاد ڈالی ہے، اور شیعوں کے عقیدہ کے مطابق یہی نقطہ اختلاف اسلام کی صحیح راہ اور خدا کی عبادت سے انحراف کا باعث بنا ہے، جس کی وجہ سے آج تک بلکہ آئندہ بھی ہزاروں ناگوار حوادث وجود میں آتے رہیں گے۔ اسی وجہ سے ہر فرد مسلمان پر واجب ہے کہ اس مسئلہ کے سلسلہ میں تعصب اور تقلید سے پرہیز کرتے ہوئے تحقیق کرے اور مذہب حق کو پہچان کر اس کی شدت سے حمایت کرے اس مسئلہ میں یہ امر آشکار ہے کہ جان اسلام کی مصلحت کو پیش نظر رکھنا چاہیے، بلکہ دشمنان اسلام کے لئے دو مذہبوں کے اختلافات اور تفرقہ سے فائدہ اٹھانے کا موقع نہیں دینا چاہئے، اور کسی بھی صورت میں کوئی بھی ایسا عمل انجام نہیں دینا چاہیے جو مسلمانوں میں اختلاف کا باعث بنے، نیز کفار کے مقابلہ میں مسلمانوں کا اتحاد باقی رہ جائے، اس لئے کہ اس تفرقہ کا نقصان تمام مسلمانوں کو اٹھانا ہوگا اور مسلمانوں کے معاشرہ کے ضعیف ہونے کے علاوہ اس سے کوئی اور نتیجہ ظاہر نہیں ہو سکتا، لیکن اس طرح مسلمانوں کے درمیان حفظ وحدت کی خاطر مذہب حق کی شناخت کا راستہ بند نہیں ہونا چاہئے تاکہ مسائل امامت کے سلسلہ میں طالبان حق تحقیق سے محروم نہ ہو سکیں، اس لئے کہ حق و حقیقت کو پالینا مسلمانوں کی دنیوی اور اخروی سعادت کا باعث ہے۔

مفہوم امامت

امامت لغت میں رہبری کے معنی میں ہے چنانچہ جو بھی راہ حق میں یا راہ باطل میں کسی گروہ کی رہبری کرے اسے امام کہا جاتا ہے جیسا کہ قرآن کریم میں کفار کے لئے کلمہ ”اَعْمَہُ الْکُفْرِ“ استعمال ہوا ہے اور نمازی جس شخص کی اقتدا کرتے ہیں اسے امام جماعت کہا جاتا ہے۔ لیکن علم کلام میں امامت یعنی دینی اور دنیوی امور میں سماج اسلامی پر ریاست عام، اس تعریف میں دنیوی امور کا شامل کرنا دائرہ امامت کی وسعت کی بنا پر ہے وگرنہ سماج اسلامی کے دنیوی امور کی تدبیر دین اسلام کا ایک جزء ہے۔

^۱ خدا کا شکر ہے کہ بہت بڑے بڑے دانشمندیوں نے اس راہ میں بڑی تحقیق کی ہے جسے مختلف زبانوں میں مختلف انداز میں مرتب کیا ہے اور حق کے طلبکاروں کے لئے راستہ بالکل ہموار کر دیا ہے، جس میں سے عبقات الانوار، الغدیر، دلائل الصدق غایہ المرام اور اثبات الہدایا، کا نام لیا جاسکتا ہے، لیکن وہ لوگ کہ جن کے پاس فرصت نہیں ہے وہ لوگ کتب البیِّنات کا مطالعہ کریں جو سنی اور شیعہ عالموں کے درمیان مکاتبات پر مشتمل ہے، اور اسی طرح ”اصل الشیعہ و اصولہا“ کا مطالعہ کریں، ان دونوں کتابوں کا فارسی میں ترجمہ ہو چکا ہے۔

^۲ سورۃ توبہ۔ آیت۔ ۱۲

مذہب تشیع کے لحاظ سے ایسی حکمرانی اسی وقت صحیح ہوگی کہ جب خداوند عالم کی طرف سے عطا ہوئی ہو اور اصلۃً یا نیابتاً ایسے مقام کا مالک وہی ہو سکتا ہے جو احکام اسلامی کو بیان کرنے میں خطاؤں سے معصوم اور گناہوں سے دور ہو، بلکہ امام کے لئے نبوت و رسالت کے علاوہ تمام الہی منصبوں پر فائز ہونا ضروری ہے تاکہ، قوانین احکام اور معارف اسلامی کے سلسلہ میں اس کے بیانات حجت ہوں اور حکومتی پیمانہ پر اس کے قوانین واجب الطاعتہ قرار پائیں۔ اس بیان کے لحاظ سے شیعہ اور سنی حضرات کے درمیان موضوع امامت کے تحت اختلاف تین چیزوں میں ظاہر ہوتا ہے۔

۱۔ اول یہ کہ امام خدا کی جانب سے منصوب ہونا چاہئے۔

۲۔ دوم یہ کہ علوم الہی کا مالک اور اس کا خطاؤں سے محفوظ و مصون ہونا ضروری ہے۔

۳۔ سوم یہ کہ گناہوں سے معصوم ہونا بھی ضروری ہے۔

البتہ معصوم ہونا امامت کے مساوی نہیں ہے، اس لئے کہ شیعوں کے اعتقاد کے مطابق حضرت زہرا ۲۳۶ بھی معصوم تھیں، اگرچہ مقام امامت کی مالک نہیں تھیں، جیسا کہ حضرت مریم ۲۳۶ بھی مقام عصمت پر فائز تھیں اور شاید اولیاء الہی کے درمیان اور بھی افراد موجود ہوں جو عصمت درجہ پر فائز ہوں کہ جن کی ہمیں کوئی اطلاع نہ ہو، بلکہ بنیادی اعتبار سے معصوم شخص کا پہچانا خدا کی جانب سے اطلاع کے بغیر ممکن نہیں ہے۔

سوالات

۱۔ آنحضرت ﷺ منصب نبوت و رسالت پر فائز ہونے کے علاوہ اور کن مناصب پر فائز تھے؟

۲۔ شیعہ اور سنی حضرات کے درمیان نقطہ اختلاف کیا ہے؟

۳۔ نصب الہی کے بغیر امامت کو قبول کر لینے کی وجہ سے کیسے نتائج سامنے آسکتے ہیں؟

۴۔ امامت کے لغوی اور اصطلاحی معنی کیا ہیں؟

۵۔ امامت کے بنیادی مسائل کیا ہیں؟

میتھواں درس

امام علیہ السلام کی احتیاج

مقدمہ

وہ لوگ جو اعتقادی مسائل میں گہری فکر کے مالک نہیں ہیں، وہ یہ خیال کرتے ہیں کہ شیعوں اور سنیوں کے درمیان اختلاف صرف یہ ہے کہ شیعہ حضرات معتقد ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے اپنے بعد امام علی علیہ السلام کو اپنا جانشین مقرر کر دیا تھا لیکن سنی حضرات معتقد ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے حضرت علی علیہ السلام کو اپنا جانشین مقرر نہیں کیا تھا، بلکہ پہلے مرحلہ میں خود لوگوں نے جانشین مقرر کیا، اور دوسرے مرحلہ میں اسی جانشین نے اپنے لئے دوسرے جانشین کا انتخاب کیا، اور تیسرے مرحلہ میں جانشین کا انتخاب چھ لوگوں پر مثل شوری کو سوپ دیا گیا تھا، اور خلیفہ چہارم کو پھر خود لوگوں نے انتخاب کیا، لہذا مسلمانوں کے درمیان خلیفہ کی تعیین کے لئے کوئی روش نہیں ہے اسی وجہ سے خلیفہ چہارم کے بعد جس کے پاس بھی فوجی طاقت تھی وہ خلیفہ بن بیٹھا، جیسا کہ آج غیر مسلمان مالک میں ہوتا ہے۔

یا ایک دوسری تعمیر کے مطابق شیعہ حضرات خلیفہ اول کی تعیین کے سلسلہ میں اسی روش کے قائل ہیں جو خلیفہ دوم کو معین کرنے کے لئے اپنائی گئی تھی، صرف فرق اتنا ہے کہ وہاں آنحضرت ﷺ کی بات کو لوگوں نے نہیں مانا، لیکن خلیفہ دوم کے سلسلہ میں خلیفہ اول کی بات سب نے مان لی۔ لیکن ہم یہاں پر ان سوالات سے صرف نظر کرتے ہیں کہ۔

۱۔ خلیفہ اول کو خلیفہ دوم کی تعیین کا حق کس نے دیا؟ اور کیوں رسول اللہ ﷺ نے (اہل تسنن کے اعتقاد کے مطابق) خلیفہ کی تعیین میں اسلام کا خیال نہیں رکھا، اور کیوں ایک مسلمان سماج کو سرپرست کے بغیر تنہا چھوڑ دیا، حالانکہ آپ جب بھی مدینہ سے

خارج ہوتے تھے اپنے لئے کوئی جانشین مقرر فرمادیتے تھے، اس کے علاوہ خود آنحضرت ﷺ اپنے بعد سر اٹھانے والے قتلوں سے باخبر تھے، اس طرح کے سوالات سے چشم پوشی کرتے ہوئے اس امر کی طرف توجہ دلانا ضروری ہے کہ سنی اور شیعہ حضرات کے درمیان اختلاف کیا یہ ہے کہ امامت ایک دینی مقام اور ایک الہی منصب ہے کہ وہ جسے چاہے منصوب کرے یا پھر ایک دنیوی سلطنت اور اجتماعی عوام کے تابع ہے؟ اور شیعوں کا عقیدہ ہے کہ آنحضرت ﷺ اپنے جانشین کو معین کرنے میں متقل نہیں تھے بلکہ آپ نے اسے خدا کے فرمان کے مطابق انجام دیا ہے دراصل ختم نبوت کی حکمت امام معصوم علیہ السلام کو معین کرنے سے مربوط ہے جس کے ذریعہ آنحضرت ﷺ کے بعد اسلامی سماج کی مشکلات حل ہو سکتی ہیں۔

اس مطلب سے یہ نکتہ واضح ہو جاتا ہے کہ کیوں شیعوں کے نزدیک فرعی ہونے کے بدلے امامت ایک ”اصل اعتقادی“ ہے اور کیوں وہ لوگ ان شرائط (علم خدادادی) عصمت (خدا کا منصوب کرنا) کو امام میں ہونا ضروری سمجھتے ہیں؟ اور کیوں شیعہ اعتقاد مفاہیم احکام الہی کی شناخت اور اسلامی سماج پر فرما راوائی جیسے مفاہیم اس طرح سے ملے ہوئے ہیں، کہ گویا ان تمام مفاہیم پر مفہوم امامت چھایا ہوا ہے لہذا ہم یہاں پر مفہوم امامت اور عقائد تشیع کے درمیان اس عقیدہ کی موقعیت اور اس کی حجت کے سلسلہ میں بحث کرتے ہیں۔

وجود امام علیہ السلام کی ضرورت

بائیسویں درس میں یہ نکتہ روشن ہو گیا تھا کہ خلقت انسان کا ہدف اسی وقت کامل ہو سکتا ہے کہ جب وحی کے ذریعہ اس کی ہدایت کی جائے اور حکمت الہی کا تقاضا تھا کہ وہ انسانوں کی ہدایت کے لئے پیغمبروں کو مبعوث کرے تاکہ وہ انسانوں کو دنیا و آخرت میں سعادت مندی کا درس دے سکیں، نیز انسانوں کو درجہ کمال تک تربیت کریں، اور اگر ممکن ہو تو سماج میں احکام الہی کو جاری کریں۔ اور چونتیسویں اور پینتیسویں درس میں اس امر کو روشن کر دیا گیا ہے کہ دین اسلام، جاودانی، ابدی اور نسخ نہ ہونے والا دین ہے، اور آنحضرت ﷺ کے بعد کسی نبی کی بعثت وقع نہیں ہو سکتی، اور ختم نبوت بعثت انبیاء علیہم السلام کی حکمت سے اسی وقت سازگار

ہے کہ جب آخری شریعت تمام انسانوں کی ضروریات کو پورا کر سکے، اور تاقیامت اس کی بقا کی ضمانت ہو۔ یہ ضمانت قرآن میں موجود ہے اور خدا نے اس کتاب کو کسی بھی قسم کی تحریف سے محفوظ رکھنے کی ضمانت لی ہے، لیکن قرآن کی آیات سے تمام احکامات آشکار نہیں ہیں، نماز کی رکعات کی تعداد اور اسے انجام دینے کی کیفیت اس طرح اور بھی بہت سے متجربات ہیں کہ جن کی کشتیوں کو قرآن نے بیان نہیں کیا، اس کے علاوہ خود قرآن نے بھی احکامات کی تفصیل بیان نہیں کی ہے، بلکہ یہ کام آنحضرت ﷺ کے سپرد تھا، تاکہ جو علم خدا نے (وحی کے علاوہ) آپ کو عطا فرمایا تھا، اس کی مدد سے تشریح فرماتے اسی وجہ سے آنحضرت ﷺ کی نسبت کا شمار اسلام کو پہچاننے والے اصلی منابع میں سے ہوتا ہے۔

لیکن آپ کی زندگی کی دشواریاں، جیسے شعب ابی طالب کے تین سال، اور دس سال دشمنان اسلام سے جنگ کے دوران، آپ کو اجازت نہیں دی، کہ تمام احکامات الہی کی تفصیلات کو بیان کرتے، اور جو کچھ اصحاب نے آپ سے معلوم کیا تھا، اس کا بھی سالم رہ جانا خطرے سے خالی نہیں تھا، یہاں تک کہ وضو کا مسئلہ جو آج تک اختلاف کا شکار ہے اسے آنحضرت ﷺ نے مسلمانوں کے درمیان سالہا انجام دیا تھا، لہذا جب احکام علی کا یہ حال ہے، جبکہ یہ احکام ہمیشہ لوگوں کی نظروں کے سامنے اور ان کی ضروریات میں سے ہیں، جس میں تحریف آسان نہیں ہے، تو پھر پیچیدہ اور سخت ترین احکامات خصوصاً وہ احکامات جو دنیا پرستوں اور ہوسرانوں کے مخالف میں ان میں تحریف کے امکانات کہیں زیادہ موجود ہیں ان نکات کے پیش نظر یہ امر آشکار ہو جاتا ہے کہ دین اسلام اسی وقت دین کامل اور تاقیامت تمام انسانوں کی ضروریات پورا کرنے والا بن سکتا ہے کہ جب اس میں ان ضروری مصلحتوں کو پورا کرنے والے اسباب موجود ہوں وہ مصلحتیں کہ جو آنحضرت ﷺ کی رحلت کے بعد خطرات کا شکار ہوئیں، اور یہ مشکل آنحضرت ﷺ کی طرف جانشین کے معین کئے بغیر حل نہیں ہو سکتی تھی، اور جانشین بھی ایسا ہو جو علوم الہی سے آراستہ اور احکامات کو اس طرح بیان کرے، جس طرح وہ نازل ہوئے ہیں، نیز عصمت کی صفت سے مزین بھی ہو تاکہ نفسانی اور شیطانی حلات کا شکار نہ ہو

^۱ سورہ بقرہ آیت ۱۵۱، آل عمران- ۱۶۴، جمعہ- ۲، نحل- ۶۴، احزاب- ۲۱، حشر- ۷

^۲ علامہ امینی نے الغدير میں سات سو احادیث گھڑنے والوں کے نام ذکر کئے ہیں کہ جن میں سے بعض کی طرف ایک لاکھ احادیث کے گھڑنے کی نسبت دی گئی ہے (الغدير ج ۵ ص ۲۰۸)

اور دین میں جان بوجھ کر کوئی تحریف نہ کرے، اس کے علاوہ آنحضرت ﷺ کی طرح لوگوں کی تربیت کر سکے اور انھیں کمال کی آخری منازل تک رہنمائی کر سکے اور اگر شرائط جمع ہو جائیں حکومت کی باگ ڈور سنبھال کر احکام الہی کو جاری کرے اور جہان میں حق و عدالت کو قائم کرے۔

نتیجہ

ختم نبوت اسی وقت حکمت الہی سے سازگار ہو سکتی ہے کہ جب اے امام معصوم کے نصب سے مربوط کیا جائے جو نبوت و رسالت کے علاوہ آنحضرت ﷺ کے تمام صفات سے متصف ہو۔ اس طرح وجود امام کی ضرورت بھی ثابت ہو جاتی ہے اور علوم الہی سے آراستہ ہونے کے علاوہ مقام عصمت پر فائز ہونے کی ضرورت بھی، نیز امام کا خدا کے فرمان کے مطابق منصوب ہونا بھی صرف اس لئے ہے کہ اے معلوم ہے کہ کہاں منصب امامت کو قرار دے بلکہ وہی بندوں کی ولایت کا مالک ہے اور اس میں اتنی استطاعت ہے کہ وہ اس منصب کو باصلاحیت لوگوں کو عطا کر دے۔ اس مقام پر اس نکتہ کی طرف توجہ دینا ضروری ہے کہ اہل سنت امام کی بیان کی گئی خصوصیات میں سے کسی بھی خصوصیت کے قائل نہیں ہیں، اور نہ ہی انھیں اس بات کا دعویٰ ہے کہ وہ خدا اور رسول ﷺ کی طرف سے منصوب ہوئے ہیں، نیز مقام عصمت پر فائز ہونے اور علوم الہی سے آراستہ ہونا ضروری نہیں سمجھتے بلکہ انھوں نے اپنی کتابوں میں ان کی خطاؤں اور لوگوں کے سوالات کے مقابل میں عاجزی کو تحریر بھی کیا ہے، جیسا کہ انھوں نے خلیفہ اول کے لئے نقل کیا ہے کہ (ان لی شیطان یعتزینی) اور خلیفہ دوم کی نسبت نقل کیا ہے کہ اس نے خلیفہ اول سے بیعت کو ایک بے تدبیر امر کا نام دیا اور بارہا اپنی زبان سے اس جملہ کی تکرار کی (لولا علی لملک عمر^۲) خلیفہ سوم^۳ اور خلفاء بنی عباس اور بنی امیہ کی خطائیں اس قدر آشکار ہیں کہ انھیں بیان کرنے کی ضرورت نہیں ہے، بلکہ جو بھی تاریخ خلفاء سے معمولی آشنائی رکھتا ہو اسے بخوبی ان خطاؤں کا علم ہے جو انھوں نے انجام دی ہیں۔ سنیوں کے مقابلہ میں صرف شیعہ حضرات ان شرائط کا بارہ اماموں میں

^۱ شرح نہج البلاغہ، ج ۱، ص ۱۴۲، ۱۵۸، ج ۳، ص ۵۷

^۲ الغدير، ج ۶، ص ۹۳ کے بعد،

^۳ الغدير، ج ۸، ص ۹۷ کے بعد

ہونا ضروری سمجھتے ہیں، مذکورہ وضاحت کے ذریعہ امامت کے سلسلہ میں شیعوں کے عقیدہ کی صحت آشکار ہو جاتی ہے جسے ثابت کرنے کے لئے مفصل دلائل کی ضرورت نہیں ہے اس کے باوجود ہم اس مسئلہ کو ثابت کرنے کے لئے آئندہ دروس میں کتاب و سنت سے سہارا لیں گے۔

سوالات

۱۔ مسئلہ امامت میں شیعوں کا نظریہ اور اس مسئلہ میں اہل سنت سے اختلاف کو بیان کریں؟

۲۔ کیوں شیعہ حضرات امامت کو (اصل اعتقاد) کے عنوان سے معتبر جانتے ہیں؟

۳۔ وجود امام علیہ السلام کی ضرورت کو بیان کریں؟

۴۔ مذکورہ بیانات سے کیا نتائج حاصل ہوتے ہیں؟

اُتیواں درس

منصب امام

گذشتہ درس میں ہم نے وضاحت کر دی ہے کہ ختم نبوت کا سلسلہ امام معصوم علیہ السلام کو منسوب کئے بغیر حکمت الہی کے خلاف ہے، اور جہانی و جاودانی اسلام کا تقاضا یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ کے بعد اُس کے لئے ثائتہ جانشین معین کئے جائیں، جو نبوت و رسالت کے علاوہ تمام مناصب الہی سے سرفراز ہو۔ اس مطلب کو قرآنی آیات اور سنی و شیعہ تفاسیر میں موجود روایات سے استفادہ کیا جاسکتا ہے۔ جیسا کہ قرآن میں سورہ مائدہ کی تیسری آیت میں خدا فرماتا ہے: (الْیَوْمَ اكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ وَاتَّمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِي وَرَضِيتُ لَكُمُ الْإِسْلَامَ دِينًا) میں نے آج تمہارے دین کو کامل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت تمام کر دی اور تمہارے دین اسلام سے راضی ہو گیا۔ یہ آیت تمام مفسرین کے قول کے مطابق حجۃ الوداع کے بعد آنحضرت ﷺ کی رحلت کے چند ماہ پہلے نازل ہوئی، جس میں اسلام کا آسیب پذیر مہر محفوظ رہ جانے کی وجہ سے کفار کی ناامیدی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے کہ ”آج میں نے تمہارے دین کو کامل اور اپنی نعمتوں کو تم پر تمام کر دیا“ اور ان روایات کی روشنی میں جو اس آیت کے ضمن میں وارد ہوئی ہیں یہ نکتہ واضح ہو جاتا ہے کہ یہ اکمال و اتمام کفار کی ناامیدی سے مربوط اور آنحضرت ﷺ کی طرف سے حکم خداوندی کے مطابق جانشین کے انتخاب کے ذریعہ متحقق ہو جاتا ہے، اس لئے کہ کفار اس خیال خام میں تھے کہ آنحضرت ﷺ کی وفات کے بعد چونکہ آپ کا کوئی فرزند نہیں تھا، لہذا اسلام بے سرپرست اور سرگردان ہو جائے گا، لیکن جانشین کے انتخاب کے ذریعہ دین کامل ہو گیا اور کافروں کی امیدوں پر پانی پھر گیا، دین کے اکمال کی داستان کا خلاصہ یہ ہے کہ جب رسول اکرم ﷺ حجۃ الوداع سے فارغ ہو کر مدینہ کی جانب لوٹے تو غدیر خم کے مقام پر تمام مسلمانوں کو جمع کیا اور ایک مفصل خطبہ دینے کے بعد آنحضرت ﷺ نے مسلمانوں

^۱ اس آیت کے سلسلہ میں مزید وضاحت کے لئے تفسیر المیزان میں مراجعہ کریں

کو مخاطب کر کے سوال کیا (اَلَسْتُ اَوَّلٰی بَلَمَ مِنْ اَنْفُسِكُمْ) کیا میں خدا کی جانب سے تمہارا ولی نہیں ہوں، سب نے مل کر، ہاں کہا، یہ جواب سن کر آنحضرت ﷺ نے حضرت علی علیہ السلام کو اپنے ہاتھوں سے اٹھا کر فرمایا ”مَنْ كُنْتُ مَوْلَاهُ فَعَلِيٌّ مَوْلَاهُ“ اور اس طرح آپ نے حضرت علی علیہ السلام کی ولایت کا اعلان فرمادیا، اور پھر حاضرین نے آپ کی بیعت کی نیز خلیفہ دوم نے بیعت کرنے کے ضمن میں حضرت علیؑ کو ان الفاظ میں تہنیت پیش کی (بِجَئِكَ لَكَ يَا عَلِيُّ اَصْحَبْتَ مَوْلَايَ وَمَوْلَى كُلِّ مُؤْمِنٍ وَمُؤْمِنَةٍ) اس روز یہ آیت نازل ہوئی (اَلْيَوْمَ اكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ وَاتَّمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِي وَرَضِيتُ لَكُمُ الْإِسْلَامَ دِينًا) آنحضرتؐ نے تکمیل کر لی اور فرمایا: (تَامَ نَبَوِّيَّ وَتَامَ دِينِ اللَّهِ وَلَايَةُ عَلِيٍّ عَلَيَّ بَعْدِي) اور ایک روایت میں آیا ہے کہ جسے بعض اہل سنت کے بزرگ علماء نے نقل کیا ہے کہ ابو بکر اور عمر اپنی جگہ سے بلند ہوئے اور آنحضرت ﷺ سے سوال کیا، کہ کیا یہ ولایت صرف حضرت علی علیہ السلام سے مخصوص ہے؟ تو آنحضرت ﷺ نے جواب میں فرمایا: ہاں یہ وصایت علی علیہ السلام اور میرے اوصیاء سے تاروز قیامت مخصوص ہے، تو انھوں نے پھر سوال کیا کہ آپ ﷺ کے اوصیاء کون لوگ ہیں تو آپ ﷺ نے فرمایا: ”(عَلِيٌّ اَخِي وَوَزِيرِي وَوَارِثِي وَوَصِيٌّ وَخَلِيفَتِي فِي اُمَّتِي وَوَلِيَّ كُلِّ مُؤْمِنٍ مِنْ بَعْدِي ثُمَّ ابْنِي الْحَسَنُ ثُمَّ تَبَعُهُ مِنْ وَلَدِ ابْنِي الْحُسَيْنِ وَاحِدًا بَعْدَ وَاحِدٍ الْقُرْآنَ مَعَهُمْ وَنَحْمُ مَعَ الْقُرْآنِ لَا يُفَارِقُهُمْ وَلَا يُفَارِقُهُمْ حَتَّى يَرُدُّوا عَلَيَّ الْخَوْضَ)“ ان روایات کی روشنی میں جو مطلب سمجھ میں آتا ہے وہ یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ حجۃ الوداع سے پہلے اس امر کے لئے مامور کر دئے گئے تھے لیکن آپ کو اس بات کا ڈر تھا کہ کہیں لوگ آپ کی جانشینی کو آپ کے شخصی و بنی نظریہ پر حل نہ کریں، اور اسے قبول کرنے سے انکار کر دیں، اسی وجہ سے آنحضرت ﷺ موقع کی تلاش میں تھے تاکہ اس امر کا اعلان کر دیں، یہاں تک کہ یہ آیت نازل ہوئی (يَا أَيُّهَا الرَّسُولُ بَلِّغْ مَا أُنْزِلَ إِلَيْكَ مِنْ رَبِّكَ وَإِنْ لَمْ تَفْعَلْ فَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهُ وَاللَّهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ)۔ اے رسول جو حکم تمہارے پروردگار کی طرف سے تم پر نازل کیا جا چکا ہے اُسے پہنچا دو، اور اگر تم نے ایسا نہ کیا تو گویا تم نے میری رسالت کا کوئی کام نہیں کیا او تم ڈرو نہیں خدا تمہیں لوگوں کے شر سے محفوظ رکھے گا۔

^۱ یہاں سورۃ احزاب۔ آیت ۶، ”النَّبِيُّ اَوَّلٰی بِالْمُؤْمِنِينَ مِنْ اَنْفُسِهِمْ“ کی طرف اشارہ ہے

^۲ اس حدیث کی دلالت اور سند کے قطعی ہونے کو ثابت کرنے کے لئے عیقات الانوار اور الغدیر کی طرف رجوع کیا جائے۔

^۳ غاید المرام۔ باب ۵۸، حدیث ۴ جسے فرائد حموی نے نقل کیا ہے۔

^۴ سورۃ مائدہ۔ ۶۷، اور تفسیر المیزان کی طرف مراجعہ کیا جائے۔

آیت میں اس امر کو لوگوں تک پہنچانے کی تاکید اس حد تک ہے کہ اگر یہ حکم انجام نہیں پایا تو گویا تبلیغ رسالت کے انجام نہ دینے کے برابر ہے۔ آنحضرت ﷺ کو خوشخبری دیتا ہے کہ اس پیغام کے بڑے نتائج سے محفوظ رکھے گا، یہ آیت جیسے ہی نازل ہوئی، آپ کو معلوم ہو گیا کہ اس پیغام کا لوگوں تک پہنچانے کا وقت آگیا ہے اور اس سے زیادہ تاخیر جائز نہیں ہے، اسی وجہ سے غدیر خم میں حضرت علی علیہ السلام کی جانشینی کا اعلان کر دیا۔ اگرچہ وہی دن اس پیغام کو لوگوں تک پہنچانے اور لوگوں سے بیعت لینے سے مخصوص تھا، وگرنہ آنحضرت ﷺ نے اپنے دوران حیات میں مختلف مقامات پر مختلف انداز میں حضرت علیؑ کی جانشینی کو، لوگوں کے گوش گزار کرایا تھا بلکہ بعثت کے پہلے ہی سال جب آیہ، *وَأَنذِرْ عَشِيرَتَكَ الْأَقْرَبِينَ*^۱، نازل ہوئی، تو آپ ﷺ نے اس وقت فرمایا: جو شخص سب سے پہلے میری دعوت کو قبول کرے گا اور میری مدد کرے گا، وہ میرے بعد میرا جانشین و خلیفہ ہو گا، اور فریقین کا اس بات پر اتفاق ہے، جس شخص نے سب سے پہلے اعلان نصرت کیا حضرت علی علیہ السلام تھے اسی طرح جب آیہ *(يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَأُولِيَ الْأَمْرِ مِنْكُمْ)* نازل ہوئی، اور اس آیت نے اولوالامر کی اطاعت کو مطلق اور اُسے اطاعت رسول ﷺ کے برابر قرار دیا تو جابر بن عبد اللہ انصاری نے آپ ﷺ سے سوال کیا کہ یہ اولوالامر کون ہیں کہ جن کی اطاعت کا آپ ﷺ کی اطاعت کے ساتھ حکم دیا گیا ہے؟

! تو آپ ﷺ نے جواب میں فرمایا: *(ہم خلفائے یا جابر و ائمۃ المسلمین من بعدی، اُولَئِہِمْ عَلِیُّ بْنُ ابْنِ ابْنِ طَالِبٍ، ثُمَّ الْحَسَنُ، ثُمَّ الْحُسَيْنُ، ثُمَّ عَلِیُّ بْنُ الْحُسَيْنِ، ثُمَّ مُحَمَّدُ بْنُ عَلِیٍّ الْمَعْرُوفُ بِالْطُّورِ بِالْبَاقِرِ، ثُمَّ زَيْنُ الْعَبْدِینِ فَارَقَهُ مَنَى السَّلَامِ، ثُمَّ الصَّادِقُ جَعْفَرُ بْنُ مُحَمَّدٍ، ثُمَّ مُوسَى بْنُ جَعْفَرٍ، ثُمَّ عَلِیُّ بْنُ مُوسَى، ثُمَّ مُحَمَّدُ بْنُ عَلِیٍّ، ثُمَّ عَلِیُّ بْنُ مُحَمَّدٍ، ثُمَّ الْحَسَنُ بْنُ عَلِیٍّ، ثُمَّ سَمِیُّ بْنُ عَلِیٍّ وَکُنِیَّ جَعْفَرُ بْنُ عَلِیٍّ فِي عِبَادَةِ ابْنِ الْحَسَنِ بْنِ عَلِیٍّ)* آنحضرت ﷺ کی پیغمگوئی کے مطابق جابر بن عبد اللہ انصاری امام باقر علیہ السلام کے زمانہ تک با حیات رہے اور آنحضرت ﷺ کے

^۱ اس موضوع کو اہل سنت نے سات صحابیوں سے نقل کیا ہے، زید بن ارقم، ابو سعید خدری، ابن عباس، جابر بن عبد اللہ انصاری، براء بن عازب، ابو ہریرہ، ابن مسعود، الغدیر ج ۱، ص ۳

^۲ سورۃ شعراء ۲۱۴.

^۳ عیقات النوار، الغدیر، المراجعات.

^۴ سورۃ نساء آیت ۵۹

^۵ غایۃ المرام، ج ۱۰، ص ۲۶۷ اور اثبات الہدایۃ، ج ۳، ص ۱۲۳، و، ینادیع المودۃ، ص ۴۹۴

سلام کو پہنچایا، ایک دوسری حدیث میں ابو بصیر سے اس طرح منقول ہے کہ ابو بصیر نے آیت اولوا الامر کے سلسلہ میں امام صادق علیہ السلام سے سوال کیا، تو آپ نے جواب میں فرمایا: یہ آیت حضرت علی، امام حسن اور امام حسین علیہم السلام کے سلسلہ میں نازل ہوئی ہے، تو میں نے دوبارہ عرض کیا کہ لوگ یہ کہتے ہیں کہ اگر ایسا ہے تو پھر قرآن میں حضرت علی علیہ السلام اور ان کے اہلبیت علیہم السلام کے اسماء کیوں نہیں ذکر کئے؟ تو آپ (علیہ السلام) نے فرمایا: تم جا کر ان لوگوں سے کہہ دو کہ جب نماز کے لئے آیت نازل ہوئی، تو اس میں چار رکعت یا تین رکعت کی طرف اشارہ نہیں کیا گیا یہ وضاحت آنحضرت ﷺ نے بیان فرمائی تھی، اسی طرح آپ علیہ السلام نے حج و زکات کے سلسلہ میں آیات کی تفصیل بیان فرمائی لہذا آنحضرت ﷺ نے ان آیتوں کی طرح اس آیت کی بھی تفصیل بیان فرمائی جو اس طرح ہے: (مَنْ كُنْتَ مَوْلَاهُ فَعَلَى مَوْلَاهُ) (اوستم کتاب اللہ و اہل بیتی فانی سنت اللہ عزوجل ان لا یفرق بینہما حتی یوردہما علی الحوض فاعطانی ذلک) یعنی میں تمہیں کتاب خدا اور اپنے اہل بیت کے ساتھ ساتھ رہنے کی وصیت کرتا ہوں، میں نے خدا کی بارگاہ میں درخواست کی ہے کہ ان دونوں میں اس وقت تک جدائی نہ ڈالے کہ جب تک یہ دونوں حوض کوثر پر میرے پاس نہ پہنچ جائیں، اور خدا نے میری درخواست قبول کر لی۔

اور اسی طرح ایک دوسری روایت میں ارشاد فرمایا: (لا تعلموہم فانہم اعلم منکم انہم لن یخرجوکم من باب ہدی ومن یدخلوکم فی باب ضلالۃ) یعنی انہیں تعلیم دینے کی کوشش نہ کرو کیوں کہ وہ تم سے زیادہ جاننے والے ہیں، جو ہرگز تمہیں باب ہدایت سے خارج اور چاہ ضلالت میں داخل نہیں کر سکتے، اسی طرح بارہا اس مطلب کی طرف اشارہ فرمایا یہاں تک کہ اپنی حیات کے آخری ایام میں بھی فرمایا: (اِنِّی تَارِکٌ فِیْکُمْ اَتَقْلِبُ کِتَابَ اللّٰهِ وَ اَہْلَ بَیْتِیْ اِنَّمَا لَنْ یَفْتَرِقَا حَتّٰی یَرْدَا عَلٰی الْحَوْضِ) اور فرمایا (الان ان مثل اہل بیتی فیکم

^۱ غایۃ المرام (طبع قدیم) ج ۲، ص ۵۶۲۔

^۲ یہ روایت بھی متواترات میں سے ہے، جسے ترمذی، نسائی، صاحب مستدرک نے مختلف طرق سے نقل کی ہے۔

مثل سفیۃ نوح من رکبها نجا ومن تخلف عنها غرق^۱ اس کے علاوہ حضرت علی علیہ السلام کو بارہا مخاطب کر کے فرمایا: (اَنْتَ وَلِیُّ کُلِّ مُؤْمِنٍ بَعْدِی)^۲ ایسی سیکڑوں احادیث میں کہ جن کی طرف اشارہ کرنے کی یہاں پر گنجائش نہیں^۳

سوالات

- ۱۔ قرآن کی کون سی آیت حضرت علیہ السلام کی جانشینی پر دلالت کرتی ہے؟ اور اس کی دلالت کو بیان کریں؟
- ۲۔ حضرت علی علیہ السلام کے منصب امامت پر فائز ہونے کی تفصیلات بیان کریں؟
- ۳۔ کیوں آنحضرت ﷺ حضرت علی علیہ السلام کی جانشینی کے پیغام کو پہنچانے میں تاخیر سے کام لیتے تھے؟ اور پھر کیسے اس امر کو انجام دینے کے لئے کمر ہمت باندھ لی؟
- ۴۔ کون سی روایتیں تمام ائمہ علیہم السلام کی امامت پر دلالت کرتی ہیں؟
- ۵۔ ان تمام روایتوں کو بیان کریں کہ جو اہل بیت علیہم السلام کی امامت پر دلالت کرتی ہیں؟

^۱ مستدرک حاکم ج ۳ ص ۱۵۱۔
^۲ مستدرک حاکم ج ۳ ص ۱۳۴، ۱۱۱۔ صواعق ابن حجر۔ ص ۱۰۳۔ مسند ابن حنبل ج ۱ ص ۳۳۱، ج ۴ ص ۴۳۸ و۔
^۳ کمال الدین وتمام النعمۃ، بحار الانوار۔

انتالیوواں درس

عصمت اور علم امام

مقدمہ

جیسا کہ ہم نے گذشتہ درس میں بیان کر دیا کہ اہل تشیع اور اہل تسنن کے درمیان موضوع امامت کے تحت صرف تین مسئلوں میں اختلاف ہے۔

۱۔ پہلے یہ کہ امام کا تعین و انتخاب خدا کی جانب سے ہو۔

۲۔ دوسرے یہ کہ امام مکملہ عصمت سے آراستہ ہو۔

۳۔ تیسرے یہ کہ علم لدنی کا مالک ہو، اور سینٹیویں درس میں عقلی دلائل کے ذریعہ اس مسئلہ کو حل کر دیا ہے اور اڑتویں درس میں ائمہ علیہم السلام کا خدا کی جانب سے منصوب ہونے کو بیان کر دیا اور اب اس درس میں عصمت اور علم خدا دادی کے سلسلہ میں بحث کرتے ہیں۔

عصمت امام

منصب امامت کا الہی ہونا اور حضرت علی علیہ السلام اور آپ کی اولاد کا خدا کی جانب سے منصب امامت پر فائز ہونے کے اثبات کے بعد ائمہ اطہار علیہم السلام کی عصمت کو اس آیت کے ذریعہ ثابت کیا جاسکتا ہے۔ ”لَا يَنَالُ عَدِيّ الظَّالِمِينَ“، یعنی منصب امام صرف انھیں حضرات کے لئے سزاوار ہے جو گناہوں سے آلودہ نہ ہوں۔ اس کے علاوہ آیہ ”اولوا الامر“، جو امام کی

^۱ سورۃ بقرہ آیت ۱۲۴۔

^۲ سورۃ نسا۔ آیت ۵۹۔

اطاعت کو مطلق قرار دیتی ہے اور امام کی اطاعت کو آنحضرت ﷺ کی اطاعت کے مساوی قرار دیتی ہے، اس کے ذریعہ بھی ائمہ علیہم السلام کی عصمت کو ثابت کیا جاسکتا ہے کیونکہ کسی بھی صورت میں امام کی اطاعت کو اطاعت خدا کے خلاف قرار نہیں دیا جاسکتا لہذا اولوالامر یعنی امام کی مطلق اطاعت کا حکم دینا اس کے معصوم ہونے پر دلالت کرتا ہے۔ اسی طرح ائمہ اطہار علیہم السلام کی عصمت کو آیہ تطہیر سے بھی ان کا معصوم ہونا ثابت کیا جاسکتا ہے: (اِنَّمَا يُرِيدُ اللّٰهُ لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ اَهْلَ الْبَيْتِ وَيُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيرًا) اے اہل بیت! (رسول) خدا تو بس یہ چاہتا ہے کہ تم کو (ہر طرح کی) برائی سے دور رکھے اور جو پاک و پاکیزہ رکھنے کا حق ہے ایسا پاک و پاکیزہ رکھے۔ بندوں کی تطہیر کا ارادہ تشریعی، کسی خاص فرد سے مخصوص نہیں ہے، لیکن اہل بیت علیہم السلام کی طہارت کے سلسلہ میں خدا کا ارادہ، ارادہ تکوینی ہے کہ جس میں ارادہ کا ارادہ کرنے والے (خدا) سے تخلف ممکن نہیں ہے، جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے: (اِنَّمَا اَمْرُهُ اِذَا اَرَادَ شَيْءًا اَنْ يَقُولَ لَهُ كُنْ فَيَكُونُ) پس تطہیر مطلق اور کسی بھی قسم کی نجاست اور پلیدی سے دوری عین عصمت ہے اور ہمیں بخوبی معلوم ہے کہ مسلمانوں میں سے کوئی بھی فرقہ آنحضرت ﷺ کے اہل بیت علیہم السلام کی عصمت کا قائل نہیں ہے فقط شیعہ فرقہ ہے جو حضرت زہراء علیہا السلام اور بارہ اماموں کی عصمت کا قائل ہے۔^۱

اس مقام پر اس نکتہ کی طرف اشارہ کرنا لازم ہے کہ اس آیت کے سلسلہ میں وہ روایتیں جو نقل ہوئیں ہیں، ان میں سے اکثر کو اہل سنت کے علماء نے اپنی کتابوں میں درج کیا ہے، جو اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ یہ آیت، خمسہ طیبہ کے سلسلہ میں نازل ہوئی ہے۔^۲ شیخ صدوق حضرت علی علیہ السلام سے نقل فرماتے ہیں کہ رسول خدا ﷺ فرمایا: اے علی! یہ آیت تمہارے اور حسن و حسین علیہم السلام اور تمہاری نسل سے ہونے والے اماموں کے سلسلہ میں نازل ہوئی ہے، میں نے سوال کیا کہ آپ کے بعد کتنے امام ہوں گے تو آپ ﷺ نے فرمایا: اے علی! تم ہو گے پھر حسن اور پھر حسین ۲۲۸ اور حسین کے بعد علی بن الحسین اس کے بعد محمد بن علی

^۱ سورہ احزاب آیت ۳۳

^۲ سورہ یس ۸۲.

^۳ مزید وضاحت کے لیے تفسیر المیزان اور کتاب "الامامة والولاية في القرآن". کی طرف رجوع کیا جائے

^۴ غایۃ المرام ص ۲۸۷، ۲۹۳.

اس کے بعد جعفر بن محمد اس کے بعد موسیٰ بن جعفر اس کے بعد علی بن موسیٰ اس کے بعد محمد بن علی اس کے بعد علی بن محمد اس کے بعد حسن بن علی اور پھر حسن کے فرزند حجت خدا امام ہوں گے۔ اس کے بعد فرمایا: کہ یہ اسماء اسی ترتیب سے ساحت عرش پر لکھے ہوئے ہیں، اور جب میں نے ان اسماء کو دیکھا تو خدا سے سوال کیا کہ یہ اسماء کس کے ہیں! تو خدا نے فرمایا: اے محمد ﷺ یہ تمہارے بعد ہونے والے امام ہیں کہ جنہیں پاک قرار دیا گیا ہے اور وہ معصوم ہیں نیز ان کے دشمنوں پر بے شمار لعنت کی گئی ہے۔ ان آیتوں کے علاوہ حدیث ثقلین جس میں آنحضرت ﷺ نے ائمہ اطہار علیہم السلام کو قرآن کے مساوی قرار دیا ہے اور تاکید فرمائی ہے کہ یہ دونوں کسی بھی حال میں ایک دوسرے سے جدا نہیں ہو سکتے، جو ائمہ معصومین علیہم السلام کی عصمت پر ایک روشن دلیل ہے، اس لئے کہ ایک معمولی خطا کا بھولے سے بھی سرزد ہو جانا قرآن علی مفارقت کا سبب ہوگا۔

علم امام

اس بات میں کوئی شک نہیں ہے ائمہ اطہار علیہم السلام لوگوں کے مقابلہ میں علمی اعتبار سے بہت بلند مقامات کے حامل تھے جیسا کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: (لَا تَعْلَمُوهُمْ فَإِنَّهُمْ أَعْلَمُ مِنْكُمْ) انہیں تعلیم نہ دو اس لئے کہ وہ تم لوگوں سے کہیں زیادہ جاننے والے ہیں^۱ مخصوصاً حضرت علی علیہ السلام جو پچھنے سے رسول اللہ ﷺ کے سائے میں رہے اور آپ ﷺ کی آخری سانوں تک آپ کے علوم سے مستفید ہوتے رہے، جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے خود فرمایا: (أَنَا مَدِينَةُ الْعِلْمِ وَعَلِيٌّ بَابُهَا)^۲ میں علم کا شہر ہوں اور حضرت علی علیہ السلام اس کا دروازہ ہیں۔ اس کے علاوہ خود امام علی علیہ السلام فرماتے ہیں: (إِنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ عَلَّمَنِي أَلْفَ بَابٍ وَكُلُّ بَابٍ يَفْتَحُ أَلْفَ بَابٍ فَذَلِكَ أَلْفُ بَابٍ حَتَّى عَلِمْتُ مَا كَانَ وَ مَا يَكُونُ إِلَى يَوْمِ الْقِيَامَةِ وَ عَلِمْتُ عِلْمَ الْمَنَاءِ وَ الْبَلَاءِ وَ فَضْلَ الْخَطِّابِ)^۳ یعنی رسول اللہ ﷺ نے مجھے علم کے ہزار باب سکھائے اور میں نے ہر باب سے ہزار ہزار باب کھولے جو مجموعاً ہزار ہزار باب

^۱ غایۃ المرام (ط قدیم) - ج، ۶ - ص ۲۹۳

^۲ غایۃ المرام، ص، ۲۶۵، اصول کافی - ج ۱، ص ۲۹۴

^۳ مستدرک حاکم - ج ۳، ص ۲۲۶، قابل توجہ نکتہ تو یہ ہے کہ ایک سنی عالم نے ایک کتاب بنام "فتح الملک العلی بصحة حدیث مدینۃ العلم علی" نے لکھی جو ۱۳۵۴ھ میں قاہرہ میں چھپی ہے

^۴ ینابیع المودہ - ص ۸۸، اصول کافی - ج ۱، ص ۲۹۶

(دس لاکھ باب) ہو جاتے ہیں یہاں تک کہ جو کچھ ہو چکا ہے اور جو کچھ قیامت تک ہونے والا ہے ان سب سے میں باخبر ہو گیا، اموات و آفات کے اسرار کا میں عالم اور عدل کے ساتھ حکم کرنا، کا مالک ہوں۔ لیکن علوم آل محمد ﷺ صرف ان علوم پر منحصر نہیں ہے کہ جسے واسطہ کے ساتھ یا واسطہ کے بغیر انھوں نے آنحضرت ﷺ سے حاصل کیا بلکہ ائمہ اطہار علیہ السلام غیر عادی علوم سے بھی سرفراز تھے جس سے بصورتِ انام باخبر ہو جاتے تھے بالکل اسی طرح کہ جیسے جناب خضر، جناب ذوالقرنین، حضرت مریم اور جناب موسیٰ کی والدہ پر افاضہ ہوا کرتا تھا^۲ جن میں سے بعض کو قرآن نے وحی سے تعبیر کیا ہے لیکن یہاں وحی سے مراد وحی نبوت نہیں ہے، اسی وجہ سے بعض ائمہ علیم السلام بچنے میں مقام امامت پر فائز اور دوسروں سے تعلیم حاصل کرنے سے بے نیاز ہوتے تھے۔

یہ مطلب ان روایتوں کے ذریعہ ثابت ہے جو خود ائمہ اطہار علیم السلام سے نقل ہوئیں ہیں جن کی حجیت آپ لوگوں کی عصمت سے ثابت ہے، لیکن ان میں سے بعض کو بطور نمونہ پیش کرنے سے پہلے قرآن کی اس آیت کی طرف اشارہ ضروری ہے جس میں بعض افراد کو ”ومن عنده علم الکتاب“^۳ کے عنوان سے آنحضرت ﷺ کی حقانیت پر بہ طور شاحد پیش کیا گیا ہے، اور وہ آیت یہ ہے (قُلْ كُنْى بِاللّٰهِ شَهِيدًا بَيْنِيْ وَبَيْنَكُمْ وَمَنْ عِنْدَہٗ عِلْمُ الْكِتَابِ) آپ کہہ دیں کہ خدا میرے اور تمہارے درمیان شہادت اور گواہی دینے کے لئے کافی ہے اسی طرح وہ لوگ بھی کافی ہیں کہ جن کے پاس علم الکتاب ہے۔ پس اس امر میں کوئی شک نہیں ہے کہ وہ شخص جس کی گواہی خدا کی گواہی کے برابر ہو، اور علم الکتاب سے آراستہ ہو، وہ کمالات کے عظیم درجات پر فائز ہوگا۔ ایک دوسری آیت میں اسی شاحد کی طرف اشارہ کیا ہے: (اَفَمَنْ كَانَ عَلٰی بَیۡتٍ مِّنْ رَبِّہٖ وِیۡتَلُوْہٗ شَہٰدۃً مِّنۡہٗ) تو کیا جو شخص اپنے پروردگار کی طرف سے روشن دلیل پر ہو اور اس کے پیچھے ہی پیچھے انہی کا ایک گواہ ہو اس آیت میں (مِنۡہٗ) اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ وہ شاحد رسول اللہ

^۱ اصول کافی۔ کتاب الحجہ۔ ۲۶۴، ۲۷۰

^۲ اصول کافی۔ ج ۱، ص ۲۶۸

^۳ سورۃ کہف۔ ۶۵، ۹۸ آل عمران۔ ۴۲، مریم ۱۷، ۲۱ طہ۔ ۳۸، قصص۔ ۷

^۴ سورۃ رعد۔ ۴۳

^۵ سورۃ رعد۔ ۴۳

^۶ سورۃ ہود۔ آیت ۱۷

ﷺ کے خاندان اور آپ کے اہل بیت سے ہے، اہل تشیع و تسنن کی طرف سے نقل ہونے والی روایتوں کے مطابق اس شاہد سے مراد علی ابن ابی طالب علیہ السلام ہیں۔ منجملہ ابن مغازی شافعی نے عبد اللہ بن عطا سے روایت کی ہے کہ اس نے کہا کہ میں ایک روز امام محمد باقر علیہ السلام کی خدمت میں تھا کہ ”عبد اللہ بن سلام (آنحضرت ﷺ کے دور میں اہل کتاب کے بزرگ علماء میں سے تھے) کے فرزند ہمارے سامنے سے گزرے تو میں نے امام علیہ السلام سے سوال کیا کہ کیا وہ من عندہ علم الکتاب سے مراد اس شخص کے والد ہیں؟ تو امام علیہ السلام نے فرمایا نہیں بلکہ اس سے مراد حضرت علی ابن ابی طالب علیہ السلام ہیں، اور آیہ ”وَيَتْلُوهُ شَاهِدٌ مِّنْهُ“ اور آیہ ”إِنَّمَا وَلِيُّكُمُ اللَّهُ وَرَسُولُهُ وَالَّذِينَ آمَنُوا“ (اے ایماندارو! ہمارے مالک و سرپرست بس یہی ہیں۔ خدا اس کا رسول اور وہ مومنین جو پابندی سے نماز ادا کرتے ہیں اور حالت رکوع میں زکوٰۃ دیتے ہیں۔

حضرت علی علیہ السلام ہی کی شان میں نازل ہوئی ہے اسی طرح بہت سی روایتوں کے مطابق جو شیعہ اور سنی اسناد کے مطابق وارد ہوئی ہیں، سورہ ہود میں ”شاہد“ سے مراد علی ابن ابی طالب ہیں، لہذا ”منہ“ سے مراد امام علی علیہ السلام کے علاوہ کوئی اور نہیں ہو سکتا۔ علم الکتاب کے حامل ہونے کی اہمیت اس وقت آشکار ہوگی کہ جب ہم جناب سلیمان علیہ السلام کے حضور میں تخت بلیتیں کے حاضر کرنے کی داستان کا مطالعہ کریں: (وَقَالَ الَّذِي عِنْدَهُ عِلْمٌ مِّنَ الْكِتَابِ أَنَا آتِيكَ بِهِ قَبْلَ أَنْ يَرْتَدَّ إِلَيْكَ طَرْفُكَ^۱) یعنی جس کے پاس کتاب کا ایک مختصر علم تھا اس نے کہا کہ میں تخت بلیتیں کو آپ کی ہلک جھینکنے سے پہلے یہاں حاضر کروں گا۔ اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ علم الکتاب کے ایک حصہ سے باخبر ہونا ایسے حیرت انگیز امور کا باعث ہے، پس تمام علم الکتاب سے متصف ہونا کیسے عظیم اثرات کیرونا ہونے کا سبب ہو سکتا ہے، یہی وہ نکتہ ہے جسے امام صادق علیہ السلام نے ”جناب سدید“ سے نقل ہونے والی روایت میں فرمایا ہے، سدید کہتے ہیں کہ میں، ابو بصیر، یحییٰ بزاز اور داؤد بن کثیر جو امام صادق علیہ السلام کی بارگاہ میں حاضر تھے کہ حضرت بڑے غضب کے عالم میں وارد مجلس ہوئے فرمایا: کہ مجھے ان لوگوں پر تعجب ہے کہ جو یہ

^۱ سورہ مائدہ۔ آیت ۵۵/

^۲ غایۃ المرام (ط قدیم) ۳۵۹، ۳۶۱

^۳ سورہ نمل۔ آیت ۴۰

خیال کرتے ہیں کہ ہمارے پاس علم غیب ہے، حالانکہ خدا کے علاوہ کوئی بھی علم غیب سے واقف نہیں ہے میں اپنی کنیز کو تنبیہ کرنا چاہتا تھا کہ وہ فرار ہوگئی، جبکہ مجھے یہ نہیں معلوم کہ وہ کس حجرہ میں محفی ہے۔ ”انا رادہ الیک و جاعلوہ من المرسلین“، ”قصص ۷۰“۔ ”سیدر کہتے ہیں: جب امام علیہ السلام اپنے گھر کی طرف جانے کے لئے کھڑے ہوئے تو میں بھی ابو بصیر اور میسر کے ساتھ آنحضرت کے ہمراہ ہوا اور راستہ میں میں نے حضرت علیہ السلام سے عرض کی کہ ہم آپ پر قربان جائیں آپ نے جو کچھ اپنی کنیز کے سلسلہ میں فرمایا، اسے ہم نے تسلیم کیا اور ہم اس کے بھی معتقد ہیں کہ آپ بے شمار علوم کے مالک ہیں نیز کبھی بھی آپ کے سلسلہ میں علم غیب کا دعویٰ نہیں کرتے۔ امام علیہ السلام نے فرمایا کہ اے سیدر! کیا تم نے قرآن نہیں پڑھا میں نے عرض کی کہ کیوں نہیں، تو آپ نے فرمایا کہ کیا اس آیت کی تلاوت نہیں کی ہے: (قَالَ الَّذِي عِنْدَهُ عِلْمٌ مِّنَ الْكِتَابِ اَنَا اَتِيكَ بِهِ قَبْلَ اَنْ يَرْتَدَّ اِلَيْكَ طَرَفَا) وہ شخص (آصف بن برخیا) جس کے پاس کتاب خدا کا کچھ علم تھا بولا کہ میں آپ کی ہلک جھپکنے سے پہلے تخت بلقیس کو آپ کے پاس حاضر کر دوں گا۔

تو میں نے کہا کہ ضرور تلاوت کی ہے، پھر امام علیہ السلام نے فرمایا: کیا تمہیں معلوم ہے کہ یہ شخص کتاب میں سے کس قدر علم کا مالک تھا؟ تو میں نے کہا کہ آپ ہی فرمائیں، پھر امام علیہ السلام نے فرمایا کہ ایک عظیم سمندر سے صرف ایک قطرہ کے برابر، اس کے بعد فرمایا کہ کیا اس آیت کی تلاوت کی ہے؟ (قُلْ كَفَىٰ بِاللّٰهِ شَهِيدًا اَيْنِي وَيُكَلِّمُ مَنْ عِنْدَهُ عِلْمَ الْكِتَابِ) میں نے کہا کہ ضرور تلاوت کی ہے، تو امام علیہ السلام نے فرمایا کہ بتاؤ وہ شخص افضل ہے جو تمام کتاب کے علم سے واقف ہے یا وہ شخص جو صرف کتاب کا ایک حصہ جانتا ہے؟ تو میں نے جواب میں عرض کیا کہ جس کے پاس تمام کتاب کا علم ہے، اس کے بعد امام علیہ السلام نے اپنے سینہ کی طرف اشارہ کیا اور فرمایا خدا کی قسم تمام کتاب کا علم ہمارے پاس ہے اب اس کے بعد اہل بیت علیہم السلام کے علوم کو بیان

^۱ اس حدیث کے لب و لہجہ سے معلوم ہوتا ہے کہ امام نے یہ باتیں نامحرموں سے کہی ہیں، اور یہ نکتہ معلوم رہے کہ وہ علم غیب جو خدا سے مخصوص ہے اس سے مراد وہ علم ہے جسے حاصل کرنے کے لئے تعلیم کی ضرورت نہ ہو جیسا کہ امام علی علیہ السلام نے سائل کے سوال کے (کیا آپ علم غیب کے مالک ہیں) کے جواب میں فرمایا کہ ”انما ہم تعلم من ذی علم“ وگرنہ انبیاء اور اولیاء الہی وحی اور الہام کے ذریعہ علوم غیبی سے واقف تھے، مادر حضرت موسیٰ کے لئے خدا کی جانب سے الہام انہیں مقامات میں سے ایک ہے کہ جس کے لئے شک نہیں کیا جاسکتا۔
اصول کافی۔ ج ۱، ص ۲۵۷ (طبع دار الکتب الاسلامیہ)۔

کرنے والی روایتوں کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ امام رضا علیہ السلام، امامت کے سلسلہ میں ایک مفصل حدیث کے ضمن میں فرماتے ہیں: جب خدا کسی کو لوگوں کے لئے منتخب کرتا ہے تو اسے سہ صدر عطا کرتا ہے اور اس کے دل میں حکمت کے چشمے جاری اور اسے علم کی دولت سے آراستہ کر دیتا ہے تاکہ وہ سوالات کے جوابات دے سکے، اور حق کو پہچاننے میں سرگردان نہ ہو، چنانچہ ایسا شخص معصوم، خدا کی طرف سے تائید شدہ اور خطاؤں سے محفوظ ہوتا ہے۔ دراصل خدا، اس لئے اس کو یہ خصلتیں عطا کرتا ہے تاکہ اس کے ذریعہ سے اپنے بندوں پر حجت تمام کر سکے لہذا یہ ایک عطیہ ہے جسے خدا پسند کرتا ہے اسے عطاء کرتا ہے اس کے بعد فرمایا کیا عوام میں اتنی استطاعت ہے کہ وہ ایسے شخص کو پہچان کر اسے منتخب کر لیں، اور جب وہ کسی کا انتخاب کرتے ہیں تو کیا وہ شخص ایسی صفات کا مالک ہوتا ہے؟!

حسن بن یحییٰ مدائنی امام صادق علیہ السلام سے روایت کرتے ہیں کہ میں نے امام علیہ السلام سے سوال کیا کہ جب امام سے کوئی سوال کیا جاتا ہے تو وہ کس طرح جواب دیتے ہیں تو آپ (علیہ السلام) نے میں فرمایا: کبھی اس پر الہام ہوتا ہے اور کبھی فرشتے سے سنتا ہے اور کبھی دونوں ایک ساتھ^۱ واقع ہوتا ہے۔ ایک دوسری روایت میں امام صادق علیہ السلام فرماتے ہیں کہ ”وہ امام جسے معلوم نہ ہو کہ اس پر کیسی مصیبت آنے والی ہے اور اس کا انجام کیا ہوگا تو وہ بندوں پر خدا کی حجت نہیں ہو سکتا“^۲۔ ایک دوسری روایت میں امام علیہ السلام فرماتے ہیں کہ جب بھی امام کسی چیز کے متعلق جاننا چاہتا ہے تو خدا اس سے باخبر کر دیتا ہے^۳۔ اسی طرح آپ کی جانب سے نقل ہونے والی متعدد روایتوں میں آیا ہے کہ روح، جبرئیل و میکائیل سے عظیم تر مخلوق ہے جو رسول اللہ کے پاس تھی، ان کے بعد ائمہ علیہم السلام کی طرف منتقل ہو گئی جن سے ان کی مدد ہوتی ہے^۴۔

^۱ اصول کافی۔ ج ۱ ص ۱۹۸، ۲۰۳۔

^۲ بحار الانوار۔ ج ۲۶ ص ۵۸۔

^۳ اصول کافی۔ ج ۱ ص ۱۵۸۔

^۴ اصول کافی۔ ج ۱ ص ۲۵۸۔

^۵ اصول کافی ج ۱ ص ۲۷۳۔

سوالات

۱۔ امام علیہ السلام کی عصمت کو کن آیتوں کے ذریعہ ثابت کیا جاسکتا ہے؟

۲۔ کون سی روایت امام علیہ السلام کی عصمت پر دلالت کرتی ہے؟

۳۔ ائمہ علیہم السلام کن راہوں سے علوم کو حاصل کرتے ہیں؟

۴۔ گذشتہ ادوار میں کون لوگ ایسے علم کے مالک تھے؟

۵۔ کون سی آیت علم امامت پر دلالت کرتی ہے اس کی وضاحت کریں؟

۶۔ علم الکتاب کی اہمیت بیان کریں؟

۷۔ علوم ائمہ علیہم السلام سے مربوط چند روایتوں کو پیش کریں؟

چالیسواں درس

حضرت ہمدی (عج)

مقدمہ

گذشتہ بحث کے ضمن میں ہم نے ان روایتوں کو بیان ہے کیا جس میں ائمہ علیہم السلام کے اسماء درج تھے، لیکن ان روایتوں کے علاوہ دوسری بہت سی روایتیں ہیں جنہیں شیعہ اور سنی علماء نے آنحضرت ﷺ سے نقل کی ہیں، جس میں یا تو ائمہ اطہار علیہم السلام کی تعداد کا تذکرہ ہے یا بعض روایتوں میں ان حضرات کا قریش سے ہونے کی طرف اشارہ ہے یا بعض روایتوں میں ان کی تعداد کو نقباء بنی اسرائیل کی تعداد کے مطابق ہونے کا اشارہ ہے، اسی طرح بعض روایتوں میں وارد ہوا ہے کہ ان میں نو امام، امام حسین علیہ السلام کے صلب سے ہوں گے، اور بعض روایتوں میں جنہیں شیعہ اور سنی علماء نے صحیح سند کے ساتھ نقل کیا ہے ان میں ان کے اسماء مبارک درج ہیں اور انہیں تمام ائمہ علیہم السلام کے ہونے کی طرف اشارہ موجود ہے جنہیں ہم یہاں بیان کرنے سے قاصر ہیں^۱ بلکہ اس درس کو امام جت ہمدی بن حسن علیہ السلام سے مخصوص کرتے ہیں، اور اختصار کو مد نظر رکھتے ہوئے صرف مہم نکات کی طرف اشارہ کریں گے۔

جہانی حکومت الہی

ہمیں یہ نکتہ اچھی طرح معلوم ہو چکا ہے کہ انبیاء علیہم السلام کی بعثت کا ہدف لوگوں کو رشد و ہدایت (بہ تدریج کمال تک پہنچانے) کے راستہ پر گامزن کرنا تھا، اور یہ ہدف وحی الہی کو لوگوں کی دست رس میں قرار دینے ہی کے ذریعہ متحقق ہو سکتا ہے، اس ہدف کے علاوہ ان کے اور دوسرے اہداف بھی تھے جیسے لوگوں کی عقلوں اور ان میں با استعداد حضرات کی روحی اور معنوی اعتبار سے

^۱ منتخب الاثر فی الامام الثانی عشر، طبع سوم - ص ۱۲۱۰۔

^۲ بحار الانوار، غایۃ المرام، اثبات الہدایۃ وغیرہ۔

تریت کرنا وغیرہ۔ یعنی، انبیاءِ عظیم السلام، خدا پرستی، عدل و داد کی حکومت، اور الہی آرزوؤں کے مطابق ایک اچھے اور ہدایت یافتہ سماج کو قائم کرنا چاہتے تھے، لہذا ان میں سے ہر ایک نے اپنے اہداف کے حصول کے لئے قدم اٹھائے بلکہ ان میں سے بعض حکومت الہی کو قائم کرنے میں کامیاب بھی ہوئے، لیکن ان میں سے کسی کے لئے بھی جہانی حکومت قائم کرنے کے شرائط مہیا نہ ہو سکے۔ لیکن اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ ان کی تعلیمات ناقص، یا ان کی رہبری میں نقص تھا، یا ہدف الہی محقق نہ ہو سکا، اس لئے کہ ان کا ہدف تو صرف یہ تھا کہ انسانوں کے مختار ہوتے ہوئے کمال کی جانب حرکت کے لئے شرائط فراہم کئے جائیں۔ (لَا يَكُونُ لِلنَّاسِ عَلَى اللَّهِ حُجَّةٌ بَعْدَ الرُّسُلِ) تاکہ پیغمبروں کے آنے کے بعد لوگوں کی خدا پر کوئی حجت باقی نہ رہ جائے۔ یعنی لوگوں پر دین حق اور الہی پیغمبروں کو ماننے کے لئے کوئی جبر نہیں ہے، اور یہ ہدف حاصل ہو چکا ہے۔

لیکن پھر بھی خدا نے اپنی کتابوں میں پوری زمین پر حکومت الہی کے برپا ہونے کی خوشخبری دی ہے جسے دین حق کے قبول کرنے کے لئے شرائط کے فراہم ہونے کی پیشگوئی کا نام دیا جاسکتا ہے، جو با عظمت جماعتوں اور افراد کے علاوہ غیبی مدد کے ذریعہ حکومت جہانی کی راہ میں موجود رکاوٹوں کو برطرف کر کے عدل و انصاف کی حکومت قائم ہوگی، سنگمروں سے نالاں معاشرے اور مختلف مذاہب و حکمرانوں سے عاجز سماج کو نجات ملے گی اس ہدف کو آنحضرت ﷺ کی بعثت اور دین جاودانی کا اتہائی ہدف مانا جاسکتا ہے جیسا کہ خداوند عالم فرماتا ہے (لِنُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ) تاکہ اس کو تمام دینوں پر غالب کرے چونکہ امامت نبوت کو کامل کرنے والی اور حکمت خاتمیت کو محقق کرنے والی ہے لہذا اس سے یہ نتیجہ حاصل کیا جاسکتا ہے کہ یہ ہدف آخری امام علیہ السلام کے ہاتھوں پورا ہوگا، اور یہ وہی مطلب ہے کہ جس کی طرف ان روایتوں میں تاکید کی گئی ہے کہ جو امام زمانہ (عج) اور احلالہ الفدائہ کے سلسلہ میں وارد ہوئی ہیں۔ اب اس کے بعد اس حکومت جہانی کے سلسلہ میں بشارت دینے والی آیتوں کی طرف اشارہ کرتے ہیں اور اس کے بعد اسی ضمن میں موجود روایتوں کا تذکرہ کریں گے۔

^۱ سورۃ نساء۔ آیت ۱۶۵

^۲ سورۃ توبہ۔ آیت ۳۳ سورۃ فتح۔ آیت ۲۸ سورۃ صف۔ آیت ۹، بحار الانوار۔ ج ۵۱ ص ۵۰ ج ۲۲ ص ۶۰، ج ۵۸ ص ۵۹

وعدۃ الہی

خداوند عالم قرآن کریم میں فرماتا ہے کہ ہم نے تورات و انجیل میں یہ بشارت دیدی ہے کہ زمین کے وارث صالح افراد ہوں گے۔ (وَلَقَدْ كَتَبْنَا فِي الزَّبُورِ مِنْ بَعْدِ الذِّكْرِ أَنَّ الْأَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصَّالِحُونَ) اور ہم نے یقیناً زبور میں لکھ دیا تھا کہ روئے زمین کے وارث ہمارے نیک بندہ ہوں گے، ایک دوسری روایت میں حضرت موسیٰ علیہ السلام سے اس مضمون کے مشابہ عبارت موجود ہے اور اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ یہ وعدہ ضرور ایک دن پورا ہوگا۔ اسی طرح ایک دوسرے مقام پر داستانِ فرعون کے بعد نقل کرتا ہے (وَنُرِيدُ أَنْ نَمُنَّ عَلَى الَّذِينَ اسْتُضِفُوا فِي الْأَرْضِ وَنَجْعَلَهُمْ أَئِمَّةً وَنَجْعَلَهُمُ الْوَارِثِينَ) اور ہم تو یہ چاہتے ہیں جو لوگ روئے زمین پر کمزور کر دئے گئے ہیں ان پر احسان کریں اور انہیں لوگوں کو پیشوا بنائیں اور انہیں کو اس زمین کا مالک و وارث قرار دیں۔ یہ آیت گرچہ بنی اسرائیل کے سلسلہ میں ہے، فرعون کی ہلاکت کے بعد ان کا حکومت کی باگ ڈور سنبھالنے کی طرف اشارہ کرتی ہے لیکن (نبرد) کی تعمیر ایک سنت الہی کی طرف اشارہ ہے اسی وجہ سے بہت سی روایتوں میں اسی آیت کو حضرت مہدی (عج) کی جہانی حکومت کے لئے دلیل بنایا گیا ہے۔^۱

نیز قرآن نے ایک دوسرے مقام پر مسلمانوں کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ تم میں سے جو بھی واقعی ایمان لائے، اور نیک اعمال انجام دے، وہ زمین کا خلیفہ ہوگا اور پورے امن و امان کے ساتھ خدا کی عبادت کرے گا۔ (وَعَدَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْأَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِينَهُمُ الَّذِي ارْتَضَىٰ لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِنْ بَعْدِ خَوْفِهِمْ أَمْنًا يَعْبُدُونَنِي لَا يُشْرِكُونَ بِي شَيْئًا وَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذَلِكَ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْفَاسِقُونَ) اے ایمان والوں تم میں سے جن لوگوں نے ایمان قبول کیا اور اچھے اچھے کام کیے ان سے خدا نے وعدہ کیا ہے کہ وہ ان کو ایک نہ ایک دن روئے زمین ضرور پر اپنا نائب مقرر کرے گا، جس طرح

^۱ سورة انبیاء۔ آیت ۱۰۵

^۲ سورة اعراف۔ آیت ۱۲۸

^۳ سورة قصص۔ آیت ۵

^۴ بحار الانوار ج ۵۱، ۵۴، ۵۵، ۶۳، ۶۴۔

^۵ سورة نور۔ آیت ۵۵

ان لوگوں کو نائب بنایا جو ان سے پہلے گزر چکے ہیں اور جس دین کو اس نے ان کے لئے پسند فرمایا (اسلام) اس پر انہیں ضرور ضرور پوری قدرت دے گا، اور ان کے خائف ہونے کے بعد امن سے ضرور بدل دے گا، اور وہ میری ہی عبادت کریں گے، اور کسی کو ہمارا شریک نہیں بنائیں گے، اور جو شخص بھی اس کے بعد ناشکری کرے تو ایسے ہی لوگ بدکار ہیں۔ روایات کے مطابق یہ وعدہ امام زمانہ (عج) کے ہاتھوں پورا ہوگا۔ اسی طرح بہت سی روایتوں میں قرآن کی مختلف آیتوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جو امام مہدی (عج) کی جہانی حکومت پر دلالت کرتی ہیں جنہیں ہم یہاں بیان نہیں کر سکتے^۱

چند روایتیں

وہ روایتیں جسے شیعہ اور سنی علماء نے آنحضرت ﷺ سے نقل کی ہیں حدوتاً سے بھی زیادہ ہیں اور وہ روایتیں جسے صرف سنی علماء نے نقل کیا ہے خود انہیں کے قول کے مطابق وہ روایتیں متواتر ہیں^۲ بلکہ انہیں علماء میں سے بعض اس بات کے بھی قائل ہیں کہ حضرت مہدی (عج) پر اعتقاد تمام اسلامی فرقوں میں پایا جاتا ہے^۳ انھوں نے حضرت مہدی (عج) اور ان کے ظہور کے علامات کے سلسلہ میں مختلف کتابیں بھی تحریر کی ہیں ان روایتوں میں سے ہم چند کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ اہل سنت نے رسول اکرم ﷺ سے متعدد روایتیں نقل کی ہیں جن میں رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں: اگر جہان میں سے صرف ایک دن باقی رہ جائے تو خدا سے اتنا طولانی کردیگا کہ میرے اہل بیت علیہم السلام میں سے ایک فرد کہ جس کا نام میرے ہی نام پر ہوگا عالمی حکومت قائم کرے گا، اور زمین کو اسی طرح عدل و داد سے پر کرے گا جس طرح وہ ظلم و جور سے بھری ہوگی^۴۔ جناب ام سلمہ رسول خدا ﷺ سے نقل فرماتی ہیں: آپ نے فرمایا مہدی (عج) میری عمرت اور فاطمہ علیہا السلام کی اولاد سے ہے۔ جناب

^۱ بحار الانوار۔ ج ۵۱، ۵۸، ج ۵۰، ۳۴، ۶۴

^۲ جیسے یہ آیات ”وَيَكُونُ الدِّينُ كَلِمَةً لِلَّهِ“ ”لِيُظْهَرَ عَلَى الدِّينِ كَلِمَةً“ ”بَقِيَّةُ اللَّهِ خَيْرٌ لِّكُمْ“

^۳ بحار الانوار۔ ج ۵۱، ۴۴، ۶۴

^۴ صواعق ابن حجر ص ۹۹، نور الابصار شبلنجی ص ۱۵۵، اسعاف الراغبین ص ۱۴۰، الفتوحات الاسلامیہ ج ۲، ص ۲۱۱

^۵ کتاب ”البيان في اخبار صاحب الزمان“ تالیف حافظ محمد بن يوسف گنجی شافعی کتاب ”البرهان في علامات مهدي آخر الزمان“ تالیف متقی

ہندی

^۶ صیح ترمذی ج ۲، ص ۴۶، صیح ابو داود ج ۲، ص ۲۰۷، مسند ابن حنبل ج ۱، ص ۲۷۸، ینابیع المودہ ص ۱۸۶، ۲۵۸، ۴۴۰، ۲۸۸، ۲۹۰

^۷ اسعاف الراغبین ۱۳۴.

ابن عباس رسول اللہ ﷺ سے نقل کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ یقیناً علی علیہ السلام میرے بعد اس امت کے امام ہیں اور اس کی اولاد سے ایک قائم منظر عجب ہے، لہذا جب وہ ظہور کرے گا تو زمین کو اسی طرح عدل و انصاف سے پر کر دے گا کہ جس طرح وہ ظلم و جور سے بھری ہوگی۔

غیبت اور اس کا راز

اہل بیت علیہم السلام کی طرف سے امام زمانہ علیہ السلام کے سلسلہ میں جو روایات وارد ہوئی ہیں ان میں آپ کی غیبت کی طرف تاکید ہوئی ہے جیسا کہ عبد العظیم حسنی، امام محمد تقی اور آپ اپنے جد امام علی علیہم السلام سے نقل فرماتے ہیں کہ ہمارے قائم عجب کی غیبت طولانی ہوگی اور شیعوں کو دیکھ رہا ہوں کہ جو بھوکے چوپایوں کی طرح جو اپنی چراگا ہوں کی تلاش میں پھرتے ہیں، اسی طرح وہ ہمارے قائم (عج) کی جستجو میں سرگرداں ہوں گے اور اے نہیں پائیں گے، یاد رہے کہ اس وقت جو بھی اپنے ایمان پر ثابت رہے گا اور حضرت کی غیبت کی وجہ سے قساوت قلب میں مبتلا نہیں ہوگا وہ روز قیامت میری صف میں ہوگا، اس کے بعد فرماتے ہیں کہ جب ہمارا قائم قیام کرے گا، اس کی گردن پر کسی کی بیعت نہ ہوگی، اور کوئی ظالم حکمران اس پر مسلط نہیں ہو سکے گا (اس ہدف کی خاطر وہ پوشیدہ طور پر متولد ہوگا اور نظروں سے اوجھل ہو جائے گا)۔

امام سجاد علیہ السلام اپنے جد حضرت علی علیہ السلام سے نقل کرتے ہیں کہ امام نے فرمایا کہ ہمارے قائم کی دو غیبتیں ہوں گی جن میں سے دوسری غیبت پہلی غیبت سے طولانی ہوگی اس وقت جو یقین قوی اور معرفت صحیح کا مالک ہوگا وہ اس کی امامت پر باقی رہے گا۔^۳ راز غیبت کو معلوم کرنے کے لئے ائمہ اطہار کی حیات کا اجمالی جائزہ لینا ہوگا۔ یہ نکتہ ہر ایک کو معلوم ہے کہ رسول خدا ﷺ کی وفات کے بعد لوگوں نے ابوبکر، پھر عمر، اس کے بعد عثمان کی بیعت کی، لیکن عثمان کی طرف سے ذات پات کے فرق اور غیر

^۱ ینابیع المودہ ۴۹۴۔

^۲ منتخب الاثر ۲۵۵۔

^۳ منتخب الاثر ۲۵۱۔

عادلانہ برتاؤ کی وجہ سے لوگوں نے اس کے خلاف قیام کر کے اسے قتل کر دیا اور پھر امیر المؤمنین حضرت علی علیہ السلام کی بیعت کی۔ حضرت علی علیہ السلام جبکہ خدا و رسول ﷺ کی طرف سے خلیفہ تھے لیکن جامعہ اسلامی کی خاطر خلفاء ثلاثہ کے ادوار میں خاموش رہے فقط اس دور میں اتمام حجت کرتے رہے لیکن اسلام و مسلمین کی منفعت جہاں ہوتی تھی وہاں اپنی کوششوں سے دریغ نہیں کرتے تھے اور جب آپ نے خلافت ظاہری کی باگ ڈور سنبھالی تو آپ کے اقتدار کا پورا دور، اصحاب جمل، نروان اور معاویہ سے جنگ کرنے میں ختم ہو گیا، آخر کار خوارج میں سے ابن ملجم کے ہاتھوں شہید ہو گئے۔

امام حسن علیہ السلام بھی معاویہ کے فرمان سے زہر کے ذریعہ شہید کر دئے گئے، اور معاویہ کی موت کے بعد اس کا بیٹا یزید کہ جسے اسلام کی کوئی پروا نہ تھی تخت سلطنت پر بیٹھ گیا، اس کے اعمال و حرکات سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کچھ ہی برسوں میں اسلام کا کوئی نام و نشان باقی نہیں رہے گا، اسی وجہ سے امام حسین علیہ السلام نے قیام کے علاوہ کوئی اور چارہ نہیں دیکھا، لہذا اپنی مطلوبانہ شہادت کے ذریعہ مسلمانوں کو بیدار اور اسلام کو فخر ہونے سے بچالیا۔

لیکن اس کے باوجود حکومت عدل کی تشکیل کے لئے شرائط مہیا نہ ہو سکے، اسی وجہ سے تمام ائمہ اطہار علیہم السلام نے عقائد و معارف احکام، تہذیب نفس اور باصلاحیت لوگوں کو تربیت کرنے میں اپنی عمریں گزار دیں، اور جہاں تک حالات اجازت دیتے تھے پوشیدہ طور پر لوگوں کو ظالموں کے خلاف ابھارتے رہے، اور انھیں حکومت اسلامی کے قائم ہونے کی امید دلاتے رہے یہاں تک کہ اسی راہ میں تمام ائمہ علیہم السلام ایک ایک کر کے شہید کر دئے گئے۔

بہر حال ائمہ اطہار علیہم السلام نے ڈھائی سو سال کی مدت میں جان لیوا مشکلات اور بے شمار زحمتوں کے باوجود لوگوں کو اسلام کے حقائق سے آشنا کرتے رہے، ان میں سے بعض نے عمومی طور پر اور بعض نے اپنے اصحاب کے لئے خصوصی طور پر تعلیم و تربیت کا آغاز کیا، اس طرح انھوں نے معارف اسلامی کے ذریعہ ایک اسلامی سماج تشکیل دینے کی کوشش کی اور شریعت محمدی ﷺ کو

بقاء کی ضمانت ملی نیز ممالک اسلامی کے گوشہ و کنار میں ظالموں کے خلاف قیام ہوئے اور ایک حد تک سنگمروں کے ظلم و ستم کا خاتمہ ہوا۔ لیکن جس خبر نے ظالموں کی نیند اڑادی وہ حضرت مہدی (عج) کے ظہور کی خبر تھی جو ان کی نابودی کی خبر دیتی تھی، اسی وجہ سے امام حسن عسکری علیہ السلام کو شدت و سختی سے نظر بند کر دیا تھا، تاکہ اگر آپ سے کوئی فرزند پیدا ہو تو اسے قتل کر ڈالیں، اور خود امام حسن عسکری علیہ السلام کو جوانی کے عالم میں زہر سے شہید کر ڈالا لیکن خدا کا یہ ارادہ تھا کہ حضرت مہدی (عج) پیدا ہوں، اور انسانوں کو ان کے ذریعہ نجات مل سکے، اسی وجہ سے جب آپ پیدا ہوئے تو پانچ سال تک کچھ خاص افراد کے علاوہ کوئی بھی آپ کی زیارت نہیں کر سکتا تھا اور جب گیا رہیں امام کا انتقال ہو گیا، تو لوگوں کا ارتباط آپ سے نواب اربعہ کے ذریعہ ہوتا تھا، اسی طرح ایک مدت گزری گئی اور پھر نامعلوم مدت کے لئے غیبت کبریٰ کا زمانہ شروع ہو گیا، اور یہ زمانہ اسی وقت ختم ہو گا کہ جب اسلامی معاشرہ میں حکومت جہانی کے قائم ہونے کے لئے شرائط فراہم ہو جائیں اس وقت امام علیہ السلام خدا کے اذن سے ظہور کریں گے۔

لہذا امام علیہ السلام کی غیبت کا اصلی راز سنگمروں اور ظالموں کے شر سے محفوظ رہنا ہے اس کے علاوہ روایتوں میں دوسری حکمتیں بھی بیان ہوئی ہیں، منجملہ یہ ہے کہ خدا اس طرح لوگوں کا امتحان لینا چاہتا ہے کہ ان کے ماننے والے اپنے ایمان میں کس قدر پائدار اور ثابت قدم ہیں۔ البتہ زمانہ غیبت میں لوگ آپ کے فیوض و برکات سے محروم نہیں ہیں، بلکہ روایتوں کے مطابق آپ کے فیوض کا سلسلہ اسی طرح لوگوں کے شامل حال ہے^۱۔ کہ جس طرح خورشید بادلوں کی پشت سے نور افشانی کرتا ہے، اور آج بھی بہت سے نیک اور صالح افراد اپنی مشکلات اور بلاؤں سے خلاصی کے لئے آپ کی خدمت میں مشرف ہو چکے ہیں اس کے علاوہ آپ کا وجود لوگوں کی امید کا سبب ہے وہ آپ کے ظہور کے لئے شرائط کو مہیا کرنے کے ساتھ اپنی اصلاح کریں۔

^۱ عثمان بن سعید، محمد بن عثمان، حسین بن روح، علی بن محمد سمري.

^۲ بحار الانوار۔ ج ۵۲، ص ۹۲

سوالات

- ۱۔ انبیاءِ علیم السلام کی بعثت کا انتہائی ہدف کیا ہے؟
- ۲۔ یہ ہدف کیسے پورا ہو سکتا ہے؟
- ۳۔ کون سی آیت حکومت جہانی کے قائم ہونے کی خوشخبری دیتی ہے؟
- ۴۔ امام مہدی (عج) کے سلسلہ میں اہل سنت نے جو روایتیں نقل کی ہیں ان میں سے بعض کو بیان کریں؟
- ۵۔ اہل بیتِ علیم السلام کی طرف سے حضرت مہدی (عج) کے سلسلہ میں وارد ہونے والی روایتوں میں سے بعض کو بیان کریں؟
- ۶۔ غیبتِ صغریٰ اور کبریٰ نیز ان دونوں کے درمیان فرق کو واضح کریں؟
- ۷۔ امام زمانہ (عج) کی غیبت کا راز کیا ہے؟
- ۸۔ غیبت کے زمانہ میں لوگ امام زمانہ (عج) سے کیسے ملاقات کر سکتے ہیں۔؟

اکتالیسواں درس

شناخت عاقبت کی اہمیت

مقدمہ

اس کتاب کی ابتدا ہی میں ہم نے دین مبین اور اس کے بنیادی عقاید (توحید، نبوت، قیامت) کے بیان کے ساتھ اس بات کی تشریح و وضاحت بیان کر دی تھی کہ انسانی زندگی کا مفہوم، انہیں مسائل کے حل میں پوشیدہ ہے اور کتاب کے پہلے حصے میں خدا شناسی (توحید) کے مسائل اور دوسرے حصے میں راہ اور رہنما شناسی (نبوت و امامت) کے متعلق بحث گزر چکی ہے اور اب کتاب کے تیسرے حصے میں معاد (قیامت) کے عنوان کے تحت گفتگو کو جاری رکھتے ہیں۔ لیکن پہلے معاد کی خصوصیت اور انسان کی انفرادی، اجتماعی زندگی پر پڑنے والے اثرات سے بحث ہوگی، اور اس کے بعد اس بات کی وضاحت کریں گے کہ معاد (قیامت) کا خصوصی تصور نامحسوس روح اور اس کے زندہ جاوید ہونے کے ساتھ مشروط ہے، اور جس طرح موجودات کی معرفت بغیر خدائے وحدہ لا شریک کے ناقص ہے اسی طرح انسان کی معرفت بھی بغیر اس اعتقاد کے کہ روح زندہ جاوید ہے ناقص اور نامکمل ہے۔ اس بیان کے بعد قیامت کے بنیادی مسائل مناسب انداز سے اس کتاب میں بیان کریں گے۔

قیامت پر اعتقاد کی اہمیت و ضرورت

زندگی کا جذبہ، اس کی ضرورت اور خواہشات اور ضروریات زندگی کی طرف اس کا رجحان اصل میں یہ تمام چیزیں صرف کمال اور ابدی سعادت تک پہنچنے کا ذریعہ ہیں، اور اب رہی بات کہ انسان انہیں حاصل کرنے کے لئے کس راہ کا انتخاب کرے، تو اس کے لئے ضروری ہے کہ پہلے یہ دیکھا جائے کہ انسان ان اہداف کی شناخت کیسے کرے؟ جو اسے اس کے ہدف تک پہنچا دیں درحقیقت زندگی کے راستے کی تعیین اور اپنی رفتار و کردار کو معین کرنے کا اصل سبب انسان کی اپنی سوچ، بوجھ اور تصور اور خود

اپنے کمال و سعادت اور اپنی حقیقت کو پہچان لینا ہے، اور جو لوگ زندگی کو صرف مادیت اور اس سے متعلق عناصر کو اپنی حقیقت سمجھتے ہیں، اور یہ تصور کرتے ہیں کہ یہی چند روزہ زندگی ہی سب کچھ ہے اور موت کے بعد صرف عدم اور فنا ہے یا اخروی لذت اور سعادتِ ابدی کے منکر ہیں وہ اپنی زندگی کو کچھ ایسا بنا لیتے ہیں کہ اب صرف ان کے پیش نظر یہی دنیاوی لذت اور خواہش ہی ان کی سعادت اور نیک بنی ہے لیکن جو افراد اپنی دنیاوی زندگی کو ہی نہیں بلکہ اس کے آگے آنے والی زندگی کی حقیقت سے آشنا ہیں وہ اپنے اعمال و کردار کو آنے والی ابدی زندگی کا وسیلہ بناتے ہیں اور ایسے بنیادی کام انجام دیتے ہیں جو ان کے آنے والی اس زندگی میں مددگار ثابت ہوں یا دوسرے الفاظ میں یوں کہا جائے کہ مادی زندگی کی سختیوں اور ناکامیوں کے باوجود یہ لوگ مایوس اور ناامید نہیں ہوتے، بلکہ سعادت و کامیابی تک پہنچنے کے لئے اپنی بھرپور کوشش اور تلاش جاری رکھتے ہیں۔

انسانی زندگی کے یہ دو اہم رخ صرف اس کی انفرادی زندگی ہی پر منحصر نہیں ہیں بلکہ اجتماعی زندگی پر گہرا اثر چھوڑتے ہیں چنانچہ آخرت پر ایمان اور جزا و سزا جیسی چیزیں انسان کو دوسروں کے حقوق کا خیال، ایثار اور احسان جیسے قابل تحسین کردار پر آمادہ کرتی ہیں اور ظاہر ہے کہ جس معاشرے یا قوم و ملت کا یہ عقیدہ ہوگا، اس کے یہاں قانون عدالت پر عمل، ظلم و ستم کا مقابلہ اور زور و زبردستی کا کم سے کم استعمال ہوگا، اور واضح رہے کہ اگر یہ اعتقادات دنیا کی تمام قومیں اپنا شیوہ بنالیں تو اس دنیا کی بین الاقوامی مشکلات خود بخود حل ہو جائیں گی۔ لہذا ان تمام بیانات کے پیش نظر قیامت کی اہمیت و ضرورت روز روشن کی طرح واضح ہو جاتی ہے بلکہ تنہا عقیدہ توحید (بغیر عقیدہ قیامت کے) بھی انسانی زندگی کو صحیح راستہ دکھانے سے قاصر ہے اور یہی وجہ ہے کہ تمام ادیان آسمانی خصوصاً دین اسلام اور تمام پیغمبران الہی قیامت کے عقیدہ کو بہت اہمیت دیتے تھے اور ان کی ہمیشہ یہی کوشش رہی کہ یہ عقیدہ انسانیت کا اہم ترین رکن بن جائے اور لوگوں کے دلوں میں یہ عقیدہ راسخ ہو جائے۔

آخرت پر اعتقاد، انفرادی اور اجتماعی زندگی کے اعتبار سے صرف اسی صورت میں کارگر ثابت ہوں گے جب ہم یہ مان لیں کہ اس دنیا کے اعمال اور ابدی زندگی کی سعادت و بد بنی کے درمیان ایک قسم کا رابطہ علیت پایا جاتا ہے یا کم از کم یہ ثابت ہو

جائے، کہ وہاں کا ثواب و عذاب صرف اس دنیا میں عمل کرنے کا نتیجہ ہے (جیسے دنیوی فوائد اور نقصان) اور اگر ایسا نہیں ہے تو پھر مسئلہ آخرت اپنی حقیقت و اصلیت کھوٹھے گا کیونکہ اس کے معنی یہ ہوں گے کہ دنیوی سعادت حاصل کرنے کے لئے اسی دنیا میں کوشش ہونی چاہیے اور اخروی سعادت و نجات کے لئے وہاں کی دنیا ہونی چاہیے لہذا ضرورت ہے کہ قیامت کے اثبات کے ساتھ ساتھ دنیا و آخرت کے درمیان پائے جانے والے رابطے اور ابدی خوشنہی یا بدنہی میں انسان کے اختیار اعمال و کردار کی تاثیر کو بھی ثابت کر دیا جائے۔

قیامت کے مسئلہ پر قرآن کی تاکید

قرآن کریم کی ایک تہائی سے زیادہ آیتیں انسان کی ابدی زندگی سے متعلق ہیں بعض آیات بیان کرتی ہیں کہ آخرت پر ایمان رکھنا لازم ضروری ہے^۱ اور بعض آیتیں انکار آخرت کے نقصانات کو بیان کرتی ہیں^۲ بعض آیتیں ابدی نعمتوں کا تذکرہ کرتی ہیں^۳ اور بعض آیات میں ابدی عذاب کا ذکر موجود ہے^۴ اور اسی طرح سے بہت سی دوسری آیتوں میں بھی نیک اور بد اعمال اور آخرت میں اسی بنیاد پر ہونے والے ثواب و عقاب کا ذکر ہوا ہے، نیز اور دوسرے طریقوں سے بھی قیامت کے امکان اور اس کی ضرورت و اہمیت پر قرآن نے تاکید کی ہے، اور ساتھ ہی ساتھ منکران قیامت کے سامنے محکم اور ٹھوس دلیلیں بھی پیش کی ہیں اور ان کے اعتراضات کے جوابات دئے ہیں چنانچہ گمراہی، انکار قیامت اور اس سے فراموشی کی بنیادی وجہ بھی بیان فرمائی ہے^۵ اگر قرآن مجید میں غور کیا جائے تو اس سے یہ بات صاف ظاہر ہوتی ہے کہ پیغمبروں کی گفتگو اور ان کے اقوال نیز لوگوں سے بحث و مباحثہ کا بیشتر حصہ قیامت کے موضوع سے متعلق ہے بلکہ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ ان کی کوششیں توحید کو ثابت کرنے سے

^۱ بقرہ ۴، لقمان ۴، نمل ۹۳، ۲۴

^۲ اسراء ۱۰، فرقان ۱۱، صبا ۸، مومنون ۷۴،

^۳ رحمن ۴۶، تا آخر سورہ، واقعہ ۱۵، ۳۸، الذہر ۲۱، ۱۱،

^۴ حاقہ آیت۔ ۲۷، ۲۰، ملک ۱۱، ۶، واقعہ ۴۲، ۵۶،

^۵ سورہ ص آیت ۲۶ سورہ سجدہ آیت ۱۴۰

زیادہ قیامت کو ثابت کرنے کے لئے رہی ہیں کیونکہ اکثر افراد قیامت کو قبول کرنے میں بہت ہی شدید و سخت رہے اور اس سختی کی بھی شاید دو وجہ بیان ہو سکتی ہے۔ ۱۔ پہلی وجہ جو مشترک ہے وہ یہ ہے کہ ہر غیبی اور نامحسوس چیزوں کا انکار کر دینا ہے۔

۲۔ اور دوسری وجہ جو قیامت کے مسئلہ سے مخصوص ہے وہ یہ ہے کہ انسان کا کسی قانون کا پابند نہ ہونا (لا ابالی ہونا) ہے کیونکہ قیامت کا قبول کرنا گویا اپنی زندگی کا محدود کر لینا اور برے اعمال، منجملہ ظلم و فساد و گناہوں سے نفرت و بیزارمی کا مطلب یہ ہے کہ انسان اپنی خواہشات سے دست بردار ہو جائے اور اس کے انکار کر دینے کی صورت میں ہوا و ہوس اور شہوت پرستی و خود خو ابی کے سارے راستے کھل جائیں گے قرآن مجید اسی نکتہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ارشاد فرما رہا ہے۔ (اَيَحْسَبُ الْاِنْسَانُ اَلَن نَّجْعَلَ عَظَامَهُ * بَلٰی قَادِرِيْنَ عَلٰی اَنْ نُّوْمِیْ بَنَانًا * اِنَّ یُرِیْدُ الْاِنْسَانُ لِنَفْخِرْ اَمَامَهُ) کیا انسان یہ خیال کرتا ہے کہ ہم اس کی ہڈیوں کو جمع نہ کر سکیں گے یقیناً ہم اس بات پر قادر ہیں کہ اس کی انگلیوں کے پورے دست کر لیں بلکہ انسان یہ چاہتا ہے کہ اپنے سامنے برائی کرتا چلا جائے۔

اور اسی قیامت کے اس حقیقی معنی سے انکار و امتناع کو ان افراد میں ڈھونڈا جاسکتا ہے جو اپنی تحریر و تقریر یا رفتار و گفتار کے ذریعہ اس بات کی کوشش کرتے ہیں کہ قیامت کو اسی دنیا کا ایک حادثہ بنا کر لوگوں کے سامنے پیش کریں جس سے مراد یہ ہے کہ اس دنیا میں قومیں آئیں گی جن میں طبقاتی نظام نہ ہوگا، یا جنت سے مراد یہی زمین ہے یا آخرت اور اس سے متعلق دوسری چیزیں صرف فرضی اور تصوراتی یا خود ساختہ داستانیں ہیں قرآن مجید نے ایسے افراد کو (انسانِ ناشیطان) اور (انبیاء کے دشمنوں) سے تعبیر کیا ہے جو اپنے نرم و لطیف لہجہ اور سحر آمیز باتوں کے ذریعہ لوگوں کے دلوں کو اپنی طرف کھینچ لیتے ہیں اور لوگوں کو صحیح عقیدہ و ایمان اور احکامِ الہی پر عمل کرنے سے منحرف کر دیتے ہیں۔ (وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِیٍّ عَدُوًّا شَاطِیْنِ الْاِنْسِ وَ الْبَحْرِ یُوحٰی بِغَضَمِ اِلٰی بَعْضِ زُخْرُفِ الْقَوْلِ غُرُوْرًا وَّلَوْ غَاۤءَ رَبُّكَ مَا فَعَلُوْهُ فَذَرْهُمْ وَ اِنۡ یَفْثَرُوْنَ * وَ لَتَضُنَّیۡ اِلَیْهِ اَفْئِدَةُ الَّذِیۡنَ لَا یُؤْمِنُوْنَ بِالْآخِرَةِ وَ لَیْسَ ضَوْءُ

^۱ قیامت۔ آیت / ۳، ۵

^۲ نمل آیت ۶۸، الحاق آیت ۱۷،

وَلْيَقْتَرِفُوا مَآئِمًا مُقْتَرِفُونَ^۱) اور اسی طرح ہم نے ہر نبی کے لئے شیاطین جن وانس میں سے، انکا دشمن قرار دیا ہے یہ آپس میں ایک دوسرے کو دھوکہ دینے کے لئے مہل باتوں کے اشارے کرتے ہیں اور اگر خدا چاہ لیتا تو یہ ایسا ہرگز نہیں کر سکتے تھے لہذا اب آپ انھیں ان کے افتراء پر چھوڑ دیجئے، اور یہ اس لئے کرتے ہیں کہ جن لوگوں کا ایمان آخرت پر نہیں ہے ان کی طرف مائل ہو جائیں اور وہ اسے پسند کر لیں اور پھر خود بھی انھیں کی طرف افتراء پر دازی کرنے لگیں۔

نتیجہ

انسان کو چاہیے ایک ایسے راستہ کا انتخاب کرے جو اسے اس کی منزل مقصود یعنی کمال اور سعادت ابدی سے ہم کنار کر دے اور اس کے لئے ضروری ہے کہ پہلے وہ اس بات پر غور کرے، کہ کیا انسان کی زندگی اس کی موت کے بعد ختم ہو جاتی ہے یا اس کے بعد بھی کوئی دوسری زندگی ہے؟ یا یہ کہ اس جان سے دوسرے جان میں منتقل ہونا ایک شرے دوسرے شر میں سفر کرنے جیسا ہے، کہ جس کے لئے زندگی کے تمام وسائل اور ضروریات کو وہیں حاصل کیا جاسکتا ہے؟

یہ کہ اس دنیا کی خاص زندگی اس آنے والی زندگی کی خوشی اور ناخوشی کا مقدمہ ہے اور جو کام و اعمال یہاں انجام دئے جائیں اور اس کے آخری نتیجہ سزا یا جزا کو وہاں حاصل کیا جائے جب تک یہ مسائل حل نہیں ہو جاتے، تب تک انسان صحیح راستے اور مقصد کا انتخاب نہیں کر سکتا، کیونکہ جب تک انسان کو اس کے سفر کا مقصد معلوم نہ ہو، تب تک اس تک پہنچانے والے راستے کو معین نہیں کیا جاسکتا۔ یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ اس حیات ابدی کے وجود کا احتمال جتنا بھی ضعیف اور فرضی ہی کیوں نہ ہو پھر بھی ہوشیار اور عقلمند انسان کو اس کے سلسلے میں تحقیق اور تلاش و جستجو پر آمادہ کرتا ہے، اس لئے کہ اس احتمال کی کوئی حد معین نہیں ہے۔

^۱ انعام ۱۱۲، ۱۱۳،

سوالات

- ۱۔ اپنی زندگی کو منظم بنانے کے لئے قیامت پر اعتقاد رکھنے اور نہ رکھنے میں کیا فرق ہے؟
- ۲۔ کس صورت میں اخروی زندگی پر اعتقاد رکھنا زندگی کو منظم بنانے میں اچھا کردار ادا کر سکتا ہے؟
- ۳۔ قیامت کے متعلق قرآن مجید کی تاکید کو واضح طور سے بیان کیجئے؟
- ۴۔ لوگ قیامت کو قبول کرنے میں اتنی سختی سے کیوں کام لیتے ہیں، شرح کیجئے؟
- ۵۔ قیامت پر اعتقاد کی تحریف میں دلوں کے مریض لوگوں کی کوششوں کے چند نمونے اور اس کے مقابلے میں قرآن کا موقف کیا ہے؟
- ۶۔ قیامت کے بارے میں تحقیق کی ضرورت کو لکھتے ہوئے اس تحقیق کی برتری کو دنیاوی مسائل پر تحقیق کرنے پر بیان کریں، شرح دیں؟

بیالیسواں درس

مسئلہ قیامت اور مسئلہ روح کا باہمی رابطہ

زندہ موجودات کی وحدت کا معیار

تمام حیوانوں کی طرح انسان کا بدن بھی زندہ اور متحرک اجزاء اور عناصر کا ایک مجموعہ ہے کہ جس میں سے ہر ایک عنصر مسلسل تبدیلی و تغیر کا شکار ہے، اور اس کا یہ انداز پیدائش کے وقت سے لیکر زندگی کے خاتمہ تک بدلتا نہیں ہے یا یہ کہ ان عناصر اور اجزاء کی تعداد ہمیشہ ایک حالت پر باقی ہے۔ اس تبدیلی اور تغیرات کو دیکھتے ہوئے جو حیوانات بلکہ خاص طور سے انسانوں کے بدن میں جاری ہے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ کون سا معیار ہے جس کی بنیاد پر متغیر اور بدلے ہوئے عناصر و اجزاء کے مجموعہ کو موجود واحد کا نام دیا جائے، جبکہ ممکن ہے کہ پوری زندگی میں متعدد مرتبہ وہ اجزاء اور عناصر تبدیل ہو جائیں اور ان کی جگہ اسی طرح کے دوسرے عناصر آجائیں؟ اس سوال کا سب سے آسان اور سادہ جواب جو دیا جاتا ہے وہ یہ ہے کہ زندہ موجودات میں وحدت کا معیار ان اجزاء کا ایک دوسرے سے ایک ہی زمانے میں یا الگ الگ متصل ہونا جبکہ وہ عناصر تدریجی طور سے ناپید اور ختم ہوتے رہتے ہیں اور اس جگہ دوسرے عناصر پیدا ہو جاتے ہیں لیکن پیوستگی اور اتصال کے سبب جو مسلسل تبدیل و تغیر کے ساتھ ہے موجود واحد کا نام دیا جاتا ہے۔

لیکن یہ جواب اطمینان بخش نہیں ہے کیوں کہ اگر ایک مکان فرض کر لیں کہ جو مختلف اور متعدد ایٹموں سے مل کر تیار ہوا ہو، اور اس کی ایٹموں کو آہستہ آہستہ ایک ایک کر کے تبدیل کرتے رہیں، اس طرح کی کچھ مدت کے بعد پہلے کی ایک ایٹم بھی باقی نہ رہ جا

^۱ اس سوال سے پہلے ایک دوسرا سوال سامنے آتا ہے کہ بنیادی طور سے ثابت اور بند مجموعے میں وحدت کا معیار کیا ہے؟ اور کیمیا ئی ترکیب کو کس معیار کے مطابق موجود واحد شمار کیا جا سکتا ہے؟ لیکن بحث و گفتگو کے زیادہ طولانی ہو جانے کی وجہ سے اس کو یہاں چھیڑنے سے پرہیز کیا جا رہا ہے، ضرورت مند حضرات آموزش فلسفہ جلد اول درس نمبر ۲۹ کی طرف رجوع کریں۔

ئے تو ایسی صورت میں اس نئی ایٹموں کے مجموعے کو وہی پہلے والا مکان نہیں کہا جاسکتا، اگرچہ سہل انگاری کی بنا پر اعتبار سے ایسی تعمیرات کا استعمال کیا جاتا ہے بالخصوص ان لوگوں کی جانب سے جو اس مجموعے کے اجزاء کی تبدیلی کی اطلاع نہیں رکھتے۔ گذشتہ جواب کو اس طرح مکمل کیا جاسکتا ہے کہ یہ تبدیلی اس مجموعے کی وحدت کے لئے نقصان دہ نہیں ہے کہ جب ایک فطری اور اندرونی سبب کی بنیاد واقع ہو جیسا کہ زندہ موجودات میں دیکھا جاتا ہے، لیکن کسی مکان کی ایٹموں کی تبدیلی ایک باہری اور خارجی سبب کی بنیاد پر واقع ہوئی ہے لہذا اس پوری مدت میں جس دوران اس کے اجزاء تبدیل ہوتے ہیں اس کی طرف حقیقی وحدت کی نسبت نہیں دی جاسکتی۔

یہ جواب اس ایک طبعی و فطری سبب کے قبول کرنے پر موقوف ہے جو ان تمام تغیرات اور تبدیلی کے ساتھ ہمیشہ باقی رہتا ہے اور ان اجزاء اور عناصر کے نظام اور ترتیب کو محفوظ رکھتا ہے، پس دوبارہ اس سبب کے بارے میں سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس سبب کی حقیقت کیا ہے؟ اور اس کی وحدت کا معیار کیا ہے؟ معروف فلسفی نظریہ کے مطابق ہر طبعی موجود میں وحدت کا معیار ایک امر بيط (غیر مرکب) اور غیر محسوس شے ہے اور وہ طبیعت (فطرت) یا صورت یعنی اجزاء اور ذرات کے بدلنے سے تبدیل نہیں ہوتے اور زندہ موجودات کہ جو مختلف افعال انجام دیتے ہیں جیسے غذا حاصل کرنا اور رشد و نمو کرنا، ایجاد و تولید کرنا وغیرہ ایک عامل کی وجہ سے ہے کہ جس کو نفس کو کہا جاتا ہے۔

قدیم فلسفی علماء نفس نباتی اور نفس حیوان کو مادی اور نفس انسانی کو مجرد عن المادہ جانتے تھے لیکن بہت سے اسلامی حکماء منجملہ صدر المتألهین شیرازی نے نفس حیوانی کو بھی مجرد اور مادہ سے خالی ہونے کو ایک مرتبہ جانا ہے اور شعور وارادہ کو اسی مجرد موجود کی علامت ٹھہرایا ہے لیکن ماتریالیسم کہ جو وجود کو مادے اور اس کی خاصیتوں میں منحصر جانتے ہیں وہ روح مجرد کا انکار کرتے ہیں اور جدید مادہ پرست انسان (مادین) (جیسے پوزیٹو لیسم بنیادی طور سے ہر غیر محسوس چیز کا انکار کرتے ہیں اور جب

^۱ جاننا چاہیے ان میں سے ہر ایک لفظ کے دوسرے اصطلاحی معنی بھی پائے جاتے ہیں اور یہاں پر ان سے مراد وہی صورتِ نو عیہ ہے۔

کسی بھی غیر محسوس چیز کو قبول نہیں کرتے جس کے نتیجے میں ان کے پاس زندہ موجودات میں وحدت کے معیار کے سلسلے میں کوئی صحیح جواب نہیں ہے۔ اس بنا پر کہ نباتات کے اندر معیار وحدت اس کا نفس نباتی ہوتا ہے لہذا نباتی زندگی کا وجود، مادہ متعدد میں صورت اور نفس نباتی خاص کی وجہ سے ہے، اس طرح سے جس وقت مادہ کی استعداد ختم ہو جائے گی اس وقت اس کا صورت اور نفس نباتی ہونا بھی ختم ہو جائے گا اور اگر ہم یہ فرض کر لیں کہ وہ مادہ دوبارہ صورت نباتی کو قبول کرنے کی صلاحیت و استعداد کو حاصل کر سکتا ہے تو ایسی صورت میں ایک جدید نفس نباتی کا اس میں اضافہ ہوگا، لیکن دو (پرانے اور نئے) سبزیوں (درخت یا پودے) کے درمیان مکمل شباهت کے باوجود بھی حقیقی وحدت نہیں پائی جاسکتی اور اگر دقیق نظر سے دیکھا جائے تو اس جدید سبزی کے پہلے والا سبزہ نہیں کہا جاسکتا۔

لیکن حیوان اور انسان کے متعلق، چونکہ ان دونوں کی روح مجرد ہے (مادہ سے خالی ہے) لہذا بدن کے نابود اور ختم ہوجانے کے بعد بھی باقی رہ سکتی ہے، اور جب دوبارہ بدن میں داخل ہوگی تو اپنی وحدت کو حفظ کر سکتی ہے چنانچہ موت سے پہلے بھی یہی روح کی وحدت شخص کی وحدت کا معیار تھی اور مادہ کا تبدیل ہونا شخص کے بدل جانے کا سبب نہیں بنتا، لیکن اگر کوئی انسان و حیوان کے وجود کو اسی بدن اور اسکی خاصیتوں میں منحصر جانے۔

اور روح کو بھی اسی بدن کی خاصیت یا خاصیتوں کا مجموعہ تسلیم کرے یہاں تک کہ اگر اس کو غیر محسوس لیکن مادی تصور کرے، کہ جو بدن کے اعضاء و جوارح کے ختم ہوجانے کے ساتھ ساتھ وہ (روح) ختم ہو جائے گی تو ایسا انسان قیامت کا صحیح تصور نہیں کر سکتا، کیونکہ اس فرض کے ساتھ کہ بدن دوبارہ حیات کی استعداد پیدا کر سکتا ہے، کیونکہ نئی خاصیتیں اس کے اندر پیدا ہوں گی اور ایسی صورت میں وحدت کا حقیقی معیار وجود میں نہیں آسکتا، کیونکہ فرض یہ ہے کہ پہلے کی خاصیتیں بالکل ختم ہو چکی ہیں اور نئی خاصیتوں نے جنم لیا ہے۔

خلاصہ گفتگوی یہ ہے کہ اس وقت موت کے بعد حیات کا صحیح تصور ممکن ہے جب روح کو بدن سے اور اس کی خاصیتوں سے ہٹ کر الگ سمجھیں اور یہاں تک اس کو ایک مادی صورت نہ سمجھیں جو بدن میں حلول کر گئی ہو اور بدن کے ختم ہونے کے ساتھ ساتھ ختم ہو جائے، لہذا سب سے پہلے روح کو قبول کرنا ہوگا، اس کے بعد اس کو ایک امر جو ہر سی تسلیم کرنا ہوگا نہ بدن کے اعراض کے مانند کوئی شے، (بدن کے اوپر عارض ہونے والی کیفیات) اور اس کے بعد پھر اس کو بدن کے ختم ہو جانے کے بعد بھی قابل بقا اور قابل استقلال ماننا ہوگا نہ کہ حلول کرنے والی شے کی طرح (اصطلاح میں مادہ کے مطابق) کہ جو بدن کے ختم ہونے کے ساتھ ساتھ ختم ہو جاتی ہے۔ انسان کے وجود میں روح کا مقام (کردار) یہاں پر جس نکتہ کی طرف اشارہ کرنا ضروری ہے وہ یہ ہے کہ انسان کا روح اور بدن سے مرکب ہونا، پانی میں آکسیجن اور ہیڈروجن سے مرکب ہونے کے مانند نہیں ہے کہ ان دونوں کے ایک دوسرے سے جدا ہونے کے ساتھ ساتھ خود مرکب کا وجود بھی ایک کل کے عنوان سے ختم ہو جائے۔

بلکہ روح انسان کا ایک اصلی عنصر ہے اور جب تک یہ عنصر باقی ہے انسان کی انسانیت بھی باقی رہے گی اور شخص کی شخصیت بھی باقی رہے گی، اسی لئے بدن کے عناصر اور اجزاء کے بدل جانے کی وجہ سے شخص کی وحدت پر کوئی بڑا اثر نہیں پڑتا، کیوں کہ انسان کی وحدت کا حقیقی معیار اس کی روح ہے قرآن حکیم اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ان منکرین قیامت کے جواب میں جو کہتے تھے کہ کیسے ممکن ہے کہ ایک انسان اپنے بدن کے سارے اجزاء ختم ہونے کے بعد دوبارہ نئی حیات پا جائے؟

خداوند سے عالم ارشاد فرماتا ہے۔ (قُلْ ۙ تَوَفَّاكُم مِّلَکُ الْمَوْتِ الَّذِیْ وُکِّلَ بِکُمْ) کمد و (کہ تم نابود نہیں ہو گے بلکہ) فرشتہ موت تمہیں اٹھائے گا بس ہر انسانیت اور شخصیت کا قوام اور وجود اسی چیز سے وابستہ ہے جس کو ملک الموت (اٹھا لیتا) قبض کر لیتا ہے نہ کہ بدن اس اجزاء کے ذریعہ جو زمین میں بکھر جاتا ہے اور ختم ہو جاتا ہے۔

سوالات

- ۱۔ کیا ایک مجموعہ کے متغیر اجزاء کے اتصال کو اس کی وحدت کا معیار مانا جاسکتا ہے؟ اور کیوں؟
- ۲۔ کون سے دوسرے معیار کو ارگانیک ترکیبات کی وحدت کے لئے پیش کیا جاسکتا ہے؟
- ۳۔ موجودات مرکب و باخصوص زندہ موجودات کے بارے میں معروف فلسفی کا نظریہ کیا ہے؟
- ۴۔ صورت طبعی اور نفس میں کیا فرق ہے؟
- ۵۔ نفس نباتی، اور نفس حیوانی و انسانی میں کیا فرق ہے؟ اور یہ فرق مسئلہ قیامت میں کیا اثر رکھ سکتا ہے؟
- ۶۔ قیامت کا صحیح تصور کن اصول کا محتاج ہے؟
- ۷۔ انسان کا روح و بدن کے ساتھ مرکب ہونے اور کیمیائی ترکیبات میں کیا فرق ہے؟

تینتا لیواں درس

روح کا غیر محسوس ہونا روح کا مجرد ہونا

مقدمہ

اس سے پہلے ہم یہ جان چکے ہیں کہ مسئلہ قیامت مسئلہ روح کے اوپر موقوف ہے، یعنی اس وقت کہا جاسکتا ہے (جو بھی مرنے کے بعد زندہ ہوگا وہ واقعاً وہی پہلا شخص ہوگا) کہ جب بدن کے ختم ہو جانے کے بعد بھی روح باقی رہے یا یوں کہا جائے کہ ہر انسان اپنے مادی بدن کے علاوہ ایک غیر مادی جو ہر رکھتا ہے جو بدن سے الگ ہو کر مستقل رہنے کی قابلیت رکھتا ہے، اگر ایسا نہ ہو تو اسی شخص کے لئے دوبارہ حیات کا فرض کرنا عاقلانہ تصور نہیں ہوگا، لہذا قیامت کے اثبات اور اس سے متعلق مسائل اور خود قیامت کو بیان کرنے سے پہلے یہ مطلب ثابت ہو جانا چاہیے اس لئے ہم نے اس درس کو اسی موضوع سے مخصوص کر دیا ہے اور اس کو ثابت کرنے کے لیے دو طریقوں سے استدلال کریں گے، ایک تو عقل کے ذریعہ سے اور دوسرا وحی کے ذریعہ روح کے غیر محسوس ہونے پر عقلی دلائل کافی زمانے سے فلسفیوں اور مفکروں نے روح (کہ جس کو فلسفی اصطلاح میں نفس کہا جاتا ہے^۱) کے بارے میں کافی بحث و گفتگو کی ہے، اور خصوصاً اسلامی حکماء نے اس موضوع کو بہت ہی اہمیت دی ہے، اپنی فلسفی کتابوں کے زیادہ حصوں کو اسی کی بحث سے مخصوص کر دیا ہے اور اس کے علاوہ خود مستقل کتابیں بھی تحریر کی ہیں، اور ان لوگوں کے نظریات کو جو روح کو بدن کے اعراض میں سے ایک عرض یا مادی صورت (جو بدن کے مادہ میں ڈھل جائے) تصور کرتے ہیں بے شمار

^۱ ممکن ہے یہ تو ہم پیدا ہو کہ وحی کے ذریعہ استدلال قیامت اور روح کے مسائل کو ثابت کرنے کے لئے ایک دوری استدلال ہے کیونکہ اس دلیل میں جو بنوت کی ضرورت پر پیش کیا تھا اس آخری حیاتیات کو جو مسئلہ روح پر موقوف ہے ایک اصل موضوع کے عنوان سے نظر میں رکھا تھا لہذا خود اس اصل کو ثابت کرنا وحی کے ذریعہ اور بنوت کے ذریعہ مسئلہ روح پر موقوف ہے یعنی دور لازم آئے گا لیکن تو جسے ضروری ہے کہ وحی کے ذریعہ استدلال کی صحت میں ضرورت بنوت کے مسئلہ کی ضرورت نہیں ہے بلکہ اس کے وقوع پر موقوف ہے کہ جو معجزہ کے ذریعہ ثابت ہو گا (غور کیجئے) اور چونکہ قرآن مجید خود بخود معجزہ اور پیغمبر ﷺ کی حقانیت کی دلیل ہے لہذا اس کے ذریعہ روح اور قیامت کے مسائل کو ثابت کرنے کے لئے استدلال کرنا صحیح ہے۔
^۲ جاننا چاہئے کہ نفس کی فلسفی اصطلاح اس کے اخلاقی اصطلاح کے علاوہ ہے جو عقل کے مقابل میں اور اس کی ضد کے عنوان سے استعمال کی جاتی ہے

دلائل کے ذریعہ رد اور باطل کیا ہے، ظاہر ہے کہ اس سے تفصیلی بحث اس موضوع کے ذیل میں اس کتاب کے لئے مناسب نہیں ہے لہذا اس مختصر گفتگو پر اکتفا کرتے ہیں، اور کوشش کرتے ہیں کہ اس باب میں ایک واضح بیان اور محکم گفتگو پیش کریں، چنانچہ یہ بیان چند عقلی دلیلوں پر مشتمل ہے جسے ہم اس مقدمہ کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔ ہم اپنی جلد اور کھال کے رنگ اور اپنے بدن کی شکل و صورت کو اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں اور اعضاء بدن کی نرمی اور سختی کو اپنی قوت لامسہ کے ذریعہ محسوس کرتے ہیں نیز اس کو تشخیص دیتے ہیں اور اپنے بدن کے اندرونی اجزاء کے بارے میں صرف غیر مستقیم طریقہ سے اطلاع حاصل کرتے ہیں، لیکن ہم اپنے اندر خوف و محبت اور غصہ و ارادہ نیز اپنی فکر کو بغیر حسی اعضاء کے درک کر لیتے ہیں، اور میرا ذاتی وجود (نفس) جو قوت احساسات کا مالک ہے نیز عطف و مہربانی اور نفسیاتی حالات اپنے اندر رکھتا ہے بغیر حسی اعضاء کے آگاہ ہے۔ لہذا انسان کلی طور سے دو طرح کے ادراکات کا مالک ہے، ادراک کی پہلی قسم وہ ہے کہ جس میں حسی اعضاء کی ضرورت پڑتی ہے، اور ادراک کی دوسری قسم وہ ہے جس میں حسی اعضاء کی ضرورت نہیں پڑتی۔

ایک دوسرا نکتہ یہ ہے کہ ان خطاؤں اور غلطیوں کے پیش نظر جو ادراکات حسی میں پائی جاتی ہیں، ممکن ہے کہ خطا کا احتمال، ادراک کی پہلی قسم سے مربوط ہے لیکن دوسری قسم میں کسی بھی طرح کے خطا و شبہ کا امکان نہ ہو، مثال کے طور پر ممکن ہے کہ کوئی شک کرے کہ کیا آیا اس کی کھال کا رنگ واقعا ویسا ہی ہے جیسا وہ محسوس کرتا ہے یا نہیں، لیکن کوئی بھی انسان اپنی فکر اور ذہن کے بارے میں یہ شک نہیں کر سکتا کہ اس کے وہاں سوچنے کی قوت ہے یا نہیں، ارادہ کیا یا نہیں، شک پیدا ہوا یا نہیں۔ اس مفہوم کو فلسفہ میں اس تعمیر کے ساتھ بیان کیا جاتا ہے کہ علم حضوری بغیر کسی واسطے کے خود واقعیت سے متعلق ہوتا ہے اس لئے اس میں خطا کا امکان نہیں ہے لیکن علم حصولی چونکہ ادراکی واسطے کے ذریعہ سے حاصل ہوتا ہے لہذا ذاتی اعتبار سے قابل شک و تردید ہے یعنی انسان کے یقینات اور اس کے حتمی علوم علم حضوری میں جہ شہود کے ذریعہ حاصل ہوتے ہیں، وہ علم بہ نفس یعنی احساسات

اور عواطف اور دوسرے نفسیاتی حالات کو بھی شامل میں اس بنا پر (میں) کا وجود جو درک کرنے والا ہے، غور و فکر کرنے والا شک و شبہ کے قابل نہیں ہے جیسا کہ خوف و محبت اور غصہ اور فکر و ارادہ بھی قابل شک نہیں ہے۔ اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا یہ (میں) وہی مادی اور محسوس بدن ہے اور کیا یہ نفسیاتی حالات بھی اسی بدن کا ایک عارضہ ہے یا ان کا وجود بدن کے وجود سے علیحدہ ہے اگرچہ اس ۲۴۹۲۴۹ میں، اور ۲۴۹۲۴۹ بدن کے درمیان نہایت ہی گہرے تعلقات ہیں اور اپنے اکثر افعال کو اسی بدن کے ذریعہ انجام دیتا ہے اور اس میں اپنا اثر بھی ڈالتا ہے اور خود اس بدن سے متاثر بھی ہوتا ہے، مذکورہ مقدمہ کے پیش نظر اس سوال کا جواب بہت آسانی سے دریافت ہو جاتا ہے کیونکہ۔

۱۔ سب سے پہلے م ۲۴۹۲۴۹ میں، کو علم حضوری کے ذریعہ درک کرتے ہیں جبکہ ۲۴۹۲۴۹ بدن، کو حسی اعضاء کے ذریعہ محسوس کیا جاتا ہے۔

۲۔ دوسرے ۲۴۹۲۴۹ میں، ایک ایسا وجود ہے جو اپنی وحدت اور حقیقی شخصیت کے وصف کے ساتھ دسیوں سال تک باقی رہتا ہے اور اس وحدت و شخصیت کو ہم ناقابل حفظ علم حضوری کے ذریعہ درک کرتے ہیں درآں حالیکہ بدن کے اجزاء بارہا تبدیل ہوتے رہتے ہیں اور سابق اور لاحق اجزاء کے درمیان کوئی بھی معیار وحدت نہیں پایا جاتا۔

۳۔ تیسرے ۲۴۹۲۴۹ میں، ایک بیض اور ناقابل تجزیہ موجود کا نام ہے مثلاً اس کو آدھے (میں) میں تقسیم نہیں کیا جاسکتا، جبکہ بدن کے اعضاء و جوارح متعدد اور قابل تجزیہ و تقسیم ہیں۔

۴۔ چوتھے احساس اور ارادہ وغیرہ کے مانند ایک بھی نفسیاتی حالت میں مادیات کی اصلی خاصیت جیسے امتداد اور قابل تقسیم ہونا نہیں پائی جاتی، (یعنی نفسیاتی حالت میں مادیات کی کوئی بھی اصلی خاصیت نہیں پائی جاتی، اور ایسے غیر مادی امور کو مادہ (بدن)

(کے اعراض میں شمار نہیں کیا جاسکتا لہذا ان اعراض کا موضوع ایک جوہر ہے جو غیر مادی (مجرد) ہے۔ موت کے بعد روح کی بقا اور استقلال اور اسکے وجود کے اوپر اطمینان بخش اور دل نشیں دلیلیں وہ سچے خواب میں کہ بعض شخصیتوں نے مرنے کے بعد خوابوں کے ذریعہ ان حقائق کی نشاندہی کی ہے نیز اولیاء خدا کی کرامتوں اور یہاں تک کہ مرتاضوں کی ریاضتوں کے ذریعہ روح اور اس کے غیر محسوس ہونے کو ثابت کیا جاسکتا ہے، اس موضوع پر گفتگو کرنے کے لئے ایک مفصل اور مستقل کتاب درکار ہے۔

قرآنی دلائل

قرآن کریم کی رو سے روح انسانی کے وجود میں شک و شبہ نہیں کیا جاسکتا وہ روح جس کو اس کی انتہائی شرافت کی بنیاد پر خدا کی طرف منسوب کیا جاتا ہے جیسا کہ انسان کی خلقت کی کیفیت کے متعلق ارشاد ہو رہا ہے (وَنُفِخُ فِيهِ مِنْ رُوحِ^۱) بدن کو بنانے کے بعد اس میں اپنی روح پھونک دی، ایسا نہیں ہے کہ معاذ اللہ خدا کی ذات سے کوئی شے جدا ہو کر انسان کے اندر منتقل ہو گئی ہو۔ اور حضرت آدم کی تخلیق کے بارے میں فرماتا ہے (نُفِثَ فِيهِ مِنْ رُوحِي^۲) اسی طرح دوسری آیتوں سے استناد ہوتا ہے کہ روح بدن اور اس کی خاصیتوں سے علیحدہ ایک دوسری شے ہے جو بقا کی صلاحیت رکھتی ہے باہم ان کافروں کے قول کو ذکر کرنے کے بعد کہتے تھے۔ (عِذَا ضَلَلْنَا فِي الْأَرْضِ أَذِنَا لِنَفْسِ خَلْقٍ جَدِيدٍ^۳) جس وقت ہم (مر گئے) اور زمین میں گم ہو گئے (اور ہمارے بدن کے اجزاء مٹی میں بکھر گئے) کیا ہم دوبارہ پیدا کئے جائیں گے۔ اس طرح جواب دے رہا ہے (قُلْ يَتُوبُ قُلُومُ الْمَوْتِ^۴) اَنْدِي وَكُلُّ بَلَمٍّ اِلٰی رَبِّكُمْ تُرْجَعُونَ^۵) کدو (تم گم نہیں ہو گے) وہ موت کا فرشتہ جو تمہارے اوپر تعینات ہے وہ تمہیں وفات دے گا اور پھر اپنے پروردگار کی طرف پلٹا دیئے جاؤ گے پس انسان کی شناخت کا معیار وہی روح ہے کہ جو موت کے فرشتے کے ذریعے

^۱ آموزش فلسفہ جلد دوم در س نمبر ۴۴ اور ۹۴ کی طرف رجوع کریں

^۲ اصول کافی۔ ج ۱، ص ۱۳۴،

^۳ سجدہ ۹ آیہ

^۴ حجر ۲۹، ص ۷۲

^۵ سجدہ ۱۰ - آیت ۱۰

^۶ سجدہ آیت ۱۱

قبض کی جاتی ہے، اور ہمیشہ محفوظ رہتی ہے نہ کہ وہ اجزاء بدن جو زمین میں بکھر جاتے ہیں اور ختم ہو جاتے ہیں اور ایک دوسرے مقام پر ارشاد فرماتا ہے۔ (اللہ یُوفِی الْاَنْفُسَ حَیْنَ مَوْتِہَا وَالتِّیْ لَمْ تَمُتْ فِی مَنْہَا فِیْکَ التِّیْ قَضٰی عَلَیْہَا الْمَوْتُ، وَیُرْسِلُ الْاٰخِرٰی اِلٰی اَجَلٍ مُّسَمًّی^۱) اللہ ہی ہے جو روحوں کو (یا اشخاص) کو موت کے وقت اپنی طرف بلا لیتا ہے اور جو نہیں مرتے ہیں ان کی روحوں کو بھی نیند کے وقت طلب کر لیتا ہے (یعنی وہ جو سو گیا ہے اس کی موت کا وقت نہیں آیا)۔ اور پھر جس کی موت کا فیصلہ کر لیتا ہے اس کی روح کو روک لیتا ہے اور دوسری روحوں کو ایک مقررہ مدت کے لئے آزاد کر دیتا ہے۔

اور سمگا روں کی موت کی کیفیت کے بارے میں ارشاد فرماتا ہے۔ (اِذَا النَّفْسُ فِیْ غَرَائِطِ الْمَلَائِکَۃِ کَلَّمَتْ بَاسْطُوْا اَیْدِیْہُمْ اَنْخَرِجُوْا اَنْفُسَکُمْ^۲) اور اگر آپ دیکھتے کہ ظالمین موت کی سختیوں میں ہیں اور ملائکہ اپنے ہاتھ بڑھائے ہوئے آواز دے رہے ہیں کہ اب اپنی جانوں کو نکال دو۔ (تسلیم ہو جاؤ) ان آیات اور اس طرح کی دوسری آیتوں کہ جن کو اختصار کی وجہ سے ہم نے نقل نہیں کیا، استفادہ ہوتا ہے کہ ہر شخص کی نفسیت اور شخصیت اس چیز کے ذریعہ ہے جس کو خدا اور ملک الموت اور روح قبض کرنے والے فرشتے اپنے قبضہ میں لے لیتے ہیں اور بدن کا نابود ہو جانا انسان کی روح اور اس کی حقیقت وحدت کو نقصان نہیں پہنچا سکتا۔

نتیجہ کلام

سب سے پہلے انسان کے اندر ایک شے بنام روح پائی جاتی ہے، دوسرے یہ کہ انسان کی روح بدن سے جدا ہو کر بقا اور استقلال کی صلاحیت رکھتی ہے، نہ کہ مادی صورت اور اعراض کی طرح جو بدن کے ختم ہو جانے سے ختم ہو جائے، تیسرے یہ کہ ہر فرد اور ہر شخص کی شناخت اور اس کا امتیاز اس کی روح سے وابستہ ہے، بلکہ یوں کہا جائے کہ ہر انسان کی حقیقت اس کی روح ہے اور بدن روح کی بہ نسبت ایک وسیلہ کی حیثیت رکھتا ہے۔

^۱ زمر۔ آیت ۴۲،

^۲ انعام۔ آیت ۹۳،

سوالات

- ۱۔ علم حضوری اور علم حصولی کی تعریف کرتے ہوئے ان کے مابین فرق کو واضح کیجئے؟
- ۲۔ روح کے غیر محسوس ہونے کو عقلی دلیلوں سے واضح کیجئے؟
- ۳۔ روح کے غیر محسوس (مجرد) ہونے پر دوسری کون سی دلیلوں سے استفادہ کیا جاسکتا ہے؟
- ۴۔ اس بحث و گفتگو سے مربوط آیات کو ذکر کیجئے؟
- ۵۔ ان آیتوں سے کیا نتیجہ نکلتا ہے؟

چوالیسواں درس

قیامت کا اثبات

مقدمہ

جیسا کہ ہم نے اس کتاب کے شروع ہی میں اس بات کی طرف اشارہ کیا تھا، کہ قیامت اور آخرت میں انسان کے ہر فرد کے زندہ ہونے پر اعتقاد رکھنا تمام آسمانی ادیان کا بنیادی ترین عقیدہ ہے، اور انبیاء الہی علیہم السلام نے بھی اس اصل پر تاکید فرمائی ہے، اور لوگوں کے دلوں میں اس عقیدہ کو ثابت اور راسخ کرنے کے لئے بے انتہا زحمات برداشت کی ہیں، اور قرآن مجید میں قیامت اور عدل پر عقیدہ رکھنے کو خدا کی توحید پر عقیدہ رکھنے کے برابر جانا گیا ہے، اور تقریباً بیس سے زیادہ مقامات پر کلمہ (اللہ) اور (وا لے یوم الآخر) کو ایک ساتھ استعمال کیا گیا ہے، اگرچہ دو ہزار سے زیادہ آیات میں آخرت سے متعلق بحث کی گئی ہے۔ اس جز کی ابتدا میں ہم نے عاقبت شناسی کے بارے میں تحقیق کی اہمیت پر حتی المقدور روشنی ڈال چکے ہیں، اور یہ بھی واضح کر دیا ہے کہ قیامت کا صحیح تصور اس روح کو قبول کرنے پر موقوف ہے جو ہر انسان کی شناخت کا معیار ہے اور اس کا وجود موت کے بعد بھی باقی رہے گا تاکہ یہ کہا جاسکے کہ وہی شخص جو اس دنیا سے گیا ہے دوبارہ قیامت اور آخرت میں زندہ کیا جائے گا پھر اس کے بعد عقل و وحی کے ذریعہ اس روح کو ثابت کیا گیا ہے تاکہ انسان کی ابدی زندگی کے بارے میں گفتگو کا راستہ ہموار ہو جائے اب وہ وقت آگیا ہے کہ ہم اس اہم اعتقادی اصل کو ثابت کرنے کی کوشش کریں۔

جس طرح مسئلہ روح کو دو طریقوں عقل و نقل (آیات و روایات) کے ذریعہ ثابت کیا گیا ہے، اسی طرح اس مسئلہ کو بھی انہیں دونوں طریقوں سے ثابت کریں گے، ہم سب سے پہلے قیامت کی ضرورت پر دو عقلی دلیلیں پیش کریں گے اور اس کے بعد بعض قرآنی ارشادات کو ضرورت اور امکان معاد کے سلسلے میں پیش کریں گے۔

برہان حکمت

خدا شناسی کے باب میں وضاحت کی تھی کہ خدا کی خلقت بیکار اور بے مقصد نہیں ہے بلکہ خیر و کمال سے محبت کہ جو خدا کی عین ذات ہے بالاصلاتہ اور اس کے آثار میں بالتبع کہ جس میں خیر و کمال کے بعض مراتب پائے جاتے ہیں متعلق ہوتی ہے، اسی لئے دنیا کو اس طرح پیدا کیا ہے کہ زیادہ سے زیادہ خیر و کمال کا کسب کرنا اس پر مبنی ہو، اور اس طرح سے ہم نے حکمت کی صفت کو ثابت کیا، کہ اس کا تقاضہ یہ ہے کہ مخلوقات کو ان کے مناسب کمال اور مقصد تک پہنچایا جاسکے، لیکن چونکہ مادی دنیا مزامتوں اور ٹکراؤ کا مقام ہے، مادی موجودات کے خیر و کمالات ایک دوسرے کے معارض میں لہذا خدا کی حکیمانہ تدبیر کا تقاضہ یہ ہے کہ اس کو اس انداز سے مرتب اور منظم کرے کہ مجموعی اعتبار سے زیادہ سے زیادہ خیرات اور کمالات اس پر مرتب ہوں، بلکہ دوسرے الفاظ میں یوں کہا جاسکتا ہے کہ اس دنیا میں بہترین نظام پایا جائے، اسی وجہ سے مختلف قسم کے عناصر اور ان کی مقدار و کیفیت، فعل و انفعالات نیز اس کی حرکات و سکونات اس طرح منظم اور مرتب ہیں کہ سبزیوں اور درختوں اور آخر میں اس دنیا کی سب سے کامل ترین مخلوق یعنی انسان کی خلقت کا زیادہ سے زیادہ موقع فراہم ہو جائے، اور اگر یہ مادی دنیا اس طرح پیدا کی گئی ہو تو کہ موجودات زندہ کی پیدائش اور اس کے رشد کو ناممکن بنا دیتی، تو یہ

حکمت کے خلاف کام ہوتا

اب ہم مزید اضافہ کرتے ہیں اس بات کے مد نظر کہ انسان کے اندر قابل بقا روح پائی جاتی ہے، اور وہ ابدی و جاودانی کمالات کو حاصل کر سکتا ہے وہ بھی ایسے کمالات جس کا تقابل مادی کمالات سے نہیں کیا جاسکتا، اگر اس کی حیات اس دنیوی زندگی پر منحصر ہو جائے تو حکمت الہی کے ساتھ سازگار نہیں ہو سکتی، خاص طور سے اس بات کے پیش نظر کہ دنیاوی حیات بے ثمر رنج و مصیبت اور سختیوں و پریشانیوں کے ہمراہ ہوتی ہے اور غالباً کوئی بھی لذت بغیر رنج و مصیبت اور زحمت کے حاصل نہیں ہوتی، اس طرح حساب لگانے والے افراد اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ محدود لذتوں کو حاصل کرنے کے لئے ان سب زحمتوں اور پریشانیوں کا برداشت کرنا

مفید نہیں ہے، اور انہیں محاسبات کے ذریعہ بیکاری اور بے مقصد زندگی کی طرف رجحان پیدا ہوتا ہے یہاں تک بعض لوگ زندگی سے شدید محبت رکھنے کے باوجود خود کشی کی منزل تک پہنچ جاتے ہیں درحقیقت اگر انسان کی زندگی اس کے علاوہ نہ ہوتی کہ مسلسل زحمات برداشت کرے، اور طبعی و اجتماعی مشکلات سے ہمیشہ دست و گریباں رہے تاکہ چند لمحہ لذت و خوشی کے ساتھ گزارے، اور اس وقت خستگی اور تھکاوٹ کے باعث سو جائے تاکہ جس وقت اس کا جسم دوبارہ محنت کرنے اور کام کے لئے آمادہ ہو جائے (نیادن اور نئی روزی) تو پھر دوبارہ سعی و کوشش کرے مثلاً ایک لقمہ روٹی حاصل کر لے اور اسے کھانے کے ذریعہ ایک لمحہ کی لذت محسوس کرے اور اس کے علاوہ کچھ نہیں! ایسا تکلیف دہ اور رنج و ملال آور تسلسل کو عقل ہرگز پسند نہیں کرتی، اور نہ تو اس کے انتخاب کا حکم (قوی) دیتی ہے، ایسی زندگی کی بہترین مثال یہ ہے کہ ایک ڈرائیور اپنی کار کو پٹرول پمپ تک جائے اور پٹرول کی ٹینکی کو بھرنے کے بعد اس پٹرول کو دوسرے پٹرول پمپ تک لیجانے میں صرف کر دے، اور اس کام کو برابر انجام دیتا رہے یہاں تک کہ اس کی کار پرانی و بوسیدہ ہو جائے اور کام کرنا چھوڑ دے یا کسی اکیڈنٹ یا دوسرے موانع کی وجہ سے تباہ ہو جائے۔

ظاہر ہے کہ انسان کی زندگی کے متعلق ایسا نظریہ رکھنا بے مقصد بے ہدف ہونے کے سوا کچھ نہیں ہے۔ دوسری طرف انسان کی معم اور بنیادی خواہشات میں سے ایک بقا اور جاوید انگلی ہے کہ جسے خدا ووند عالم نے اس کی فطرت میں قرار دیا ہے اور ایک ایسے محرک اور قوت کے حکم میں ہے جو اسے ابدیت کی طرف لے جاتا ہے اور مسلسل اس کی رفتار میں اضافہ کرتا رہتا ہے ایسے موقع پر اگر یہ فرض کیا جائے کہ ایسے محرک اور تیز رفتار سی سے چلنے والے کا انجام سوائے اس کے کچھ نہیں ہے کہ وہ اپنی رفتار کی سرعت کی اتہا پر ایک مضبوط پتھر سے ٹکرا جائے اور پاش پاش ہو کر ختم ہو جائے آیا ایسے انجام اور مقصد کے پیش نظر قوت و سرعت و رفتار میں اضافہ کرنا مناسب ہوگا؟ لہذا ایسا فطری رجحان اس وقت حکمت الہی کے ساتھ سازگار ہوگا کہ جب اس فانی اور موت سے محکوم دنیا کے علاوہ کوئی اور زندگی پائی جائے۔ حاصل کلام یہ ہے کہ اپنی انہیں دو تمہیدوں کے بعد یعنی

حکمت اور انسان کے لئے ابدی زندگی کے امکان سے ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ اس محدود دنیاوی زندگی کے بعد ایک دوسری زندگی انسان کے لئے ہونی چاہیے تاکہ حکمت الہی کی مخالفت نہ ہو۔ اور جاودانی زندگی کی طرف رجحان کو ایک دوسرا مقدمہ قرار دیا جاسکتا ہے اور اس میں حکمت الہی کو ضمیمہ کر کے ایک دوسری دلیل بنا کر پیش کی جاسکتی ہے۔ اسی کے ضمن میں یہ بات بھی روشن ہو گئی ہے کہ انسان کی ابدی زندگی میں ایک دوسرا نظام ہونا چاہیئے کہ جس میں دنیاوی حیات کی طرح رنج و مصیبت نہ پائی جائے ورنہ یہی دنیاوی زندگی اگر ہمیشہ کے لئے ممکن ہو جاتی، تب بھی حکمت خدا کے ساتھ سازگار نہ ہوتی۔

برہان عدالت

اس دنیا میں سارے انسان اچھے اور بڑے عمل کو انجام دینے میں آزاد ہیں ایک طرف تو وہ لوگ ہیں جو اپنی پوری زندگی خدا کی عبادت اور بندگانِ خدا کی خدمت میں گزار دیتے ہیں، اور دوسری طرف ایسے ایسے گنہگار اور بدکردار افراد نظر آتے ہیں جو اپنی شیطانی خواہشات تک پہنچنے کے لئے بڑے سے بڑا ظلم اور بد سے بدتر گناہ کا ارتکاب کرتے ہیں اور بنیادی طور سے اس دنیا میں انسان کی خلقت کا مقصد اور اس کو مختلف مقنا درجانات اور ارادہ و انتخاب سے اور مختلف عقلی و نقلی شناختوں سے مالا مال کر دینے اور اس کی مختلف رفتار و کردار کے لئے موقع فراہم کرنے اور حق و باطل اور خیر و شر کے دو، راہ پر لا کر کھڑا کر دینے کا مقصد و ہدف یہ ہے کہ انسان بے شمار امتحانات اور آزمائشوں سے گزرے، اور اپنے کمال کی راہ کو اپنے ارادہ و اختیار کے ذریعہ انتخاب کرے، تاکہ اپنے اختیاری اعمال کی جزایا سزا پاسکے اور درحقیقت انسان کے لئے اس دنیا کی پوری پوری زندگی صرف امتحانات اور آزمائشیں اور اپنی شخصیت کو بنانا ہے یہاں تک کہ یہ انسان اپنی عمر کے آخری لمحے تک ان آزمائشات اور امتحانات اور تکلیف کے انجام دینے سے معذور نہیں ہے۔ لیکن ہم یہ دیکھتے ہیں کہ خدا کے نیک بندے اور گنہگار و ظالم اس دنیا میں اپنے کئے کی جزایا سزا نہیں پاتے اور بسا اوقات دیکھتے ہیں گنہگار لوگ زیادہ نعمتوں سے سرفراز ہیں اور خوشحال زندگی بسر کر رہے ہیں، اور بنیادی اعتبار سے اس دنیاوی زندگی میں بہت سے ایسے اعمال ہیں جنکی جزایا سزا کی گنجائش نہیں، مثلاً وہ

شخص جس نے ہزاروں بے گناہ انسان کو قتل کر دیا ہو اسکو ایک بار سے زیادہ قصاص نہیں کیا جاسکتا اور باقی تمام جرائم و فسادات اور سارے ظلم بغیر سزا کے رہ جائیں گے، حالانکہ عدل پروردگار کا تقاضہ یہ ہے کہ اگر کسی نے چھوٹے سے چھوٹا بھی اچھا یا برا کام کیا ہے تو اس کو اس کا نتیجہ ملنا چاہیے۔ پس جیسا کہ یہ دنیا آزمائش اور امتحان کا مقام ہے ویسے ایک دوسرا مقام ہونا چاہیے جہاں جزا اور سزا ملے اور انسان کے اعمال کا نتیجہ سامنے آئے اور ہر فرد اپنے مناسب مقامات تک پہنچ جائے، تاکہ خدا کی عدالت عینی طور سے محقق ہو جائے۔ اسی بیان کے ذیل میں یہ بھی واضح ہوتا ہے آخرت، انتخاب راہ اور تکلیف کو انجام دینے کی جگہ نہیں ہے، آئندہ انشاء اللہ اس سے بھی مفصل بحث کریں گے۔

سوالات

۱۔ حکمت الہی کا نظام احسن سے کیا رابطہ ہے؟ شرح کیجئے؟

۲۔ برہان حکمت کو دو تقریروں کے ذریعہ بیان کیجئے؟

۳۔ اس برہان سے اصل قیامت کے اثبات کے علاوہ اور کون سا دوسرا نکتہ سمجھ میں آتا ہے؟

۴۔ اس دنیا میں انسان کی خلقت کے مقصد کی وضاحت کیجئے؟

۵۔ برہان عدالت کو تفصیل کے ساتھ بیان کیجئے؟

۶۔ اس برہان سے کون سا خاص نکتہ حاصل ہوتا ہے؟

بینتالیسواں درس

قرآن میں قیامت کا تذکرہ

مقدمہ

قرآن مجید میں قیامت کو ثابت کرنے یا منکرین قیامت سے احتجاج کرنے کے متعلق جو آیتیں موجود ہیں، ان کو پانچ حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ ۱۔ وہ آیتیں جو اس بات کی طرف اشارہ کرتی ہیں کہ منکرین قیامت کے پاس قیامت کے انکار کے اوپر کوئی دلیل نہیں ہے یعنی ان کے پاس انکار قیامت کے لئے کوئی دلیل موجود نہیں ہے۔

۲۔ وہ آیات کریمہ جو قیامت کے مانند رونما ہونے والے دوسرے حوادث کی طرف اشارہ کرتی ہیں تاکہ لوگوں کو یہ معلوم ہو جائے کہ قیامت کا واقع ہونا بعید از قیاس نہیں ہے

۳۔ وہ آیات جو قیامت کے منکرین کے شبہات کو رد اور اس کے واقع ہونے کو ثابت کرتی ہیں۔

۴۔ وہ آیتیں جو اس بات کی طرف اشارہ کرتی ہیں کہ قیامت خدا کا ایک حکم تھی اور سچا وعدہ ہے جس میں تبدیلی نہیں آسکتی، اور درحقیقت قیامت کے برپا ہونے کو سچے خبر دینے والے کی خبر کے ذریعہ ثابت کرتی ہیں۔

۵۔ وہ آیات شریفہ جو قیامت کی ضرورت پر عقلی دلیلوں کی طرف اشارہ کرتی ہیں، درحقیقت آیات کریمہ کے ابتدائی تین گروہ امکان وقوع قیامت سے متعلق ہیں اور دوسرے دو گروہ قیامت کی ضرورت سے متعلق ہیں۔

قیامت کا انکار بے دلیل: قرآن مجید نے باطل عقائد رکھنے والوں کے مقابل میں احتجاج کی جو روش اپنائی ہے وہ یہ ہے کہ ان سے دلیل کا مطالبہ کیا ہے تاکہ یہ ظاہر اور واضح ہو جائے کہ ان کے فاسد اور باطل عقائد عقل و منطق کی بنیاد پر نہیں ہیں، چنانچہ کئی آیتوں

میں یہ ارشاد ہوتا ہے کہ۔ (قُلْ حَاطُوا بِرُحَالِكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ^۱) اے پیغمبر! ان سے کہہ دیجئے کہ اگر تم سچے ہو تو دلیل لے کر آؤ اور اسی کے مانند دوسرے مقامات پر بھی اسی لب و لہجہ میں ارشاد ہوا کہ ایسے غلط عقیدہ رکھنے والے کسی واقعی اور دلیل کے ذریعہ ثابت چیز پر عقیدہ نہیں رکھتے بلکہ بے دلیل و گمان اور غیر واقعی خیالات پر ہی اتکا کرتے ہیں^۲ منکرین قیامت کے متعلق فرماتا ہے۔ (وَقَالُوا مَا هِيَ اِلَّا حَيَاتُنَا اَلْدُّنْيَا نَمُوتُ وَنَحْيٰی وَمَا نُنْزِلُ اِلَّا اَلذِّكْرُ وَمَا لَنُمُتُّ بِذٰلِكَ مِنْ عِلْمٍ اِنْ هُمْ اِلَّا اَعْمٰیۓ قٰتِلُوۡنَ^۳) اور یہ لوگ کہتے ہیں کہ یہ صرف زندگانی دنیا ہے اسی میں مرتے ہیں اور جیتے ہیں اور زمانہ ہی ہم کو ہلاک کر دیتا ہے اور انہیں اس بات کا کوئی علم نہیں ہے کہ یہ صرف ان کے خیالات ہیں اور بس۔

اور اسی طرح دوسری آیات شریفہ میں بھی اسی نکتہ کی طرف اشارہ ہوا ہے کہ قیامت کا انکار صرف وہم و گمان اور بغیر کسی دلیل و برہان کے ہے اگرچہ ممکن ہے کہ اگر یہ بے دلیل مدعی خواہشات اور ہوا پرستی کا پیش خیمہ بن جائے تو ہوا پرست افراد سے قبول کر لیں گے؛ لیکن آہستہ آہستہ (تدریجاً) یہ مدعی ارتکاب گناہ کی وجہ سے اعتقاد اور یقین کی صورت اپنا لے گا حتیٰ کہ لوگ اپنے اس موهوم عقیدہ پر ہٹ دھرمی (سخت پابندی) سے کام لینے لگیں گے۔

قرآن مجید نے قیامت کا انکار کرنے والوں کے قول کو نقل کیا ہے جو نہایت بعید اور اگر ان لوگوں نے کوئی شبہ بھی کیا تو وہ بھی نہایت ہی ضعیف اور سست اور بے اہمیت ہے اب ایسی صورت میں ایک طرف تو پروردگار قیامت سے مشابہ حوادث کا ذکر کرتا ہے تاکہ وقوع قیامت کے بعید ہونے کا تصور دور ہو جائے^۴ اور دوسری طرف ان شبہات کے جوابات کی طرف اشارہ

^۱ بقرہ۔ آیت ۱۱۱، انبیاء۔ آیت ۲۴، نمل۔ آیت ۶۴

^۲ مومنون۔ ۱۱۷، نساء۔ ۱۵۷، انعام۔ ۱۰۰، ۱۱۹، ۱۴۸، کہف۔ ۵، حج۔ ۳، ۸، ۷۱، عنکبوت۔ ۸، روم۔ ۲۹، لقمان۔ ۲۰، غافر۔ ۴۲، زخرف۔ ۲۰، نجم۔ ۲۸،

^۳ چاثیہ۔ ۲۴، ۴۔

^۴ قصص۔ ۳۹، کہف۔ ۳۶، ص۔ ۲۷، چاثیہ۔ ۳۲، انشقاق۔ ۱۴،

^۵ قیامت۔ ۵

^۶ روم۔ آیت ۱۰، مطفین۔ ۱۰-۱۴،

^۷ نحل۔ آیت ۳۸

^۸ ن ہود۔ آیت ۷، اسراء۔ آیت ۵۱، صافات۔ آیت ۱۶، ۵۳، دخان۔ آیت ۳۴، احقاف۔ آیت ۱۸

^۹ وہ امور جو ایک دوسرے کے مانند ہیں حکم واحد کا درجہ رکھتے ہیں خواہ امکان کا حکم ہو یا عدم امکان کا حکم (حکم الا مثال فی ما یجوز و ما لا یجوز واحد)

ہ کر رہا ہے تاکہ اس سلسلے میں کوئی شک و شبہ باقی نہ رہ جائے اور قیامت کا آنا ثابت ہو جائے لیکن صرف اسی پر اکتفا نہیں کیا اور اس وعدہ خدا کے حتمی اور ضروری ہونے اور وحی کے ذریعہ لوگوں پر حجت تمام کرنے کے ساتھ ساتھ قیامت کی ضرورت پر عقلی دلیلوں کی طرف بھی اشارہ کیا ہے جیسا کہ آئندہ دروسوں میں بیان کیا جائے گا۔

قیامت کے ماند دوسرے حوادث

(الف) بہزوں کا اگنا۔ مرنے کے بعد انسان کا دوبارہ زندہ ہونا اس، حیات مابعد الموت کے مانند ہے اور اس کی مثال بہزہ اگنے کی طرح ہے جس طرح زمین میں بہزہ خشک ہو جانے کے بعد دوبارہ اگتا ہے اسی طرح انسان مرنے کے بعد زندہ ہوگا، اگر انسان روزمرہ وقوع میں آنے والے واقعات کو پیش نظر رکھے اور اس میں غور و فکر کرے، تو یہ اس کے لئے اپنی موت کے بعد دوبارہ حیات کو سمجھنے کے لئے کافی ہیں اور چونکہ انسان روزمرہ کی ان تمام چیزوں کو دیکھنے کا عادی ہو چکا ہے، لہذا ایسے مناظر کو وہ کوئی خاص اہمیت نہیں دیتا، اور بہت ہی آسان اور سادہ سمجھتا ہے ورنہ پیدائش کے لحاظ سے سوکھی ہوئی گھاس کے دوبارہ بہزہ ہونے اور انسان کے مرنے کے بعد دوبارہ زندہ ہونے میں کوئی فرق نہیں ہے۔

قرآن مجید نے اس عادت کو ختم کرنے کے لئے متعدد مرتبہ لوگوں کی توجہ مبذول کرائی ہے انسان کے دوبارہ زندہ ہونے کو اس سے تشبیہ دی ہے اور ارشاد فرماتا ہے (فَانْظُرْ اِلَى اَثَارِ رَحْمَةِ اللّٰهِ كَيْفَ يُحْيِي الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا اِنَّ ذٰلِكَ لَخُبْرٌ لِّمَنْ عَلِيَ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ^۱) پس رحمت خدا کے آثار کو غور سے دیکھو کہ کیسے زمین کو مردہ ہونے کے بعد زندہ کرتا ہے بیشک (وہی زمین کا زندہ کرنے والا) مردوں کو دوبارہ زندہ کرتا ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے

^۱ اعراف، ۵۷، حج، ۶۰-۵، روم، ۱۹، فاطر، ۹، فصلت، ۱۹، زخرف، ۱۱، ق، ۱۱،
^۲ روم، ۵۰

(ب) اصحاب کھف کا سونا۔ قرآن مجید اصحاب کھف کی عجیب و غریب داستان کو بیان کرنے کے بعد ارشاد فرماتا ہے۔
 (وَكُنْزُكَ أَغْشَرْنَا عَلَيْنِمْ لِيَعْلَمُوا أَن وَعْدَ اللَّهِ حَقٌّ وَأَنَّ السَّاعَةَ لَا رَيْبَ فِيهَا^۱) اور اس طرح ہم نے قوم کو ان کے (اصحاب کھف) حالات پر مطلع کر دیا، تاکہ انہیں معلوم ہو جائے کہ اللہ کا وعدہ سچا ہے اور قیامت آئے گی، اس میں کسی طرح کا شک و شبہ نہیں ہے۔ حقیقتاً ایسا عجیب و غریب حادثہ کہ چند افراد صدیوں (شمسی اعتبار سے تین سو سال اور قمری لحاظ سے تین سو نو سال، سو تے رہیں، اور اس کے بعد بیدار ہو جائیں۔

انسان کو قیامت کی طرف متوجہ کرنے اور یہ واضح کرنے کے لئے کہ قیامت کا وقوع قریب قیاس ہے اور بعید نہیں ہے نہایت موثر اور کامیاب ہے کیونکہ انسان کا سونا موت کے مثل ہے (النوم اخ الموت) (سونا موت کا بھائی ہے) اور جاگنا اسی کی حیات کے مانند ہے جو موت کے بعد حاصل ہو، لیکن نیند کے عالم میں یا سونے کی حالت میں عموماً انسان کا جسم اپنے فطری اور طبعی حالت (زندگی کے آثار کے ساتھ بیولوجیک) پر برقرار رہتا ہے اور روح کا جسم میں واپس آنا کوئی تعجب خیز بات نہیں ہے لیکن اگر یہی جسم تین سو سال سوتا رہے اور وہ بھی بغیر آب و دانہ کے تو ایسی صورت میں بدن کے فطری نظام میں خلل پڑ جانا چاہیے اور اس جسم کو تباہ و برباد ہو جانا چاہیے اور روح کو دوبارہ اس میں آنے کی صلاحیت کھودینا چاہیے۔

لیکن یہ غیر معمولی معجزہ الہی انسان کی فکر کو اس معمولی نظام کے پس پردہ دوسری حقیقت کی طرف متوجہ کرتا ہے جس کا مضمون یہ ہے کہ روح کا جسم میں دوبارہ پلٹ کر آنا، ہمیشہ عادی اور معمولی اسباب و شرائط کے ہونے یا نہ ہونے کا محتاج نہیں ہے لہذا انسان کی دوسری زندگی بھی اگرچہ اس طبعی اور فطری نظام کے خلاف ہی کیوں نہ ہو کوئی مانعت نہیں رکھتی وعدہ پروردگار کے مطابق محقق ہو کر رہے گی۔

(ج) حیوانات کا زندہ ہونا۔ اسی طرح قرآن کریم غیر عادی طریقہ سے زندہ ہونے والے چند حیوانوں کی طرف بھی اشارہ کر رہا ہے جن میں سے وہ چار پرندے ہیں جو حضرت ابراہیمؑ کے ہاتھوں زندہ ہوئے تھے دوسرے وہ (گدھا جس پر جناب عزیر سوار ہوتے تھے) اس کے بھی دوبارہ زندہ ہونے کی طرف قرآن نے اشارہ کیا ہے اور جب حیوان کا زندہ ہونا ممکن ہے تو انسان کا زندہ ہونا بھی ناممکن نہیں ہوگا

(د) اسی دنیا میں بعض انسانوں کا زندہ ہونا۔ سب سے زیادہ محمبات یہ ہے کہ بعض افراد اسی دنیا میں دوبارہ زیور حیات سے آراستہ ہوئے ہیں کہ جس کے چند نمونے خود قرآن مجید نے بیان فرمائے ہیں، انہیں افراد میں سے ایک بنی اسرائیل کے نبی ہیں جو ایک سفر کے دوران ایک ایسے قریے سے گزرے، جہاں کے لوگ ہلاک اور نابود ہو چکے تھے، اور ان کے آثار فنا ہو چکے تھے جب آپ کی نظر ان افراد پر پڑی تو بے ساختہ ذہن میں یہ خیال پیدا ہوا کہ یہ افراد دوبارہ کیوں کر زندہ ہو سکتے ہیں؟

اسی اثنا میں پروردگار نے ان کی روح قبض کر لی، اور پورے سو سال کے بعد دوبارہ زندہ کیا، اور ان سے سوال کیا کہ تم اس مقام پر کتنا سوئے ہو؟ وہ جو کہ گویا ابھی سو کر جاگے تھے بولے ایک روز، یا اس سے بھی کچھ کم، خطاب ہوا نہیں بلکہ تم کو یہاں پر سو سال ہو گئے دیکھو ایک طرف تمہارا آب و دانہ بالکل صحیح و سالم ہے لیکن دوسری طرف تمہارے گدھے کا کیا حال ہے جس کی ہڈیاں بکھری ہوئی ہیں! اب صرف یہ دیکھو کہ ہم کیسے ان ہڈیوں کو آپس میں جوڑتے ہیں اور اس پر گوشت چڑھاتے ہیں اور اسے دوبارہ زندہ کر دیتے ہیں!^۱

دوسرا واقعہ: بنی اسرائیل کا وہ گروہ جس نے حضرت موسیٰؑ سے کہا کہ جب تک ہم خدا کو اپنی آنکھوں سے نہ دیکھ لیں گے، ہرگز ایمان نہیں لائیں گے، لہذا خدا نے انہیں آسمان سے ایک بجلی گرا کر ہلاک کر دیا لیکن پھر حضرت موسیٰؑ کی درخواست پر خدا نے

^۱ بقرہ۔ آیت ۲۶۰

^۲ بقرہ۔ آیت ۲۵۹

انہیں دوبارہ زندہ کر دیا۔ ایک اور واقعہ بنی اسرائیل کا ایک شخص حضرت موسیٰ کے زمانے میں قتل کر دیا گیا تھا اور فوج کی ہوئی گائے کے ایک حصے کو اس سے من لیا گیا اور وہ زندہ ہو گیا اس کی تفصیل سورہ بقرہ میں موجود ہے نیز اس سورہ مبارکہ کی وجہ تسمیہ بھی یہی ہے پھر ارشاد ہوا۔ (كَذٰلِكَ يُخَيِّبُ اللّٰهُ الْمُؤْمِنِيْنَ وَيُرِيْكَمۡ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ)^۱ اسی طرح خدا مردوں کو زندہ کرتا ہے اور اس کی نشانیوں کو تمہارے سامنے رکھتا ہے تاکہ شاید تمہیں کچھ عقل آجائے۔ اور اسی طرح حضرت عیسیٰ کے معجزے کے ذریعہ^۲ بعض مردوں کا زندہ ہونا یہ وہ نمونے ہیں جن کو قیامت کے وقوع کے امکان کے سلسلے میں پیش کیا جاسکتا ہے۔

سوالات

- ۱۔ قرآن قیامت کا انکار کرنے والوں کے ساتھ کس طرح پیش آتا ہے؟ بیان کیجئے؟
- ۲۔ سبزہ کا اگنا انسان کے دوبارہ قیامت میں زندہ ہونے سے کیا شبابہت رکھتا ہے؟ اس سے متعلق قرآن کا کیا بیان ہے؟
- ۳۔ اصحاب کف کی داستان سے قیامت سے متعلق کون سا نکتہ سمجھ میں آتا ہے؟
- ۴۔ حضرت ابراہیم کے ہاتھوں پرندوں کے زندہ ہونے کو بیان کرتے ہوئے قیامت کے موضوع سے اس کے رابطہ کو بیان کیجئے؟ اور شرح پیش کیجئے؟
- ۵۔ قرآن مجید میں زندہ ہونے والے میں کن لوگوں کا ذکر موجود ہے؟

^۱ سورہ بقرہ۔ آیت ۵۵، ۵۶

^۲ سورہ بقرہ۔ آیت ۶۷، ۷۳

^۳ آل عمران۔ آیت ۴۹، مائدہ۔ آیت ۱۱۰

چھیالیسواں درس

منکرین کے ثہات کے لئے قرآن کا جواب فنا ہونے کے بعد دوبارہ پلٹنے کا شب

منکرین قیامت کے مقابلہ میں قرآن کریم نے جو احتجاج کیا ہے اور جو جوابات دئے ہیں ان کے لب و لہجہ سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ قیامت کے انکار کرنے والوں کے ذہن میں پہلے سے یہ سارے ثہات پائے جاتے تھے جس کو ہم جوابات کی مناسبت سے اس طرح ترتیب دیتے ہیں۔ ۱۔ فنا ہونے کے بعد دوبارہ پلٹنے کا شبہ۔ اس سے پہلے اس بات کی طرف اشارہ کر چکے ہیں کہ قرآن کریم ان لوگوں کے مقابلہ میں جو یہ کہتے تھے کہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے کہ انسان مرنے کے بعد درحالیکہ اس کا جسم پاش پاش ہو کر نابود ہو گیا ہے وہ دوبارہ زندہ ہو جائے؟ جواب دیتا ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ تمہارے وجود کی شناخت تمہاری روح کے ذریعہ ہے نہ کہ تمہارے بدن کے اعضا و جوارح کے ذریعہ جو زمین میں بکھر جاتے ہیں۔

اس گفتگو سے اس بات کا استفادہ ہوتا ہے کہ کافروں کے انکار کا سرچشمہ اور اس کا سبب فلسفہ کا وہی شبہ ہے جیسے ”اعادۃ معدوم محال“ (فنا ہو جانے والی شئی کا پلٹنا محال ہے) کے نام سے یاد کیا جاتا ہے یعنی ان لوگوں کا گمان تھا کہ انسان اسی مادی جسم کو کہتے ہیں جو مرنے کے بعد نابود اور فنا ہو جاتا ہے لہذا اگر دوبارہ زندہ ہو گا تو وہ کوئی دوسرا شخص ہو گا، کیونکہ اُس موجود کا پلٹنا جو معدوم (نابود، ختم ہو چکا ہو) ذاتاً ممکن نہیں ہے، اس شبہ کا جواب قرآن کریم کے بیان سے واضح ہو جاتا ہے اور وہ یہ ہے کہ ہر انسان کی اپنی پہچان اور اُس کی شخصیت اس کی روح سے وابستہ ہے بلکہ یوں کہا جائے کہ معاد و قیامت، اعادۃ معدوم (فناشی کا پلٹنا) نہیں ہے بلکہ اُس موجود کی روح کی بازگشت کا نام ہے۔

خدا مردوں کو دوبارہ زندہ بھی کر سکتا ہے کیونکہ وہ ہر چیز پر قادر ہے اس کے علاوہ دوبارہ زندہ کرنا پہلی بار پیدا کرنے سے زیادہ سخت بھی نہیں ہے کہ جس میں زیادہ قدرت کی ضرورت پڑے بلکہ یہ کہا جاسکتا ہے پہلی خلقت سے آسان ہے کیوں کہ دوبارہ زندہ کرنے میں سوائے روح کے پلٹنے کے اور کچھ نہیں ہے، (فَمَنْ قَوْلُنْ مَنْ عِيدَا قُلِ الذِّیْ فَطَرَکُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ فَمَنْ نُّنْصُوْنِ الْاِیْکَ رَعِ وَنُحْمَ) میں گے کہ کون ہم کو پلٹائے گا (اور دوبارہ زندہ کرے گا) کہدو کہ وہی جس نے تمہیں پہلی بار پیدا کیا ہے بس وہ لوگ تمہارے سامنے سر ہلائیں گے (اور اس جواب پر تعجب کریں گے۔ (وَهُوَ الَّذِیْ یَبْدُءُ الْخَلْقَ ثُمَّ یُعِیْدُہٗ وَهُوَ اَنْھُوْنَ عَلَیْہٖ ۲) اور وہی ایسا ہے جو خلقت اور پیدائش کا آغاز کرتا ہے اور پھر اس کو پلٹا دیتا ہے اور یہ (پلٹانا) اس کے لئے بہت آسان ہے۔

۴۔ فاعل کے علم کے بارے میں شبہ۔ ایک اور شبہ یہ ہے کہ اگر خداوند عالم انسانوں کو زندہ کرے اور ان کو ان کے اعمال کی جزایا سزا دے تو اس کے لئے اسے ضروری ہوگا کہ پہلے وہ بے شمار اجسام کو ایک دوسرے سے الگ کرے تاکہ ہر ایک کی روح کو اسی کے بدن میں داخل کرے، اور دوسری طرف سارے اچھے اور بُرے کاموں کو بھی یاد رکھے تاکہ اسی کے لحاظ سے جزا یا سزا تجویز کرے اور یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے کہ وہ سارے بدن جو مٹی بن چکے ہیں اور اس کے ذرات آپس میں مل گئے ہیں ان کو ایک دوسرے سے جدا کر کے اس کو پہچانے؟ اور کیسے ممکن ہے کہ ہزاروں بلکہ کروڑوں سال تک ہر انسان کے اعمال و رفتار و کردار کا ریکارڈ محفوظ رکھے اور اس کی نظارت کرتا ہے اور پھر ان سب کا فیصلہ کرے؟

یہ شبہ بھی ان لوگوں کی ایجاد و اختراع ہے جنہوں نے خدا کے لامحدود علم کو نہیں پہچانا اور خدا کے علم کو اپنے ناقص اور محدود علم پر قیاس کرتے ہیں اور اس کا جواب یہ ہے کہ خدا کے علم کی کوئی حد اور انتہا نہیں ہے اور اس کا علم ساری چیزوں کو اپنے احاطے میں لئے ہوئے ہے اور خداوند عالم کبھی بھی کسی چیز کو فراموش نہیں کرتا قرآن مجید فرعون کے قول کو اس طرح نقل کر رہا ہے کہ اُس نے حضرت موسیٰ سے کہا۔ (فَاَبَالِ الْاَثْرُوْنَ الْاَوَّلٰی) اگر خدا ہم سب کو زندہ کرے اور ہم سب کا حساب و کتاب

۱ اسراء۔ آیت ۵۱ عنکبوت۔ آیت ۱۹-۲۰، ق۔ آیت ۱۵، واقعہ۔ آیت ۶۲، یس۔ ۸۰ حج۔ ۵، قیامت۔ ۴۰،
۲ روم۔ آیت ۲۷

۱۔ فنا ہونے کے بعد دوبارہ پلٹنا محال ہے، اس شبہ اور اس کا جواب بیان کیجئے؟

۲۔ بدن میں دوبارہ حیات پانے کی قابلیت نہ ہونے کا شبہ اور اس کا جواب تحریر کریں؟

۳۔ فاعل کی قدرت سے متعلق شبہ اور اس کا جواب بیان کریں؟

۴۔ فاعل کے علم سے متعلق شبہ اور اس کا جواب بیان کریں؟

۲۔ تسر۔ آیت ۷۹

سینتالیسواں درس

قیامت کے بارے میں خدا کا وعدہ

مقدمہ

قرآن مجید ایک طرف تو خداوند عالم کی جانب سے اپنے بندوں کے لئے بھیجے گئے پیغام کے عنوان سے قیامت کے وقوع پر تاکید کر رہا ہے اور اس کو ایک حتمی اور خدا کا سچا وعدہ شمار کرتا ہے، جس میں وعدہ خلائی کا امکان نہیں ہے اور اس کے ذریعہ لوگوں پر اپنی حجت تمام کر رہا ہے اور دوسری طرف قیامت کی ضرورت پر عقلی دلائل کی طرف اشارہ کر رہا ہے، تاکہ لوگوں کی عقلی لحاظ سے قیامت کو پہچاننے کی خواہش پوری کرے اور اپنی حجت کو دو گنا کر دے، اس لئے ہم قیامت کے متعلق قرآنی بیانات کو دو حصوں میں تقسیم کر رہے ہیں۔

خدا کا سچا (حتمی) وعدہ: قرآن کریم نے قیامت کے آنے اور عالم آخرت میں تمام انسانوں کے دوبارہ زندہ ہونے کو ایک یقینی اور غیر قابل شک و تردید امر جاننا ہے اور ارشاد فرماتا ہے: (إِنَّ السَّاعَةَ آتِيَةٌ لَا رَيْبَ فِيهَا) ^۱ اور اس کو ایسا سچا وعدہ شمار کیا ہے جس میں خلاف کا تصور نہیں ہو سکتا، اور فرمایا: (بَلَىٰ وَعْدًا عَلَيْنَا) ^۲ اے رسول کہہ دو کہ وہ ضرور ایسا کرے گا اس پر اپنے وعدہ کی وفا لازمی اور ضروری ہے: اور متعدد مرتبہ اس کے واقع ہونے کے سلسلے میں قسمیں کھا چکا ہے جیسا کہ ارشاد ہے (قُلْ بَلَىٰ وَرَبِّي لَتُبْعَثُنَّ ثُمَّ لَتُنَبَّؤُنَّ بِمَا عَمِلْتُمْ وَذَٰلِكَ عَلَى اللَّهِ يَسِيرٌ) ^۳ اے رسول! اللہ تعالیٰ تم کہہ دو کہ ہاں اپنے پروردگار کی قسم تم ضرور اٹھائے جاؤ گے جو کام تم کرتے ہو اس کے بارے میں تم کو ضرور بتایا جائے گا اور یہ کام خدا پر آسان ہے۔ لوگوں کو اس سے ہوشیار اور

^۱ غافر ۵۹، اور رجوع کریں آل عمران ۹، ۲۵، نساء ۸۷، نعام ۱۲، کہف ۲۱، حج ۷، شوریٰ ۷، جاثیہ ۲۶، ۳۲،
^۲ نحل ۳۸، آل عمران ۹، ۱۹۱، نساء ۱۲۲، یونس ۴، ۵۵، کہف ۲۱، انبیاء ۱۰۳، فرقان ۱۶، لقمان ۹، ۳۳، فاطر ۵، زمر
^۳ ۲۰، نجم ۴۷، جاثیہ ۳۲، احقاف ۱۷،
^۴ تغابن ۷، یونس ۵۳، سبا ۳۔

آگاہ کرنا انبیاء کا مهم ترین وظیفہ اور ان کی اہم ذمہ داری جانتے ہوئے ارشاد فرماتا ہے: (يَلْقَى الرُّوحُ مِنْ أَمْرِهِ عَلَى مَنْ يَشَاءُ مِنْ عِبَادِهِ لِيُنْذِرَ يَوْمَ التَّلَاقِ^۱) اپنے حکم سے روح نازل کرتا ہے تاکہ وہ بندوں کو قیامت کے دن سے ڈرائے جس دن وہ لوگ قبروں سے نکل پڑیں گے۔ اور اس کے منکرین کے لئے ابدی بد بختی اور جہنم کا عذاب معین کیا ہے اور فرمایا: (وَأَعْتَدْنَا لِلْكَافِرِينَ مَا كَانُوا يُكَذِّبُونَ^۲) جس شخص نے قیامت کو جھوٹ سمجھا اس لئے ہم نے جہنم کو تیار کر رکھا ہے۔

اس بنا پر جو اس کتاب (قرآن) کی حقانیت تک پہنچ گیا ہے وہ قیامت کے انکار یا اس میں شک کرنے کا کوئی بہانہ نہیں کر سکتا، پہلے حصہ میمہ بات واضح ہو چکی ہے کہ قرآن مجید کی حقانیت ہر حق طلب اور انصاف پسند انسان کے لئے قابل درک و فہم ہے اس وجہ سے کوئی بھی شخص اس کو قبول نہ کرنے کا کوئی عذر پیش نہیں کر سکتا مگر وہ شخص جس کی عقل میں کوئی قصور پایا جاتا ہو یا کسی اور سبب سے اس کی حقانیت کو درک نہ کر سکے۔

عقلی دلائل کی طرف اشارہ

قیامت کی ضرورت پر قرآن مجید کی بہت سی آیتوں میں عقلی استدلال کا لب و لہجہ پایا جاتا ہے کہ جس کو برہان حکمت اور برہان عدالت برناظر مانا جاسکتا ہے جیسا کہ استہمام انکار کی صورت میں ارشاد ہو رہا ہے: (۱) فَخَبِّرْهُمْ أَنَّمَا خَلَقْنَاكُمْ عِبَادًا وَأَكَلْتُم مَّا لَيْنَا لَا تَرْجِعُونَ^۳) کیا تم نے یہ گمان کر لیا ہے کہ ہم نے تمہیں بیکار پیدا کیا ہے اور تم ہماری طرف پلٹائے نہیں جاؤ گے یہ آیہ شریف کھلے انداز میں اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ اگر قیامت اور خدا کی طرف بازگشت نہ ہوتی، تو اس دنیا میں انسان کا پیدا ہونا بیکار اور بے مقصد ہوتا چونکہ پروردگار بیکار اور بے مقصد کام انجام نہیں دیتا، لہذا ماننا پڑے گا کہ اس دنیا کے علاوہ کوئی دوسری جگہ ہے، جہاں اپنی طرف بازگشت کے لئے قائم کرے گا۔ یہ برہان ایک استثنائی قیاس ہے جس کا پہلا مقدمہ ایک قضیہ شرطیہ ہے جو اس بات پر

^۱ غافر ۱۵، انعام ۱۳۰، ۱۵۴، رعد ۲، شوریٰ ۷، زخرف ۶۱، زمر ۷۱

^۲ فرقان ۱۱، اسراء ۱۰، سباء ۸، مؤمنون ۷۴

^۳ مؤمنون ۱۱۵

دلائل کرتا ہے کہ اس دنیا میں انسان کے پیدا ہونے کا حکیمانہ مقصد اس وقت پورا ہوگا، جب اس دنیا کی زندگی کے بعد انسان اپنے پروردگار کی بارگاہ میں پلٹ کر جائے اور آخرت میں اپنے اعمال کے نتیجے کو حاصل کرے اور ہم نے اس ملازمہ کو برہان حکمت کے ذیل میں بیان کیا تھا لہذا دوبارہ بیان کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ لیکن دوسرا مقدمہ (خدا بیکار اور بے مقصد کام انجام نہیں دیتا) یہ وہی حکمت الہی اور اس کے کام کے عبث و بیہودہ نہ ہونے کا مسئلہ ہے جو خدا شناسی کے باب میں ثابت ہو چکا ہے اور برہان حکمت کے بیان میں جس کی وضاحت کی جا چکی ہے، لہذا مذکورہ آیہ شریفہ مذکورہ برہان پر پوری طرح قابل انطباق ہے۔

اب ہم مزید اس بات اضافہ کرتے ہیں کہ انسان کی پیدائش اس دنیا کی پیدائش کے لئے ہدف غائی اور اصلی مقصد کی حیثیت رکھتی ہے اگر اس دنیا میں انسان کی زندگی بیکار اور بے ہدف ہو اور ایسی ہو جس میں کوئی حکیمانہ مقصد نہ پایا جائے تو اس دنیا کی پیدائش بھی بیکار رہے، بے مقصد ہے، اور وہ باطل ہو جائے گی اس نکتہ کا استفادہ ان آیتوں سے کیا جاسکتا ہے جو عالم آخرت کے وجود کو دنیا کی پیدائش کے حکیمانہ ہونے کا تقاضہ جانتی ہیں اور جیسا کہ عقلمندوں (اولوالالباب) کی صفوں کے متعلق ارشاد ہوتا ہے۔

(وَيَعْلَمُونَ فِي خَلْقِ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هَذَا بَاطِلًا نَّجْمًا كَفَٰهِنًا عَذَابُ النَّارِ) اور وہ لوگ آسمانوں اور زمینوں کی خلقت کے بارے میں غور و فکر کرتے ہیں (اور پھر کہتے ہیں) پروردگار! تو نے ان چیزوں کو بیکار نہیں پیدا کیا تو پاک و پاکیزہ ہے (اس چیز سے کہ بیہودہ و بے مقصد کام کرے) پس مجھے آتش جہنم سے محفوظ رکھ۔

اس آیت سے یہ استفادہ ہوتا ہے دنیا کی خلقت کے بارے میں غور و فکر کرنا، انسان کو پروردگار کی حکمت کی طرف متوجہ کر دیتا ہے یعنی اس عظیم کائنات کی خلقت کے وقت خدا کی نگاہ میں ایک حکیمانہ مقصد تھا اور اس نے اس کو بیکار و بے مقصد پیدا نہیں کیا لہذا اگر کوئی دوسرا عالم موجود نہ ہو جو اس دنیا کی خلقت کا آخری مقصد اور ہدف قرار پائے تو خدا کی خلقت کا بیکار و بے مقصد

ہونا لازم آئے گا قرآن حکیم کی آیات کا دوسرا گروہ جو قیامت کی ضرورت پر برہان عقلی کی طرف ایک اشارہ ہے اور جو برہان عدالت پر قابل تطبیق ہے یعنی عدالت الہی کا تقاضا یہ ہے کہ نیک اعمال انجام دینے والے کو اس کی جزا اور گنہگاروں کو ان کے کئے کا بدلہ دیا جائے اور ان دونوں کی عاقبت اور انجام کو ایک دوسرے سے علیحدہ رکھا جائے نیز دونوں کے درمیان فرق کا قائل ہو جائے، اور چونکہ اس دنیا میں ایسا کوئی فرق نہیں پایا جاتا لہذا ایک دوسرے عالم کو برپا کرنے کی ضرورت ہوگی، تاکہ خداوند عالم اپنی عدالت کو عینی صورت میں پیش کر سکے جیسا کہ سورہ جاثیہ میں ارشاد فرماتا ہے۔

(اَمْ حَسِبَ الَّذِينَ اِخْتَرُوا السَّاعَاتِ اَنْ نَّجْعَلَنَّهُمْ كَالَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ سَوَاءً مِّمَّنْ هُمْ وَمَا تَعْمَلُونَ* وَخَلَقَ اللّٰهُ اَرْضًا يَنْحَقُّ الْيَجْرُ مِنْ كُلِّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ^۲) کیا برائی اختیار کرنے والوں نے یہ خیال کر لیا ہے کہ ہم انہیں ایمان لانے والوں اور نیک عمل کرنے والوں کے برابر قرار دیں گے کہ سب کی موت و حیات ایک جیسی ہو یہ ان لوگوں نے نہایت بدترین فیصلہ کیا ہے اور اللہ نے آسمان اور زمین کو حق کے ساتھ پیدا کیا ہے اور اس لئے بھی کہ ہر نفس کو اس کے اعمال کا بدلہ دیا جاسکے اور یہاں کسی پر ظلم نہیں کیا جائیگا۔

یاد دہانی کے لئے ضروری ہے کہ جملہ (وَخَلَقَ اللّٰهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بَآرِئًا) سے برہان حکمت کی طرف اشارہ ہے جیسا کہ بنیادی طور سے برہان عدالت کو بھی برہان حکمت کی طرف پلٹایا جاسکتا ہے کیونکہ جیسا کہ ہم نے عدل الہی کی بحث کے ذیل میں وضاحت کی تھی کہ عدل حکمت کے مصداق میں سے ہے۔

^۱ ص ۲۸، غافر ۵۸، قلم ۳۵، یونس ۴
^۲ جاثیہ ۲۲-۲۱

سوالات

- ۱۔ قرآن کریم قیامت کو کیسے ثابت کر رہا ہے اور لوگوں پر اپنی حجت کیسے تمام کرتا ہے؟
- ۲۔ برہانِ حکمت کی طرف کونسی آیات اشارہ کر رہی ہیں؟ ان کے استدلال کو بیان کیجئے؟
- ۳۔ برہانِ عدالت کی طرف کونسی آیات اشارہ کر رہی ہیں ان کے استدلال کو بیان کیجئے؟
- ۴۔ برہانِ عدالت کو برہانِ حکمت کی طرف کس طرح پلٹایا جاسکتا ہے؟

اڑتالیسواں درس

عالم آخرت کی خصوصیات (آخرت کی پہچان)

مقدمہ

انسان جن چیزوں کے بارے میں تجربہ نہیں رکھتا اور جنکو باطنی دلیلوں اور علم حضوری کے ذریعہ نہیں سمجھ سکتا، یا پھر اپنے احساسات کی روشنی میں سے درک نہیں کر سکتا، اس کے بارے میں شناخت کامل حاصل کرن اس کے لئے محال ہے لہذا اس نکتہ کی طرف توجہ کرتے ہوئے ہمیں اس بات کی توقع نہیں رکھنی چاہیے کہ ہم آخرت اور اس میں رونما ہونے والے حوادث کو صحیح معنوں میں پہچان سکتے ہیں یا ان کی حقیقت تک پہنچ سکتے ہیں، بلکہ ایسے مسائل میں صرف عقل و روایات کے ذریعہ ثابت شدہ اوصاف اور مسلمات پر اکتفا کر لینا ضروری ہے اور اس سے اوپر پرواز کرنا مناسب نہیں ہے۔

افسوس کا مقام ہے کہ بعض افراد نے یہ سمجھانے کی لا حاصل کوشش کی ہے کہ آخرت بھی اسی دنیا کے مانند ہے اور اس بارے میں یہاں تک آگے بڑھ گئے ہیں کہ گئے گئے بہشت اسی دنیا میں آسمان کے کسی کڑے یا سیارے میں ہے جدید علمی ترقی کے ذریعہ ایسے وسائل ایجاد کئے جاسکتے ہیں کہ جن کی مدد سے وہاں منتقل ہوا جاسکتا ہے جہاں نہایت راحت و آرام کے ساتھ زندگی گزارا جاسکتی ہے۔

اور دوسری جانب بعض لوگ تو سرے سے ہی آخرت کا انکار کر بیٹھے ہیں اور انکے تصور میں آخرت اور جنت صرف اخلاقی قدر و منزلت کا نام ہے یعنی قوم و ملت کے خدمت گزار اور نیک افراد اس سے لو لگائے ہیں اور ان کی نظر میں دنیا و آخرت کے درمیان فرق صرف فائدے اور قدر و منزلت کی بنیاد پر ہے۔ ایسی صورت میں ہم سب سے پہلے گروہ اول سے سوال

کرتے ہیں کہ بہشت آخر اگر آسمان کے کسی سیارے پر ہے اور آنے والی نسل وہاں پہنچے گی تو قیامت کے دن انسانوں کا دوبارہ زندہ ہونا، اور ایک جگہ پر جمع ہونا جس کی قرآن مجید نے بھی تصریح فرمائی ہے اس کے کیا معنی ہوں گے؟ اور کیسے گزشتہ قوموں کے اعمال کی جزا اور سزا وہاں دی جائے گی؟ دوسرے گروہ سے بھی ہمارا یہی سوال ہے کہ جب جنت صرف اخلاقی اہمیت و ضروت کا نام ہے تو جہنم بھی خلاف اخلاقی چیزوں کے علاوہ کوئی دوسری شے نہیں ہوگی اور ایسی صورت میں قرآن مجید نے قیامت کے وقوع پر اور انسانوں کے دوبارہ زندہ ہونے پر اتنی تاکید کی ہے اس کا کیا ہوگا؟ کیا یہ نہیں ہو سکتا تھا کہ انبیاء علیہم السلام قیامت اور آخرت کے اسی مفہوم کو صراحت کے ساتھ بیان کر دیتے تاکہ اپنے اوپر ہونے والے تمام اعتراضات اور تہمتوں سے محفوظ رہتے اور ان پر دیوانگی اور افسانہ گوئی وغیرہ کے الزامات نہ لگتے؟

ان سب باتوں اور بحثوں کے بعد اختلافات اور مناظرات جو فلاسفہ اور متکلمین کے درمیان واقع ہوئے ہیں کہ آیا معاد (قیامت) میں دوبارہ زندہ ہونا اور حساب و کتاب ہونا (جسمانی ہے یا روحانی؟ کیا یہ مادی دنیا بالکل فنا ہو جائے گی یا نہیں؟ کیا یہ اخروی جسم، وہی دنیاوی جسم ہے یا اس کے مثل و مانند کوئی دوسری شے ہے؟ اگرچہ یہ عقلی اور فلسفی کوششیں حقیقت جوئی کی راہ میں قابل داد و تحسین ہیں اور انھیں کے سائے میں ضعیف و قوی نظریات بھی سامنے آئے ہیں لیکن ہمیں اس بات کی توقع نہیں رکھنی چاہیے کہ ان بحثوں سے ہم ابدی زندگی کی تہ تک پہنچ جائیں گے اور اصل حقیقت ہمارے لئے اس طرح روشن ہو جائے گی کہ گویا ہم نے اسے پالیا ہے۔

واقعاً کیا ابھی تک اسی دنیا نے فانی کے تمام حقائق پوری طرح سے کشف ہو گئے ہیں؟ کیا سائنس والوں نے اس حقیقت کو کشف کر لیا ہے کہ مادہ کیا چیز ہے؟ انرجی کیا ہے؟ یا مختلف موجودات قیامتیں اور قوتیں کیا اور کیسی ہیں؟ کیا اس دنیا کے مستقبل کے سلسلے میں کوئی یقینی پیشین گوئی کر سکتے ہیں؟ کیا انھیں یہ معلوم ہے کہ اس دنیا کی مقناطیسی کیفیت ختم کر دی جائے الیکٹرون ذرات اپنی حرکت سے رک جائیں تو کیا ہوگا یا ان چیزوں کا واقع ہونا ممکن ہے یا نہیں؟ کیا فلسفیوں نے اس دنیا سے متعلق سارے عقلی مسائل

کو یقینی طور سے حل کر لیا ہے؟ اور کیا جسمی اور نوعی صورتیں جسم و روح کے درمیان رابطے کے سلسلے میں مزید حقائق جاننے کی تحقیقات کی ضرورت نہیں ہے؟ لہذا ہم اپنے ان ناقص علوم اور محدود علم و دانش کے ذریعہ اس دنیا کے حقائق تک کیسے پہنچیں جبکہ ہمارے پاس اس کے بارے میں کوئی تجربہ بھی نہیں ہے انسان کے علم کے ناقص ہونے کا یہ مطلب نہیں ہے وہ قطعاً کسی چیز کو پہچانتا ہی نہیں، یا اس راہ میں اس کی تمام تر کوششیں بیکار ہیں۔

لیکن حقیقت تو یہ ہے کہ ہم اس خدا داد عقل کے ذریعہ بہت سے اسرارِ طبیعت اور رازِ خلقت کو کشف کر سکتے ہیں، البتہ ہمیں اپنے علوم اور تجربات کو بڑھانے کے لئے علمی اور فلسفی روش اور طریقوں سے مدد لینا چاہیے، لیکن اس کے ساتھ ساتھ لازم ہے کہ اپنی عقلی طاقت کی حد اور ساتھی تجربات کی سطح کو ملحوظ رکھیں اور اپنی حد سے زیادہ پرواز کرنے کی کوشش نہ کریں، اور اس اصول کو بھی قبول کریں (وَمَا أُوتِیْتُمْ مِنَ الْعِلْمِ إِلَّا قَلِیلًا^۱) اور تم کو بہت تھوڑا علم دیا گیا ہے۔

ہاں، کبھی کبھی عالمانہ اور عمیق نظر، حکیمانہ تواضع و انکساری اور ذمہ دارانہ دینی احتیاط کے پیش نظر ہمیں قیامت کے حقائق کے متعلق یقینی رائے دینے، غیب کی باتیں اور بے جاتا ویلات سے پرہیز کرنا اچھے، سوائے ان حقائق کے جنکے بارے میں خداوند عالم اور عقلی دلیلوں نے ہمیں اجازت دی ہے۔ بہر حال مومنین کے لئے کافی ہے کہ جو پروردگار نے نازل فرمایا ہے اسے صحیح تسلیم کرتے ہوئے اس پر ایمان رکھے جن کے بارے میں صحیح تشخیص نہیں دے سکتا جن کی خصوصیات سے واقف نہیں ہو سکتا خصوصاً وہ امور جن کے بارے میں ہمارے علم و تجربے ناقص ہیں۔ اب ہم اس بات کی کوشش کرتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ کس حد تک ہم آخرت کی خصوصیات اور دنیا و آخرت کے فرق کو عقل کی روشنی میں بیان کر سکتے ہیں۔

عقل کی روشنی میں آخرت کی خصوصیات

قیامت کی ضرورت کے سلسلے میں جو دلائل ہم نے بیان کئے ہیں انھیں کے پیش نظر آخرت کی خصوصیات کو بیان کریں گے، ان میں سے چند اہم خصوصیات یہ ہیں، ۱۔ آخرت کی پہلی خصوصیت یہ ہے کہ اسے ابدی اور جاودانی ہونا چاہیے، کیونکہ ہم نے پہلی دلیل میں ابدی حیات کے امکان اور انسانی فطرت کے مطابق ہونے سے بحث کی تھی اور یہ بھی کہا تھا کہ حیات ابدی حکمت الہی کا تقاضہ ہے،

۲۔ دوسری خصوصیت جو دونوں ہی دلیلوں سے ثابت ہے اور دلیل اول میں اس کی طرف اشارہ بھی ہوا ہے وہ یہ ہے کہ عالم آخرت کا نظام ایسا ہو کہ جس میں آخرت کی تمام نعمتیں اور رحمتیں بالکل خالص اور بغیر کسی رنج و زحمت کے حاصل ہوں تاکہ ایسے افراد جو کسی گناہ اور معصیت میں مبتلا ہوئے بغیر انسانی کمال کے اہم درجات تک پہنچے میں اس سعادت سے لطف اندوز اور نعمتوں سے سرفراز ہوں۔ دنیا کے برخلاف کہ جہاں ایسی خالص سعادت ممکن ہی نہیں ہے بلکہ دنیاوی خوشنختی نبی ہے جو ہمیشہ رنج و معصیت کے ساتھ ہوتی ہے۔

۳۔ تیسری خصوصیت یہ ہے کہ جہان آخرت کے کم از کم دو الگ الگ حصے ہونے چاہیے تاکہ نیک اور بد یا مومن و کافر ایک دوسرے سے جدا رہیں اور دونوں اپنے اپنے اعمال و کردار کے لئے تلافی کریں اور یہ دونوں مقام اور منزلیں شریعت الہی کی زبان میں جنت و جہنم کے نام سے موسوم ہیں۔

۴۔ چوتھی خصوصیت جو برہان عدالت سے ظاہر ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ ابدی جہان کو اتنا وسیع ہونا چاہیے کہ جس میں تمام انسانوں کو ان کے نیک اور برے اعمال کی جزا و سزا دینے کی گنجائش ہو، مثلاً اگر کسی نے لاکھوں انسانوں کو ناحق قتل کیا ہے تو اسے وہاں اس کی سزا ملے اور اگر کسی نے لاکھوں انسانوں کی حیات اور زندگی بچائی ہے تو اسے اس کی جزا ملنے کا امکان ہو۔

۵۔ سب سے مهم خصوصیت جو اسی برہان عدالت سے ثابت ہوتی ہے اس کا ذکر پہلے بھی ہو چکا ہے کہ آخرت صرف جزا و سزا کا مقام ہے نہ اعمال و کردار کا۔ توضیح: دنیاوی زندگی ایک چیز ہے جس کا دار و مدار متضاد خواہشات اور آرزوؤں پر ہے اور ہمیشہ یہ خواہشات زندگی کے دوراہے پر ٹھہر جاتی ہیں اور انسان مجبور ہوتا ہے کہ ان دونوں میں سے کسی ایک کا انتخاب کرے اور یہی انتخاب ان کے عمل کے راستے کو ہموار کرتا ہے اور عمر کے آخری لمحہ تک اس کا سلسلہ جاری رہتا ہے اور حکمت و عدالت الہی کا تقاضا یہی ہے کہ اس کے اوامر پر عمل کرنے والوں کو جزا اور اس سے منحرف افراد کو سزا کا مستحق قرار دے۔

اب ایسی صورت میں اگر ہم یہ فرض کریں کہ عالم آخرت بھی عمل انجام دینے کی جگہ ہے تو رحمت الہی اور اس کی فیاضی کا تقاضا یہ ہے کہ ان اعمال کی انجام دہی میں مانع نہ ہو اور انسان کو اتنا موقع دے کہ وہ اپنے راستے کا انتخاب خود کرے، تو ایسی صورت میں ضرورت پیش آئیگی کہ اس کے علاوہ کوئی اور بھی عالم ہو جس میں ان اعمال پر جزا و عقوبت قرار دی جائے پس ہم نے جس دنیا کو آخرت فرض کیا تھا وہ آخرت نہیں بلکہ دوسری دنیا شمار ہوگی اور آخرت صرف آخری جہان کو کہا جائے گا جہاں اعمال پر ثواب اور عقاب مترتب ہوں اور وہاں اعمال بجالانے کی گنجائش نہ ہو۔

بس میں سے دنیا اور آخرت کا اساسی اور بنیادی فرق سامنے آتا ہے یعنی دنیا اسے کہتے ہیں جہاں انسان کی آزمائش اور امتحان ہو اور اچھے یا برے اعمال بجالائے اور آخرت اس ابدی زندگی کا نام ہے جہاں صرف اپنے کئے کی اچھی یا بری جزا یا سزا ملے۔ (وان لے نؤم عمل ولا حساب وعدا حساب ولا عمل)۔

سوالات

۱۔ ہم کیوں آخرت کو صحیح اور مکمل طریقہ سے نہیں پہچان سکتے؟

۲۔ آخرت کے بارے میں غلط تصور اور کج فکری کے دو نمونے ذکر کرتے ہوئے اس پر تنقید کیجئے؟

۳۔ ہم آخرت کی خصوصیات کس طرح سمجھ سکتے ہیں؟

۴۔ عقل کی روشنی میں عالم آخرت کی خصوصیات کو ذکر کرتے ہوئے اس کی مکمل شرح کیجئے؟

انچاسواں درس

موت سے قیامت تک

مقدمہ

ہمیں معلوم ہو چکا کہ ہم اس محدود علم کے ذریعہ آخرت اور مطلق عالم غیب کی حقیقت اور اس کی گہرائی تک نہیں پہنچ سکتے بلکہ ہم صرف عقلی براہین سے حاصل ہونے والے کئی مسائل اور وحی و روایات سے اخذ ہونے والی بعض خصوصیات کے ذکر پر اکتفا کریں گے، اگرچہ ممکن ہے کہ قرآن مجید میں عالم آخرت کی توصیف میں ذکر شدہ بعض الفاظ متشابہ ہوں اور ان کو سننے کے بعد جو تصورات ہمارے ذہن میں پیدا ہوتے ہیں، شاید وہ واقعی مصداق کے مطابق نہ ہوں اور یہ خطا ہمارے قاصر ذہن کی ہے نہ بیان کی، کیونکہ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ قرآن کریم نے ہمارے ذہنی ساخت و ساز کے لحاظ سے بہترین الفاظ کا انتخاب کیا ہے جو حقائق کو کما حقہ بیان کرتے ہیں۔ اور چونکہ قرآن کریم کا بیان آخرت کے مقدمات کو بھی شامل ہے لہذا اپنے کلام کا آغاز بھی انسان کی موت سے کرتے ہیں۔

ہر ایک کو موت آنی ہے

قرآن مجید اس بات پر بہت تاکید کرتا ہے کہ تمام انسان بلکہ تمام (ذی روح) کو ایک نہ ایک دن ضرور مرنا ہے اور کوئی بھی اس دنیا میں ہمیشہ زندہ رہنے والا نہیں ہے، (کل من علیہا فان^۱) جو بھی روئے زمین پر ہے سب فنا ہو جانے والا ہے۔ (کل نفس ذائقة الموت^۲) ہر ایک کو موت کا مزہ چکھنا ہے، (انک مئت و انتم مئون^۳) بے شک تم بھی مرو گے اور یہ لوگ بھی مرے

^۱ رحمن - آیت ۲۶

^۲ آل عمران - آیت ۱۸۵ - انبیاء - آیت ۳۵

^۳ زمر - آیت ۳۰

گے۔ (وَمَا جَعَلْنَا لِبَشَرٍ مِّنْ قَبْلِكَ أَخْلَدَ أَفَايِنَ مِّثَّ فَمُ الْخَالِدُونَ^۱) اور ہم نے آپ سے پہلے بھی بشر کے لئے ہمیشگی نہیں قرار دی تو کیا اگر آپ مر جائیں تو یہ لوگ ہمیشہ باقی رہیں گے۔ نچتاً موت ایک قانون مکی اور ناقابل انکار حقیقت ہے جس سے کسی شی کو بھی فرار نہیں ہے۔ روح قبض کرنے والا: قرآن مجید ایک طرف تو قبض روح کی نسبت خداوند عالم کی طرف دیتا ہے، اور فرماتا ہے :

(اللَّهُ يَتَوَفَّى الْأَنفُسَ حِينَ مَوْتِهَا^۲) خدا موت کے وقت روح قبض کرتا ہے۔

اور دوسری طرف ملک الموت کو قبض روح پر مامور بتاتا ہے۔ (قُلْ يَتَوَفَّاكُم مَّلَكُ الْمَوْتِ الَّذِي ذُكِّرَ بِكُمْ^۳) آپ کد بچنے کہ تم کو وہ ملک الموت زندگی کی آخری منزل تک پہنچائے گا جو تم پر تعینات کیا گیا ہے۔ اور ایک دوسرے مقام پر قبض روح کو فرشتوں اور رسولوں کی طرف نسبت دی ہے، (حَتَّىٰ إِذَا جَاءَ أَحَدُكُمُ الْمَوْتُ تَوَفَّتْهُ رُسُلُنَا^۴) یہاں تک کہ جب کسی کی موت کا وقت آجاتا ہے تو ہمارے بھیجے ہوئے نمائندے اُسے اٹھا لیتے ہیں۔ اور یہ واضح چیز ہے کہ جب فاعل اپنے کسی کام کو دوسرے فاعل کے ذریعہ انجام دے تو اس فعل کی نسبت دونوں کی طرف صحیح ہے اور اگر دوسرا فاعل کسی تیسرے شخص کے وسیعے کام انجام دے تو یہ تیسرا شخص بھی اس میں شامل ہو جاتا ہے پس چونکہ خداوند عالم ملک الموت کی روح قبض کرتا ہے اور ملک الموت بھی اپنی ما تحت فرشتوں کے ذریعے قبض روح کرتا ہے لہذا قبض روح کی نسبت تینوں کی طرف دینا صحیح ہے۔

قبض روح آسان ہے یا سخت؟

قرآن مجید سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ موت کے فرشتے سارے انسانوں کی روح کو ایک طریقہ سے قبض نہیں کرتے، بلکہ بعض افراد کی روح نہایت آسانی اور احترام کے ساتھ اور بعض افراد کی نہایت ہی سختی اور اہانت کے ساتھ قبض کرتے ہیں، اس دعوے کی شاہد مثال یہ آیہ شریفہ ہے (الَّذِينَ تَتَوَفَّاهُمُ الْمَلَائِكَةُ طَيِّبِينَ يَقُولُونَ سَلَامٌ عَلَيْكُمْ^۵) جنہیں ملائکہ اس عالم میں اٹھاتے ہیں کہ وہ

^۱ انبیاء۔ آیت ۳۴

^۲ زمر۔ آیت ۴۲

^۳ سجدہ۔ آیت ۱۱

^۴ انعام۔ آیت ۶۱

^۵ نحل۔ آیت ۳۲۔ انعام۔ آیت ۹۳

پاک و پاکیزہ ہوتے ہیں اور ان سے ملائکہ کہتے ہیں کہ تم پر سلام ہو۔ اور کافروں کے بارے میں یوں ارشاد ہوا: (وَلَوْ تَرَىٰ اِذِ الْمُرْسَلُونَ اِذْ يُنْفَخُ الْكِتَابُ وَهُوَ يُخْبَرُ اَوْ يَكْتُمُ الصَّاعِقُ اِذْ يُخْلَقُ السَّاعِقُ اَوْ يُدْفَعُ السَّاعِقُ اَوْ يُدْفَعُ السَّاعِقُ اَوْ يُدْفَعُ السَّاعِقُ) کاش تم دیکھتے جب فرشتے ان کی جان نکال رہے تھے اور ان کے رخ اور پشت پر مار رہے تھے اور یہ بھی ممکن ہے کہ مومنین اور کفار کے درمیان ان کے ایمان اور کفر کے درجات کے اعتبار سے قبض روح کے بھی درجات اور طبقات ہوں۔ موت کے وقت ایمان اور توبہ کا قبول نہ ہونا کفار اور گناہگار، افراد جب اپنی موت کو سامنے دیکھتے ہیں اور اپنی نیوی زندگی سے مایوس ہو جاتے ہیں تو اپنے گزشتہ اعمال و کردار پر نادم و پشیمان ہو جاتے ہیں اور اپنے ایمان اور توبہ کا اظہار کرنے لگتے ہیں اگرچہ اس وقت یہ دونوں ہی چیزیں ان کے لئے عبث و بیکار ہیں: (يَوْمَ تَأْتِي بَعْضُ آيَاتِ رَبِّكَ لَا يَنْفَعُ نَفْسًا اِيمَانُهَا لَمْ يَكُنْ اٰمَنَّا مِنْ قَبْلُ اَوْ كُنَّا فِيْ اِيْمَانٍ خَيْرًا) اس دن جب خدا کی کھلی آیات ظاہر ہوں گی تو اس شخص کا ایمان جو پہلے نہیں لایا یا اس نے اپنے ایمان کے دوران کوئی کار خیر انجام نہیں دیا تو اس کا ایمان اسے کوئی فائدہ نہیں پہنچائے گا: (وَلَيْسَتِ التَّوْبَةُ لِلَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ السَّيِّئَاتِ حَتّٰى اِذَا حَضَرَ اَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ اِنِّىْ بُدِّلْتُ الْاِيْمَانَ) اور توبہ ان لوگوں کے لئے نہیں ہے جو پہلے برائیاں کرتے ہیں اور پھر جب موت سامنے نظر آتی ہے تو کہتے ہیں کہ اب ہم نے توبہ کر لی ہے۔

اور فرعون کے قول کو نقل کر رہا ہے جب وہ غرق ہو رہا تھا تو اس نے کہا (آمَنَّا بِاللّٰهِ اِنَّا كُنَّا مِنْ اٰمَنِيْنَ) میں ایمان لایا اس پر کہ کوئی خدا نہیں ہے سوائے اس خدا کے جس پر بنی اسرائیل ایمان لائے ہیں اور میں اہل اسلام میں سے ہوں، اس کے جواب میں ارشاد ہو رہا ہے۔ (اَلْاَنَ وَعَصَيْتَ قَبْلُ وَكُنْتَ مِنَ الْمُتَعِدِّينَ) اب (مرنے کے وقت ایمان لاتا ہے) حالانکہ تو اس سے پہلے نافرمانی کر چکا اور تو تو فساد برپا کرنے والوں میں سے تھا۔ دنیا میں وہی کی آرزو۔ اسی طرح قرآن کریم کفار اور گناہگاروں کے متعلق نقل کرتا ہے کہ جب موت کے بادل ان کے سر پر مٹلانے لگتے ہیں اور عذاب

^۱ انفال۔ آیت ۵۰۔ محمد۔ آیت ۲۷

^۲ انعام۔ آیت ۵۸۔ اور صبا۔ آیت ۵۱، ۵۳، غافر۔ آیت ۸۵، سجده۔ آیت ۲۹

^۳ نساء۔ آیت ۱۸

^۴ یونس۔ آیت ۹۰

^۵ یونس۔ آیت ۹۱

(اَوْثَقُولُ حِينَ تَرَى الْعَذَابَ لَوْ اَنْ لِي كَرْهٌ فَاَكُوْنُ مِنَ الْمُحْشَيْنِ ۚ) یا جب وہ عذاب کو دیکھیں گے تو کہیں گے کاش پلٹا دیئے جاتے تو نیک بندوں میں سے ہو جاتے (اِذْ وَثَقُوا عَلٰی النَّارِ لَوْ اِنَّا لَعِینُا نُرَدُّوْا لَا نَكْذِبُ بَیِّنَاتٍ رَبَّنَا وَكَلُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ ۝) (اے رسول ﷺ اگر تم ان لوگوں کو اس وقت دیکھتے تو تعجب کرتے) کہ جب جہنم کے کنارے پر لا کر کھڑے کئے جائیں گے تو اُسے دیکھ کر کہیں گے اے کاش ہم دنیا میں دوبارہ لوٹا دئے جاتے اور اپنے پروردگار کی آیتوں کو نہ جھٹلاتے اور ہم مومنین میں سے ہوتے۔ (اِذَا النُّجُومُ نَاكَسُوْا زَعُوْهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ رَبَّنَا ابْصُرْنَا وَنَمْنَعْنَا فَاَرْجِعْنَا لِنَعْمَلْ صَاحِبَاۤ اِنَّا مُوقِنُوْنَ ۝) اور جب مجرمین حساب کے وقت اپنے پروردگار کی بارگاہ میں اپنے سر جھکائے کھڑے ہوں گے اور عرض کر رہے ہوں گے کہ پروردگار ہم نے اچھی

۱ جان لینا چاہیے کہ قرآن کریم ان لوگوں کے پلٹنے کی آرزوؤں اور تمناؤں کا انکار کرتا ہے جن کی ساری زندگی گناہ اور معصیت میں بیت چکی ہو اور موت کے وقت دنیا میں واپسی کی تمنا رکھتے ہوں تاکہ اپنے گناہوں کی تلافی کر سکیں لیکن قیامت سے واپسی کی قطعاً نفی کرتا ہے وہ اس معنی میں نہیں ہے کہ دنیا کسی طرح واپسی ممکن نہیں ہے کیونکہ ایسے افراد بھی تھے جو موت کے بعد دوبارہ اسی دنیا میں زندہ ہو چکے ہیں اور شیعوں کے عقیدہ کے مطابق حضرت مہدی عجل کے ظہور کے بعد کچھ لوگوں کی رجعت ہوگی۔

۲ انعام۔ آیت ۲۷-۲۸

۳ مو منون - آیت ۹۹ - ۱۰۰

^۴ زمر۔ آیت ۵۸، نیز شعراء۔ آیت ۱۰۲

° انعام-آیت ۲۷ - ۲۸ نیز اعراف-آیت ۳۵

٦ سجده ١٢، نیز فاطر ٣٧،

طرح دیکھ لیا ہے اور سن لیا ہے تو ہمیں دنیا میں ایک بار پھر لوٹا دے، تاکہ ہم نیک کام کریں، اب تو ہم کو قیامت کا پورا پورا یقین ہے۔ ان آیات سے یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ قیامت اعمال و انتخاب کی جگہ نہیں یہاں تک کہ وہ یقین جو دم مرگ یا آخرت میں حاصل ہوگا انسان کے مکمل (بدریج کامل تک پہنچنے) کیلئے فائدہ بخش نہیں ہوگا، اور انعام کا مستحق نہیں قرار پائے، اسی لئے کفار اور گنہگار اس دنیا میں واپسی کی آرزو کریں گے تاکہ اس دنیا میں پلٹ آئیں اور اپنے اختیار سے ایمان لائیں اور عمل صالح انجام دیں۔

حالم برزخ

قرآنی آیات سے استفادہ ہوتا ہے کہ موت اور قیامت کے درمیان فاصلہ کو برزخ کہا جاتا ہے جو انسان موت کے بعد اور قیامت سے پہلے قبر میں گزارتا ہے کہ جس میں تھوڑا بہت رنج و مصیبت اور خوشی و مسرت کا بھی سامنا ہوتا ہے، بعض روایات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ گنہگار مومنین اس دوران بعض رنج و عذاب میں مبتلا ہونے کے ذریعہ پاک کر دئے جائیں گے، اور ان کا بوجھ ہلکا ہو جائے گا۔ چونکہ برزخ سے مربوط آیات تفسیر طلب میں لہذا ان سے صرف نظر کرتے ہوئے صرف ایک آیہ شریفہ پر اکتفا کرتے ہیں۔ **وَمِنْ وَّرَاءِہُمْ بَرْزَخٌ اِلٰی ؕ وَاُولٰٓئِکَ یُعْثُوْنَ^۱** اور ان کے بعد (ان کی موت کے بعد) ایک برزخ ہے جب تک کہ اٹھانے جائیں۔

سوالات

- ۱۔ اس دنیا میں انسان کے ہمیشہ نہ رہنے کو قرآنی آیات سے واضح و روشن کیجئے؟
- ۲۔ انسان کی روح کون قبض کرتا ہے مربوط آیتوں کے درمیان جو اختلاف ہے اسے پیش کیجئے؟
- ۳۔ روحوں کے قبض کرنے کے سلسلے میں کیا فرق ہے؟

۴۔ مرتے دم ایمان اور توبہ کے بارے میں قرآنی بیان کو مع آیات کے وضاحت کیجئے؟

۵۔ قرآن کریم، دنیا میں کس طرح کی واپسی کا انکار کر رہا ہے؟ آیا اس واپسی کا انکار رجعت کے عقیدے کے منافی ہے؟

۶۔ عالم برزخ کی شرح کیجئے؟

پچاسواں درس

قرآن مجید میں قیامت کا نقشہ

مقدمہ

قرآن مجید سے یہ بات معلوم ہوتی ہے قیامت اور ابدی زندگی صرف انسانوں کے دوبارہ زندہ ہونے سے شروع نہیں ہوگی، بلکہ اس کے لئے ضروری ہے کہ اس دنیا کا نظام بھی تہ وبالا ہو جائے اور دوسری دنیا دوسری خصوصیات کے ساتھ عالم وجود میں آئے جس دنیا کے بارے میں ہم کچھ نہیں جانتے اس کے بارے میں کوئی نظریہ بھی نہیں دے سکتے اور اس کے بعد ابتداء خلقت سے لے کر اختتام دنیا تک کے تمام انسان زندہ کئے جائیں گے پھر اپنے اپنے اعمال کی جزاء و سزا انہیں ملے گی۔ چونکہ اس موضوع سے متعلق آیات قرآنی فراوان ہیں لہذا کتاب کے اختصار کے پیش نظر ان سے کنارہ کشی کرتے ہوئے صرف ان کے مضامین کا خلاصہ بیان کر رہے ہیں۔

زمین دریا اور پہاڑوں کی حالت

زمین میں بہت ہی عظیم زلزلہ آئے گا زمین اپنے اندر تمام پوشیدہ خزانے اگل دے گی^۱ اور اس کے سارے اجزا بکھر جائیں گے^۲ دریا بھٹ جائیں گے^۳ اور سارے پہاڑ حرکت میں آجائیں گے^۴ اور ایک دوسرے سے ٹکرا دئے جائیں گے^۵ اور ریت کے ٹیلے کی طرح ہو جائیں گے^۶ اور دھنی ہوئی روٹی کے مانند بن جائیں گے^۷ اور پھر فضا میں بکھر جائیں گے^۸ اور اونچے اونچے آسمانوں سے

^۱ زلزال ، ۱ حج ، ۱ واقعہ ، ۴ زمزل ، ۱۴ ،

^۲ زلزال ، ۲ ، انشقاق ، ۴ ،

^۳ الحاقہ ، ۱۴ ، فجر ، ۲۱ ،

^۴ تکویر ، ۶ ، انفطار ، ۳ ،

^۵ کہف ، ۴۷ ، نحل ، ۸۸ ، طور ، ۱۰ تکویر ، ۲ ،

^۶ الحاقہ ، ۴ ، واقعہ ، ۵ ،

^۷ زمزل ، ۱۴ ،

^۸ معارج ، ۹ ، قارعہ ، ۵ ،

باتیں کرتے ہوئے پہاڑوں کو ریت کے چٹیل میدان میں تبدیل کر دیا جائے گا آسمانوں اور ستاروں کی کیفیت چاند^۳ اور سورج^۴ اور وہ عظیم ستارے جو ہمارے سورج سے کروڑوں گنا بڑے اور چمکدار ہیں سب کی چمک دمک ختم ہو جائیگی اور سب تیرگی میں چلے جائیں گے^۵ اور ان کا ایک نظام کے مطابق حرکت کرنا ختم ہو جائے گا^۶ اور سورج و چاند آپس میں ٹکرا کر ایک ہو جائیں گے^۷ اور وہ آسمان جو اس دنیا پر مضبوط اور محفوظ چھت کی طرح ہے مترنزل اور کمزور ہو جائے گا^۸ اور پھٹ جائے گا اور اس میں دراڑیں پڑ جائیں گی^۹ اور اس کی چادر لیٹ دی جائے گی^{۱۰} اور سارے آسمانی تیارے پکھلی ہوئی دھات کی طرح ہو جائیں گے^{۱۱} اور اس دنیا کی فضا دھوئیں اور بادل سے بھر جائیگی^{۱۲}

موت کا صور

ایسی ہی حالت میں موت کا صور پھونک دیا جائے گا اور تمام زندہ موجودات مر جائیں گے^{۱۳} اور اس فطری دنیا میں زندگی کا کوئی اثر نہیں ملے گا، اور خوف و اضطراب ہر ایک پر چھا جائے گا^{۱۴} لہذا وہ لوگ جو ہستی اور موجودات کے اسرار اور حقیقت سے واقف ہیں اور جن کے دل خدا کی محبت اور معرفت میں ڈوبے ہوئے ہیں۔

زندگی اور آغاز قیامت کا صور

پھر وہ دوسرا جہان جس میں بقا اور ابدیت کی قابلیت پائی جاتی ہے معرض وجود میں آئے گا^{۱۵} اور زمین اپنے رب کے نور سے

۱ طہ ۱۰۵، مرسلات ۱۰،
 ۲ کہف ۸، نبا ۷،
 ۳ قیامت ۸،
 ۴ تکویر ۱،
 ۵ تکویر ۲،
 ۶ انفطار ۲،
 ۷ قیامت ۹،
 ۸ طور ۱، حاقہ ۱۶،
 ۹ رحمن ۳۷، حاقہ ۱۶، مزمل ۱۰،
 ۱۰ مرسلات ۱،
 ۱۱ انفطار ۱، انشقاق ۱، انبیاء ۱۰۴، تکویر ۱۲،
 ۱۲ دخان ۱۰،
 ۱۳ زمر ۶۸، حاقہ ۱۳، یس ۴۹،
 ۱۴ نمل ۸۷، ۸۹،

جگمگاٹھے گی^۱ اور زندگی کے صور کی آواز بلند ہوگی^۲ اور سارے انسان (بلکہ حیوانات بھی^۳) ایک لمحے میں زندہ ہو جائیں گے اور پھر گھبرائے ہوئے اور پریشان حال^۴ ٹڈیوں اور فضا میں اڑتی ہوئی ہنگاموں کے مانند تیز رفتاری^۵ سے اپنے رب کے پاس حاضر ہونے کے لئے روانہ ہو جائیں گے^۶ اور سب ایک میدان میں جمع ہو جائیں گے^۷ اس وقت سوچیں گے کہ عالم برزخ میں ان کا توقف ایک دن یا ایک گھنٹہ کے برابر تھا^۸

الہی حکومت کا ظہور اور سببی و نبی رشتوں کا خاتمہ

اس جہان میں حقیقتیں کھل کر سامنے آجائیں گے^۹ اور خدا کی حکومت اور سلطنت کا مکمل ظہور ہو جائے گا^{۱۰} اور مخلوقات پر ایک ہیبت طاری ہوگی کسی کو بھی بلند آواز میں گفتگو کرنے کی جرأت نہیں ہو سکتی^{۱۱} اور ہر ایک کو اپنے انجام کی فکر ہوگی یہاں تک کہ اولاد اپنے والدین سے اور رشتہ دار و قرابت دار ایک دوسرے سے دور بھاگیں گے اور اپنا منہ چھپائیں گے^{۱۲} اور سببی و نبی رشتوں کی بنیاد ہی ختم ہو جائے گی^{۱۳} اور وہ دوستیاں کہ جو دنیاوی اور شیطانی مفاد و معیار پر استوار تھیں دشمنی میں بدل جائے گی^{۱۴} اور اپنی گذشتہ غلطیوں اور گناہوں کی وجہ سے حسرت و یاس اور شرمندگی، ہر دل پر چھائی ہوگی^{۱۵} لہذا انسانی عدالت کا مقدمہ (محاکمہ) اس وقت

^۱ ابراہیم ۶۸، زمر ۶۷، مریم ۳۸، قہ ۲۲

^۲ زمر ۶۹،

^۳ زمر ۶۸، کہف ۹۹، قہ ۲۰، نباہ ۱۸، نازعات ۱۳، مدثر ۸، صافات ۱۹،

^۴ انعام ۳۸، تکویر ۵،

^۵ کہف ۴۷، نحل ۷۷، قمر ۵۰، نباہ ۱۸،

^۶ قہ ۲۰،

^۷ قارعہ ۴، قمر ۷،

^۸ قہ ۴۴ - معارج ۴۳،

^۹ یس ۵۱، مطففین ۳۰، قیامت ۱۲-۱۳، نیز آیات حشر و نشر

^{۱۰} کہف ۹۹، تغابن ۹، نساء ۷۸، انعام ۱۲، آل عمران ۹،

^{۱۱} روم ۵۵، نازعات ۴۶، یونس ۴۵، اسراء ۵۲، طہ ۱۰۳-۱۰۴، مومنون ۱۱۳، احقاف ۳۵،

^{۱۲} ابراہیم ۲۱ - العادیات ۱۰، طارق ۹، قہ ۲۲ الحاقہ ۱۸،

^{۱۳} حج ۶۵، فرقان ۲۶، غافر ۱۶، انفطار ۱۹،

^{۱۴} بود ۱۰۵، طہ ۱۰۸، ۱۱۱، نباہ ۳۸،

^{۱۵} عبس ۳۷-۳۴، شعراء ۸۸، معارج ۱۰، لقمان ۳۳،

^{۱۶} بقرہ ۱۶۶، مومنون-آیت ۱۰۱،

^{۱۷} زخرف ۶۷،

^{۱۸} انعام ۳۱، مریم ۳۹، یونس ۵۴،

خدا کی عدالت میں حاضری ہوگی، اور سارے بندوں کے اعمال حاضر کئے جائیں گے^۱ اور نامہ اعمال تقسیم کیا جائے گا^۲ اور ہر نیک بد کام کی نسبت اس کے فاعل کی طرف اتنی واضح اور روشن ہوگی کہ کسی سے پوچھنے کی ضرورت نہیں ہوگی، کہ تم نے کیا کیا ہے؟^۳ داد گاہ (عدالت) میں فرشتے پیغمبران الہی اور خدا کے منتخب بندے گواہوں کے عنوان سے حاضر ہوں گے^۴ یہاں تک کہ انسان کے ہاتھ پیر اور بدن کی کھال تک اس کے خلاف گواہی دے گی^۵ اور سارے انسانوں کے حساب و کتاب میں بہت دقت اور غور سے کام لیا جائے گا، اور خدا کی میزان پر تول جائے گا^۶ اور پھر عدل و انصاف کی بنیاد پر ان کے درمیان فیصلہ کیا جائے گا اور ہر ایک کو اس کی محتویات کا پھل ملے گا^۷ نیک کام کرنے والوں کو دس گنا انعام دیا جائیگا^۸ اور کوئی بھی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا۔ لیکن جن لوگوں نے دوسروں کو گمراہ کیا ہے وہ اپنے گناہوں کے علاوہ گمراہ ہونے والے افراد کے گناہوں کو بھی اپنے دوش پر اٹھائیں گے^۹ (بغیر اس کے کہ ان کے گناہوں میں کچھ کمی کی جائے) اسی طرح کسی سے بھی کسی چیز کا عوض اور بدلہ قبول نہیں کیا جائیگا^{۱۰} کسی کی سفارش قبول نہیں ہوگی^{۱۱} مگر ان لوگوں کی شفاعت قبول ہوگی، جنکو خدا کی طرف سے اجازت دی گئی ہے اور وہ لوگ خدا کی مرضی اور معیار کے مطابق شفاعت کریں گے^{۱۲}

ابدی ٹھکانے کی طرف روانگی اسکے فوراً بعد خدا کے حکم کا اعلان کیا جائے گا^{۱۳} نیک کام کرنے والے اور گنہگار ایک دوسرے سے جد ہو جائیں گے^{۱۴} اور مومنین سرخرو، شاداب اور مسرتوں میں ڈوبے ہوئے جنت کی طرف^{۱۵} اور کفار منافقین

^۱ آل عمران ۳۰، تکویر ۱۴، اسراء ۴۹،

^۲ بنی اسرائیل ۱۳-۱۷، الحاقہ ۱۹-۲۵، انشقاق ۱۰۷،

^۳ رحمن ۳۹،

^۴ زمر ۶۹، بقرہ ۱۴۳، آل عمران ۱۴، نساء ۶۹، ہود ۱۸، حج ۷۸، قہر ۲۱، نحل ۸۴-۸۹،

^۵ نور ۲۴، یس ۶۵، فصلت ۲۰-۲۱،

^۶ اعراف ۹-۸، انبیاء ۴۷، مومنوں ۱۰۲-۱۰۳، قارعہ ۸-۶،

^۷ یونس ۹۳-۵۴، جا ثیہ ۱۷، نحل ۷۸، زمر ۶۹-۷۵،

^۸ النجم ۴۰-۴۱، بقرہ ۲۸، ۲۸۶، آل عمران ۲۵-۱۶۱، انعام ۷۰، ہود ۱۱۱، ابراہیم ۵۱،

^۹ انعام ۱۶۰،

^{۱۰} النجم ۳۹، انعام ۴۶، فاطر ۱۸، زمر ۷،

^{۱۱} نحل ۲۵، عنکبوت ۱۳، یہاں پر یہ تصور کیا جا سکتا ہے کہ جو لوگ دوسروں کی بدایت کا سبب بنتے ہیں دو گنا

ثواب پائیں گے جیسا کہ روایات میں صاف واضح ہے۔

^{۱۲} بقرہ ۴۸، ۱۳۲، آل عمران ۹۱، لقمان ۳۳، مائدہ ۳۶، حدید ۱۵،

^{۱۳} بقرہ ۴۸، ۱۲۳، ۲۵۴، مدثر ۴۸،

^{۱۴} انبیاء ۲۸، بقرہ ۲۵۵، یونس ۳، مریم ۸۷، طہ ۱۰۹، سبا ۳۳، زخرف ۸۶، نجم ۲۶،

^{۱۵} اعراف ۴۴،

جسکے چہرے یا ہ ہو گئے ہوں گے غمگین و پریشان ذلت و خواری کے ساتھ جہنم کی طرف روانہ ہوں گے^۱ اور سب کے سب جہنم سے ہو کر گذریں^۲ اس حالت میں کہ مومنوں کے چہرے سے نور برس رہا ہوگا اور ان کے راستے روشن ہوں گے^۳ اور کفار و منافقین اندھیرے میں پھنسے ہوڈ گئے اور منافقین جو اس دنیا میں مومنین کے ساتھ گھلے رہتے تھے مومنین کو آواز دیں گے کہ ہا ری طرف اپنا چہرہ گھا و تاکہ تمہارے نور سے فائدہ اٹھائیں تو اس وقت وہ جواب سنیں گے کہ اس نور کو پانے کے لئے پیچھے پاؤں (دنیا میں) پلٹ جاؤ! پھر وہ منافقین اور کفار کہیں گے کہ کیا بھول گئے کیا تمہارے ساتھ اس دنیا میں نہیں تھے؟ پھر جو اب پائیں گے کیوں نہیں ظاہر ا ہا رہے ہی ساتھ تھے لیکن تم نے خود کو گر خا کر لیا تمہارے دل میں شک پیدا ہو گیا اور تم سنگدل ہو گئے اور آج تمہارا فیصلہ ہو گیا آج تم سے اور کافروں سے کوئی قبول نہیں کیا جائیگا اور آخر کار کفار و منافقین کو جہنم کے منہ میں جھونک دیا جائے گا^۴

جس وقت مومنین جنت کے نزدیک پہنچیں گے تو اس کا دروازہ کھول دیا جائیگا اور رحمت کے فرشتے ان کا استقبال کریں گے، سلام و احترام کے ساتھ ان کو ابدی سعادت کی خوش خبری سنائیں گے،^۵ اور دوسری طرف جب کفار و منافقین جہنم کے نزدیک پہنچیں گے تو اس کا دروازہ کھل جائیگا اور عذاب کے فرشتے سختی سے ان کی مذمت کریں گے اور ان کو ابدی عذاب کی خبر دیں گے^۶

^۱ انفال ۳۷، روم ۱۴، ۱۶، ۴۳، ۴۴، شوریٰ ۷، ہود ۱۰۵، ۱۰۸، یس ۵۹
^۲ زمر ۷۳، آل عمر ان ۱۰۷، مریم ۸۵، قیامت ۴۲، ۲۴، مطففین ۲۴، غاشیہ ۸، عبس ۳۸-۳۹
^۳ زمر ۶۰-۷۱، آل عمر ان ۱۰۶، انعام ۱۲۴، یونس ۲۷، مریم ۸۶، طہ ۱۰۱، ۱۲۶، ۱۲۴، ابراہیم ۴۳، قمر ۸، معارج ۴۴، غا
^۴ شبیہ ۲، اسراء ۷۲، ۹۷، عبس ۴۰، ۴۱
^۵ مریم ۷۱، ۷۲
^۶ حدید ۱۲
^۷ حدید ۱۵، ۱۳، نساء ۱۴۰
^۸ زمر ۷۳، رعد ۲۴، ۲۲
^۹ زمر ۷۱، ۷۲، تحریم ۶، انبیاء ۱۰۳

جنت

بہشت میں آسمانوں اور زمینوں کی وسعت کے برابر لمبے چوڑے باغات ہونگے اہر قسم کے پھلوں سے لدے ہوئے طرح طرح کے درخت جو ہر وقت انسان کی دسترس میں ہوں گے^۱ اور عظیم و خوبصورت مکانات ہونگے اور صاف و شفاف پانی کی نہریں اور چشمے ہونگے^۲ نیز دودھ و شہد اور پاک و پاکیزہ، طیب و طاہر شراب^۳ اور ہر وہ چیز جس کا دل چاہے یا بہشتیوں کو ضرورت محسوس ہو وہ موجود ہوگی^۴ اور ان کی خواہشات سے زیادہ چیزیں موجود ہوں گی^۵ اور بہشتی لوگ وہاں ریشم کے نرم و نازک لباس میں ملبوس اور مختلف قسم کی زینتوں سے آراستہ ہوں گے^۶ اور سجے ہوئے تخت پر نرم و لطیف بستر پر ٹیک لگائے ایک دوسرے کے سامنے بیٹھے ہوئے خدا کی حمد و ثنا میں مشغول ہونگے^۷ اور کوئی بھی غلط بات نہ تو زبان پر جاری کریں گے اور نہ ہی کانوں سے سنیں گے^۸ نہ ٹھنڈک ان کو تکلیف پہنچائے گی اور نہ گرمی کا احساس ان کو اذیت دے گا^۹۔

اور نہ تو کسی طرح کا رنج و ملال اور نہ ہی ٹھکن کا احساس ہوگا^{۱۰} اور نہ تو کوئی غم ہوگا اور نہ ہی کوئی خوف^{۱۱} اور نہ کسی کے دل میں کوئی کینہ ہوگا نہ دشمنی^{۱۲} حسین و جمیل خدمت گزار ان کے چاروں طرف ٹہلتے ہوں گے^{۱۳} اور جنتی شراب کا جام ان کو پلا رہے ہوں گے کہ جس کی لذت و نشاط قابل توصیف نہیں ہے، اور کسی طرح کا نقصان نہ ہوگا^{۱۴} کئی قسم کے پھل اور پرندوں کے گوشت نوش

^۱ آل عمران ۱۳۳، حدید ۲۱،

^۲ الحاقہ ۲۳، دہر ۱۸۰۶، ۲۱، مطفین ۲۸،

^۳ بقرہ ۲۵، آل عمران ۱۵، اور دسیوں دوسری آیتیں

^۴ محمد ﷺ ۱۵، دہر ۱۸۰۶، ۲۱، مطفین ۲۸،

^۵ نحل ۳۱، فرقان ۱۶، زمر ۳۴، فصلت ۳۱، شوریٰ ۲۲، زخرف ۷۰، ۷۱، ق ۳۵،

^۶ قہ ۳۵،

^۷ کہف ۳۱، حج ۲۳، فاطر ۳۳، دخان ۵۳، دہر ۲۱، اعراف ۳۲،

^۸ اعراف ۴۳، یونس ۱۰، فاطر ۳۴، زمر ۷۴،

^۹ مریم ۶۲، نباء ۳۵، غاشیہ ۱۱،

^{۱۰} الدھر ۱۳،

^{۱۱} مریم ۶۲، نباء ۳۵، غاشیہ ۱۱،

^{۱۲} اعراف ۳۵، حجر ۴۸،

^{۱۳} اعراف ۴۳، حجر ۴۷،

^{۱۴} طور ۲۴، واقعہ ۱۷، دہر ۱۹،

^{۱۵} صافات ۴۵-۴۷، طور ۵۱، زخرف ۲۳، واقعہ ۱۹-۱۸، دہر ۱۵-۱۴، ۱۹، نباء ۳۴، مطفین ۲۵، ۲۸،

فرما رہے ہوں گے^۱ اور خوبصورت و مہربان نیز پاکدامن شریک حیات اور ساتھیوں سے لطف اندوز ہونگے^۲ اور ہر چیز سے بڑھ کر رضا نے پروردگار کی روحانی نعمت سے سرفراز ہونگے^۳ اور خدا کی ایسی مہربانی ان کے شامل حال ہوگی جو انہیں خوشیوں میں غرق کر دیگی اور کوئی بھی خوشیوں کے اس مرتبے کو تصور بھی نہیں کر سکتا^۴ اور یہ بے نظیر سعادت اور ناقابل توصیف نعمتیں اور خدا کی رحمت، رضا و خوشنودی ہمیشہ ہمیشہ ان کے ساتھ رہے گی^۵ جو کبھی ختم ہونے والی نہیں ہے^۶

جنم

جنم ان کافروں اور منافقوں کا ٹھکانہ ہے جن کے دلوں میں ایمان کا نور بالکل نہیں پایا جاتا، اور جنم کے اندر اتنی وسعت اور گنجائش پائی جاتی ہے کہ سارے گناہ گاروں کو اپنے اندر بھر لینے کے بعد بھی (مل من مزید) (کیا کوئی اور بھی ہے) کی آواز بلند کریگا^۸ اس میں صرف آگ ہے اور بس، عذاب ہے اور بس!! چاروں طرف اس کے شعلے بلند ہونگے اور کانون کو پھاڑ دینے والی غصہ سے بھری آوازیں خوف و اضطراب میں اضافہ کریں گی^۹ وہاں لوگوں کے چہرے سکڑے ہوئے۔

سیاہ، کریہ المظہر، اور جھریوں سے بھرے ہوں گے ایساں تک کہ دوزخ کے فرشتوں کے چہرے پر بھی مہربانی، محبت اور نرمی کے آثار نہیں دکھائی دیں گے^{۱۰} "جنم کے لوگ لوہے کے طوق و سلاسل نیز ہتھکڑیوں سیڑیوں سے باندھے جائیں گے^{۱۱}، اور آگ

^۱ ص ۵۱ طور ۲۲ رحمٰن ۵۲، ۶۸، واقعہ ۲۰-۲۱، مرسلات ۴۲، نیا ۳۲

^۲ بقرہ ۲۵ آل عمران ۱۵، نساء ۵۷ صافات ۴۸-۴۹ ص ۵۲ زخرف ۷۰ دخان ۵۴ طور ۲۰ رحمٰن ۵۶، ۷۰، ۷۴ واقعہ ۲۲-۲۳، ۳۴، ۳۷، نیا ۳۳

^۳ آل عمران ۱۵، توبہ ۷۲، ۷۱، حدید ۲۰، مائدہ ۱۱۹ مجادلہ ۲۹ بینہ ۸

^۴ سجدہ ۱۷

^۵ بقرہ ۲۵ آل عمران ۱۰۷، ۳۶، ۱۹۸، نساء ۱۳، ۵۷، ۱۲۲، مائدہ ۸۵، ۱۱۹، اعراف ۴۲، توبہ ۸۹، ۷۲، ۲۲، ۱۰۰، یونس ۸۲، ۲۶، ہود ۲۳، ۱۰۸، ابراہیم ۲۳، حجر ۴۸، کہف ۳، ۱۰۸، طہ ۷۶ انبیاء ۱۰۲، مؤمنون ۱۱ فرقان ۱۶، ۷۶، عنکبوت ۵۸، لقمان ۹، زمر ۷۳، زخرف ۷۱، احقاف ۱۴، قہ ۳۴، فتح ۵، حدید ۱۲، مجادلہ ۲۲، تغابن ۹ طلاقہ ۱۱، بینہ ۸،

^۶ دخان ۵۶، فصلت ۸، انشقاق ۲۵، تین ۶،

^۷ نساء ۱۴۰، اور دوسری دسیوں آیتیں۔

^۸ قہ ۳۰،

^۹ ہود ۱۰۶، انبیاء ۱۰۰، فرقان ۱۲، ملک ۷، ۸،

^{۱۰} آل عمران ۱۰۶، ملک ۲۷، مؤمنون ۱۰۴، زمر ۶۰

^{۱۱} تحریم ۹۱،

^{۱۲} رعد ۵، ابراہیم ۴۹، صبا ۳۳، غافر ۷۲، ۷۱، الحاقہ ۳۲، دھر ۴،

انہیں سر سے پیر تک اپنے قصے میں لئے ہوگی^۱ اور خود وہی لوگ آگ بنانے والے ہوں گے^۲ جہنم کی فضا میں سوائے آہ و فغاں، فریاد و بکا اور نالہ و شیون اور جہنم کے اوپر تعینات فرشتوں کی خوفناک اور گرجدار آواز کے اور کچھ سنائی نہیں دیگا^۳ اور گنگھا روں کے اوپر کھولتا ہوا گرم پانی انڈیلا جائے گا، جو ان کو اندر سے پگھلا دیگا^۴ اور جب کبھی گرمی اور پیاس کی شدت کی وجہ سے پانی کی درخواست کریں گے تو انہیں گرم جلتا ہوا اور نجس و بدبودار پانی دیا جائے گا، جسے وہ لوگ بہت ہی شوق سے پیئیں گے^۵ اور ان لوگوں کی غذا درخت (زقوم) ہے جو آگ سے اگتا ہے جس کو کھانے سے اندرونی سوزش و جلن میں اضافہ ہو جا یگا^۶ اور ان کا لباس ایک سیاہ اور چمکنے والے مادے سے بنا ہوا ہوگا جو ان کے لئے ایک عذاب کا باعث ہوگا^۷ اور شیا طین و جنات کے گنگھا رہ بھی ان کی ہم نشینی سے دور بھاگیں گے^۸ اور ایک دوسرے پر لعنت بھیجیں گے اور مذمت کریں گے^۹ اور جس وقت وہ لوگ خدا کی بارگاہ میں معذرت خواہی کے لئے اپنی زبان کھولیں گے۔

اس وقت دور ہو جاؤ خاموش ہو جاؤ ایسے الفاظ سے انہیں خاموش کر دیا جائے گا^{۱۰} پھر وہ لوگ جہنم کے دربان کے پاس پناہ لیں گے، اور ان سے درخواست کریں گے کہ تم ہی خدا سے ہمارے عذاب میں کمی کے لئے سفارش کرو، تو وہ جواب پائیں گے کہ کیا خداوند عالم نے اپنے پیغمبروں کو مبعوث نہیں کیا تھا، اور تمہارے اوپر اس نے اپنی حجت تمام نہیں کی تھی^{۱۱}؟

^۱ ابراہیم ۵۰، فرقان ۱۳، انبیاء ۹۸، جن ۱۵، تحریم ۶
^۲ بقرہ ۲۴، آل عمران ۱۰، انبیاء ۹۸، جن ۱۵، تحریم ۶

^۳ فرقان ۱۳، ۱۴، انشقاق ۱۱،
^۴ حج ۲۰، ۱۹، دخان ۴۸،

^۵ انعام ۷۰، یونس ۴، کہف ۲۹، واقعہ ۴۲، ۴۴، ۵۵، محمد ﷺ ۱۵
^۶ صافات ۶۲، ۶۶، ص ۵۷، دخان ۴۵، ۴۶، واقعہ ۵۲، ۵۳، نباء ۲۵، غاشیہ ۶، ۷،

^۷ ابراہیم ۱۷، طہ ۷۴، فاطر ۳۶
^۸ زخرف ۳۸-۳۹، شعراء ۹۵-۹۴، ص ۸۵،

^۹ اعراف ۳۸-۳۹، عنکبوت ۲۵، مرسلات ۳۵-۳۶،
^{۱۰} مومن ۱۰۸، روم ۵۷، غافر ۵۲، مرسلات ۳۵-۳۶

^{۱۱} غافر ۵۰-۵۱، ۸

دوبارہ مرنے کی تمنا کریں گے اور جواب پائیں گے کہ اب تم ہمیشہ اسی جہنم میں رہو گے^۱ اگرچہ موت انکے اوپر چاروں طرف سے برس رہی ہوگی مگر اس کے باوجود نہیں مریں گے^۲ اور انکے بدن کی جتنی کھال آگ میں جلتی جائیں گی اتنی ہی نئی کھال اگتی جائیں گی^۳ اور ان پر عذاب ہوتا رہے گا۔ بہشتیوں سے تھوڑے کھانے پانی کی بھیک مانگیں گے تو جواب سنیں گے کہ خدا نے بہشتی نعمتوں کو تمہارے اوپر حرام کر دیا ہے^۴ اور بہشتی لوگ ان سے پوچھیں گے کہ کونسی چیز تمہاری بد بختی کا سبب ہے اور تمہیں جہنم میں کھینچ لائی ہے؟ تو لوگ کہیں گے کہ ہم نمازیوں اور خدا کے عبادت گزار بندوں میں سے نہیں تھے اور غریبوں کی مدد نہیں کرتے تھے اور فدا دیوں کے ساتھ مل کر رہتے تھے اور روز قیامت کو جھٹلاتے تھے^۵ اس وقت آپس میں ایک دوسرے سے الجھ جائیں گے، اور لڑنے لگیں گے گمراہ ہونے والے گمراہ کرنے والوں سے کہیں گے کہ تم ہی لوگوں نے ہمیں گمراہ کیا ہے وہ لوگ جواب دیں گے کہ تم لوگوں نے اپنی رضا اور خواہش سے ہماری پیروی کی ہے، بچے کام کرنے والے اپنے اوپر کام کرنے والے (رعایا اپنے حاکم یا ارباب) سے کہیں گے کہ تم ہی نے ہمیں اس سختی تک پہنچایا ہے وہ جواب دیں گے کہ کیا ہم نے زبردستی اور جبراً تم کو راہ راست سے روکا تھا^۶

بالآخر وہ لوگ شیطان سے کہیں گے کہ ہم لوگوں کی گمراہی کا سبب بنا ہے تو وہ جواب دے گا کہ خدا نے تم سے سچا وعدہ کیا لیکن تم لوگوں نے قبول نہیں کیا اور میں نے جھوٹا وعدہ کیا تو تم نے قبول کر لیا، لہذا میری مذمت کے بجائے خود اپنی مذمت کرو، اور

^۱ زخرف ۷۷،

^۲ ابراہیم ۱۷، طہ ۷۴، فاطر ۳۶،

^۳ نساء ۵۶،

^۴ اعراف ۵۰،

^۵ مدثر ۴۷، ۳۹،

^۶ ص ۵۹، ۶۴،

^۷ اعراف ۳۸، ۳۹، صافات ۲۷، ۳۳،

^۸ ابراہیم ۲۱، سباء ۳۱، ۳۳،

آج ہم میں سے کوئی بھی ایک دوسرے کی مدد نہیں کر سکتا لہذا اپنی نافرمانی اور کفر کی سزا بھگتنے کے اور کوئی چارہ نہیں ہے لہذا ہمیشہ ہمیشہ عذاب میں مبتلا رہیں گے^۲

سوالات

- ۱۔ قیامت کے وقت زمین و آسمان کی کیفیت کو تفصیل سے بیان کیجیے؟
- ۲۔ قیامت کے آغاز کی کیفیت اور اس کے اوصاف کو بیان کریں؟
- ۳۔ الٰہی عدالت کے محکمہ (مقدمہ) کی شرح و تفصیل پیش کریں؟
- ۴۔ مومنین اور کفار کے متعلق ابدی ٹھکانوں کی طرف روانگی کی وضاحت کیجئے؟
- ۵۔ بہشتی نعمتوں کو تفصیل سے بیان کیجئے؟
- ۶۔ جہنم اور جہنمیوں کی کیفیت اور حالت کو تحریر کریں؟
- ۷۔ جہنمیوں کی گفتگو کو تفصیل سے بیان کیجئے؟

^۱ ابر الہیم ۲۲،

^۲ بقرہ ۳۹، ۸۱، ۱۶۲، ۲۷۵، ۲۵۷، ۲۱۷، آل عمران ۸۸، ۱۱۶، نساء ۱۶۹، مائدہ ۳۷، ۸۰ انعام ۱۲۸، اعراف ۳۶، تو بہ ۱۷، ۶۳، ۸، یونس ۲۷، ۵۲، ہود ۱۰۷، رعد ۵، نحل ۲۹، کہف ۱۰۸، طہ ۱۰۱، سجدہ ۲۰، مومنون ۱۰۳، احزاب ۶۵، زمر ۷۲، غافر ۷۶، زخرف ۷۴، مجادلہ ۱۷، تغابن ۱۰، جن ۲۳، بینہ ۶

ایکاد نواں درس

دنیا کا آخرت سے مقابلہ

مقدمہ

ہم نے عالم آخرت کے بارے میں عقل اور نقل (آیات و روایات) کے ذریعہ جو معلومات حاصل کی ہیں، اس کی روشنی میں دنیا و آخرت کے درمیان مختلف زاویہ سے تقابل کر سکتے ہیں، خوش قسمتی سے یہ تقابل (موازنہ) خود قرآن مجید کے اندر موجود ہے اور ہم قرآنی بیانات کے ذریعہ دنیا و آخرت کو صحیح طریقہ سے تصور کر سکتے ہیں۔ دنیا کا فانی ہونا اور آخرت کا ابدی ہونا (ہمیشہ باقی رہنا) دنیا و آخرت کے درمیان سب سے پہلا اور واضح ترین اختلاف دنیاوی زندگی کا محدود ہونا اور اخروی زندگی کا ہمیشہ باقی رہنا ہے، ہر انسان کی عمر کے لئے اس دنیا میں ایک حد معین ہے کہ حد تک ہر ایک کو جلد یا دیر پہنچنا ہے حتیٰ کہ اگر کوئی شخص یکڑوں یا ہزاروں سال بھی اس دنیا میں زندگی بسر کر لے بالآخر اس کو ایک روز اس مادی عالم کے تغیر کے ساتھ کہ جب پہلا صور پھونکا جائے گا ختم ہو جانا ہے، جیسا کہ گذشتہ درس میں بیان کیا جا چکا ہے۔

دوسری طرف قرآن مجید کی تقریباً اسی آیتیں آخرت کے ابدی ہونے پر دلالت کرتی ہیں اور ظاہر ہے کہ محدود چاہے جس قدر بھی طولانی مدت ہو لا محدود سے مقابلہ نہیں کر سکتا، صرف عالم آخرت بقا اور دوام کے لحاظ سے دنیا کے اوپر عظیم فضیلت کا حامل ہے اور یہ ایسا مطلب ہے جو مختلف آیتوں میں آخرت کو (۱) ابدی (۲) اور دنیاوی زندگی کو (۳) قلیل کے لفظ سے تعبیر کیا ہے اور دوسری آیتوں میں دنیاوی زندگی کو اس سبزہ سے تشبیہ دی گئی ہے جو چند روز سرسبز و شاداب رہنے کے بعد زردی کی طرف

^۱ بہشت میں دو رخ کی جاودانی اور خلود سے متعلق آیتوں کی طرف رجوع کریں
^۲ کہف، ۴۶، مریم، ۷۶، طہ، ۱۳۱، قصص، ۶۰، شوری، ۳۶، غافر، ۳۹، اعلیٰ، ۱۷
^۳ آل عمران، ۱۹۷، نساء، ۷۷، تو بہ، ۳۸، نمل، ۱۱۷،

مائل ہوتا ہے اور پھر (پژمردگی) مکلاہٹ شروع ہو جاتی ہے اور آخرت میں بالکل خشک ہو کر ختم ہو جاتا ہے^۱ اور خداوند عالم ایک آیت میں مکی طور سے ارشاد فرماتا ہے کہ صرف وہ شی جو خدا کے نزدیک ہے ہمیشہ باقی رہنے والی ہے^۲

آخرت میں نعمت اور عذاب کے مابین جدائی

دنیا اور آخرت کی زندگی میں ایک دوسرا بنیادی فرق یہ ہے کہ دنیا کی زندگی اور اسکی تمام خوشیاں رنج و مشکلات کے ساتھ ملی جلی ہیں اور ایسا ہرگز نہیں ہے کہ کچھ لوگ ہمیشہ ہر لحاظ سے خوشحال بے فکر، اور آسودہ خاطر ہوں گے اور کچھ افراد ہمیشہ عذاب اور پریشا نیوں میں مبتلا ہوں گے اور غم و مصیبت سے ودچار ہوں گے بلکہ تقریباً سارے لوگ ہر طرح کی خوشیوں، لذتوں اور عیش و آرام سے مالا مال بھی ہیں اور ساتھ ہی ساتھ رنج و مصیبت اور غم و غصہ سے بھی دست و گریباں ہیں۔

لیکن عالم آخرت کے دو الگ الگ حصے (جنت و جہنم) پائے جاتے ہیں، جس میں سے پہلا حصہ وہ ہے کہ جس میں کسی قسم کی کوئی پریشانی عذاب، خوف اور غم کا شائبہ بھی نہیں پایا جاتا، جب کہ دوسرے حصے میں آگ، درد مصیبت، حیرت و یاس اور غم کے علاوہ کچھ اور ہاتھ آنے والا نہیں ہے کہ جو دنیاوی لذت کا اثر ہے۔ یہ تقابل بھی خود قرآن مجید کے اندر پایا جاتا ہے اور آخرت کی نعمتوں اور تقرب پروردگار کی برتری کو دنیاوی نعمتوں کے اوپر صاف لفظوں میں بیان کیا گیا ہے^۳ جس طرح آخرت کے عذاب کو دنیاوی مشکلات اور مصیبتوں سے سخت تر بیان کیا گیا ہے^۴

آخرت کا اصل ہونا

دنیا و آخرت کے درمیان ایک اہم فرق یہ ہے کہ دنیاوی زندگی آخرت کے لئے مقدمہ ہے اور ابدی سعادت کو حاصل کرنے کا

^۱ یونس ۲۴، کہف ۴۵، ۴۶، حدید ۲۰، نمل ۹۶،

^۲ آل عمران ۱۵، نساء ۷۷، انعام ۳۲، اعراف ۳۲، یوسف ۱۰۹، نحل ۳۰، کہف ۴۶، مریم ۷۶، طہ ۷۳، ۱۳۱، قصص ۶۰، وری ۳۶، اعلیٰ ۱۷،

^۳ آل عمران ۱۵، نساء ۷۷، انعام ۳۲، اعراف ۳۲، یوسف ۱۰۹، نحل ۳۰، کہف ۴۶، مریم ۷۶، طہ ۷۳، ۱۳۱، قصص ۶۰، شور ۳۶، اعلیٰ ۱۷،

^۴ زمر ۲۶، فصلت ۱۶، قلم ۳۳، غاشیہ ۲۴،

ذریعہ ہے اور آخرت کی زندگی آخری اور اصل زندگی ہے، اگرچہ دنیوی حیات اور اس کی مادی و معنوی نعمتیں انسان کو بہت پسند میں، لیکن اس کے باوجود کہ یہ ساری نعمتیں صرف امتحان کا ذریعہ ہیں اور حقیقی ثنوںما اور ترقی نیز ابدی سعادت کو حاصل کرنے کے لئے ایک وسیلہ ہے لہذا اصل نہیں ہو سکتی اور اس کی واقعی قدر و قیمت ایک زاد راہ اور توشہ کی سی ہے جو انسان اپنی ابدی زندگی کے لئے آمادہ کرتا ہے اس لئے اگر کوئی شخص آخرت کو فراموش کر کے دنیا کے صن و جمال میں گرفتار ہو جائے، اور اس کی لذتوں کو اپنا آخری مقصد سمجھ بیٹھے تو گویا وہ اس کی واقعی قدر و قیمت کو نہیں پہچان سکا۔

اور اس کے لئے فرضی اہمیت کا قائل ہو گیا کیونکہ اس نے وسیلہ کو مقصد سمجھ لیا ہے اگر ایسا ہے تو سوائے فریب اور کھیل اور مشغولیت کے اور کچھ نہیں ہے، اسے لئے قرآن مجید نے دنیا کی زندگی کو کھیل مشغولیت اور وسیلہ فریب کے نام سے یاد کیا ہے^۲ اور آخرت کی زندگی کو ایک حقیقی حیات جانا ہے۔

لیکن توجہ کا مقام ہے کہ وہ تمام مذمتیں جو دنیا کے سلسلے میں بیان کی گئی ہیں وہ دنیا طلب انسانوں اور اس کو هدف و مقصد بنا کے زندگی گزارنے والوں سے متعلق ہیں، ورنہ زندگی دنیا کا فی دنیا خدا کے ان نیک بندوں کے لئے جو اس کی حقیقت کو پہچانتے ہیں، اور اس کو ایک وسیلہ کی حیثیت سے دیکھتے ہیں، اور اپنی زندگی کے تمام لمحات ابدی سعادت کے حصول میں صرف کرتے ہیں نہ صرف یہ کہ ان کی مذمت نہیں کی گئی، بلکہ وہ غیر معمولی قدر و قیمت کے مالک ہیں۔

دنیاوی زندگی کو انتخاب کرنے کا نتیجہ

عالم آخرت کی فضیلت اور غیر قابل توصیف بہشتی نعمتوں اور خدا کی مرضی و خوشنودی کو دنیاوی لذتوں کے اوپر ترجیح دینے میں

^۱ قصص ۷۷

^۲ آل عمران ۱۸۵، عنکبوت ۶۴، محمد ۳۶، حدید ۲۰،

^۳ عنکبوت ۶۴، فجر ۲۴،

کسی بھی شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہے لہذا دنیاوی زندگی کو انتخاب کرنا، اور اس کو آخرت کے اوپر ترجیح دینا، ایک غیر حکیمانہ اقدام ہے کہ جس کا نتیجہ حسرت اور شرمندگی کے علاوہ کچھ اور نہیں ہے لہذا اس کو انتخاب کرنا اور اس کی لذتوں پر دل و جان سے قربان ہو جانا نہ یہ کہ صرف ابدی سعادت سے محرومی کا سبب ہے بلکہ ہمیشہ کی بد بختی کا بہت بڑا ذریعہ بھی ہے۔ وضاحت۔ یہ کہ اگر انسان ابدی سعادت کے بجائے دنیا کی جلد گزر جانے والی لذتوں کا انتخاب کرے اس طرح کہ اس کی اخروی زندگی کا کوئی نقصان نہ ہو تو ایسا اقدام اخروی سعادت کے غیر معمولی رجحان کو دیکھتے ہوئے ایک غیر عاقلانہ کام ہے۔

لیکن کیا کیا جائے کہ کسی کو بھی عالم ابدیت سے مفر نہیں ہے اور وہ کہ جس نے اپنی ساری قوتوں کو دنیا کی زندگی کے اوپر صرف کر دے اور عالم آخرت کو بھلا بیٹھے یا بالکل سرے سے اس کا انکار کر دے تو نہ صرف یہ ہے کہ ہمیشی نعمتوں سے محروم ہو گیا۔

بلکہ ہمیشہ کے لئے جہنم کے عذاب میں گرفتار ہو جائے گا، اور اس کا دو گنا نقصان ہو گا اسی لئے قرآن مجید ایک طرف تو آخرت کی نعمتوں کی برتری اور فضیلت کو گوش گزار اور ہوشیار کر رہا ہے کہ خبردار کہیں ایسا نہ ہو کہ دنیاوی زندگی تم کو دھوکا دیدے اور دوسری طرف دنیا سے قلبی لگاؤ اور آخرت کو بھول جانے، جہان ابدی سے انکار یا اس کے بارے میں شک و شبہ کے نقصانناک کو گنوارہا ہے اور اس بات کی تاکید کر رہا ہے کہ ایسے امور ہمیشہ کی ثقافت اور بد بختی کا سبب ہیں اور ایسا بھی نہیں ہے کہ دنیا کو ترجیح دینے والا صرف آخرت کی جزا سے محروم رہے گا بلکہ ہمیشہ کی سزا اس کا مقدر بن جائے گی^۱۔

اور اس کا راز و سبب یہ ہے کہ دنیا پرست انسان نے خدا کی دی ہوئی صلاحیتوں کو ضائع کر دیا اور وہ درخت جو ابدی سعادت کا پھل دینے والا تھا اسکو خشک و بے پھل کر دیا، اور اس نے حقیقی نعمت عطا کرنے والے (خدا) کے حق کا لحاظ نہیں کیا، اور

^۱ اعلیٰ ۱۶، فجر ۲۴، ہود ۲۲، کہف ۱۰۴، ۱۰۵، نمل ۴۵،

^۲ ہود ۲۲، کہف ۱۰۲ - ۱۰۵، نمل ۴-۵

^۳ بقرہ ۱۰۲، ۲۰۰، توبہ ۳۸، روم ۳۳، فاطر ۵، شور ۲۰، زخرف ۳۴، ۳۵،

^۴ اسراء ۱۰، بقرہ ۸۶، انعام ۱۳۰، یونس ۷، ۸، ہود ۱۵، ۱۶، ابراہیم ۳، نحل ۲۲، ۱۰۷، مؤمنون ۷۴، نمل ۴۵، ۶۶، روم ۷، لقمان ۴، سبأ ۸، ۲۱، زمر ۴۵، فصلت ۷، نازعات ۳۸، ۳۹،

اس کی دی ہوئی نعمتوں کو اس کی مرضی کے خلاف استعمال کیا اور ایسا شخص جب اپنے بڑے انتخاب کے نتیجے کو دیکھے گا تو یہ آرزو کرے گا کہ اے کاش میں مٹی ہو جاتا، اور ایسی بری عاقبت میں مبتلا نہ ہوتا۔

سوالات

- ۱۔ دنیا و آخرت کے درمیان کیا فرق ہے؟
- ۲۔ دنیا کی مذمت کیوں کی گئی ہے؟ وضاحت کیجئے؟
- ۳۔ دنیا سے لگاؤ کے کیا نقصانات ہیں؟
- ۴۔ آخرت پر ایمان نہ رکھنا ابدی عذاب کا سبب کیوں ہے؟

با و نواں درس

دنیا آخرت کی کھیتی ہے

مقدمہ

ہمیں یہ بات معلوم ہو چکی ہے کہ انسانی زندگی اس جلد گزر جانے والی دنیاوی حیات پر منحصر نہیں ہے، بلکہ دوبارہ عالم آخرت میں زندہ ہونا ہے اور وہاں ہمیشہ زندہ رہنا ہے اور ہم یہ بھی بیان کر چکے ہیں کہ آخرت کی زندگی ہی حقیقی حیات ہے، حد تو یہ ہے کہ دنیاوی زندگی کو خرومی حیات کے سامنے زندگی کہنا مناسب ہی نہیں ہے ایسا نہیں ہے کہ اخروی زندگی کا مطلب فطرت و بد ہونا یا ایک فرضی و خیالی امر ہونا ہے۔ اب وقت آگیا ہے کہ ہم دنیا و آخرت کی زندگی کے درمیان موجودہ رابطے کو بیان کرتے ہوئے اس کی نوعیت واضح کریں اگرچہ گذشتہ بحثوں میں کسی حد تک اس رابطہ کے بارے میں بیان کیا جا چکا ہے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مزید اور وضاحت کر دی جائے اور عقلی دلیلوں اور قرآنی بیانات کی روشنی میں دنیا و آخرت کے مابین رابطہ کو واضح کیا جائے۔

دنیا آخرت کی کھیتی ہے

یہاں پر سب سے پہلے جس بات کی تاکید کرنا ضروری ہے وہ یہ ہے کہ آخرت کی خوشنہی اور بد بختی دنیا میں انجام پانے والے انسانی رفتار و کردار کی تابع ہے اور ہرگز ایسا نہیں ہے کہ آخرت کی نعمتوں کو حاصل کرنے کے لئے آخرت ہی میں کوشش کرے، اور جس کے پاس جتنی زیادہ جہانی اور فکری قوت پائی جائے گی وہ اتنا ہی زیادہ نعمتوں سے سرفراز ہوگا یا فریب اور دھوکا، دھڑی کے ذریعہ دوسروں کی ایجادات سے غلط فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں جیسا کہ بعض نادان افراد کے ذہنوں میں یہ غلط تصور پایا جاتا ہے اور وہ آخرت کی زندگی کو دنیا سے بالکل علیحدہ اور مستقل تصور کرتے ہیں۔

قرآن کریم بعض کفار کے قول کو اس طرح نقل کر رہا ہے ^۱۔ (وَمَا أَظُنُّ النَّاعَةَ قَاعِمَةً وَلَ عَن رُّدْثِ إِلَىٰ رَبِّي لَأَجِدَنَّ خَيْرًا مِّنْهَا مُنْقَلَبًا) (دنیا پرست انسان نے کہا) کہ مجھے تو اس بات کا گمان بھی نہیں ہوتا کہ کبھی قیامت آئے گی اور اگر آج بھی گئی تو جب میں اپنے پرورگار کی طرف لوٹا یا جاؤں گا تو یقیناً اس دنیا سے کہیں بہتر پاؤں گا۔

اور دوسری جگہ ارشاد ہو رہا ہے۔ (وَمَا أَظُنُّ النَّاعَةَ قَاعِمَةً وَلَ عَن رُّجْعِ إِلَىٰ رَبِّي إِنْ لِّيَ عِنْدَهُ لِلْخُسْفَىٰ) قیامت کا آنا تو میرے وہم و گمان میں نہیں ہے لیکن اگر آگئی، تو جب میں اپنے رب کی طرف لوٹا یا جاؤں گا تو خدا کے نزدیک سب سے بہترین نعمتیں پاؤں گا ایسے لوگوں کا، یا تو یہ خیال تھا، کہ آخرت میں بھی سعی و کوشش کے ذریعہ نعمتوں کو حاصل کیا جاسکتا ہے یا تو یہ گمان تھا، کہ دنیا میں ان لوگوں کا مالدار ہونا، خدا کی جانب سے ایک خاص کرم اور احسان ہے پس آخرت میں بھی خدا کے یہ احسانات اور الطاف ان کے شامل حال ہوں گے۔

بہر حال اگر کوئی انسان آخرت کی زندگی کو دنیاوی زندگی سے بالکل الگ اور مستقل حیثیت جانتا ہے اور دنیا میں انجام دئے ہوئے نیک و بد اعمال کو آخرت کی نعمتوں اور عذاب کے اوپر موثر تصور کرتا ہے تو گویا، وہ قیامت پر جو آسمانی ادیان کے اعتقادی اصول میں سے ایک ہے ایمان نہیں رکھتا، کیونکہ اس اصل کا وجود دنیاوی اعمال کی جزا و سزا کے عنوان سے ہے اور یہی وجہ ہے کہ دنیا کو بازار، محل تجارت یا کھیتی کا نام دیا گیا ہے، یہی وہ جگہ ہے کہ جہاں انسان کام کرے، زراعت کرے، محنت و کوشش کرے تو اس کی درآمد (اس کا فائدہ) وہاں (قیامت میں) حاصل کرے گا ^۲ قیامت کے متعلق موجودہ دلیلیں اور قرآنی بیانات کا تقاضا بھی یہی ہے جس میں کسی قسم کی شرح و توضیح کی ضرورت نہیں ہے۔

^۱ کیف، ۳۶

^۲ فصلت، ۵۰،

^۳ قابل توجہ بات یہ ہے کہ قرآن مجید میں دنیاوی جزا اور سزا کا بھی ذکر موجود ہے لیکن مکمل جزا اور سزا آخرت سے مخصوص ہے

دنیا کی نعمتیں آخرت کی سعادت (خوشخبری) کا سبب نہیں

بعض دیگر افراد کا خیال یہ تھا کہ دنیا میں دولت، فرزند، اور دیگر تمام اسباب عیش و آرام آخرت میں بھی راحت و سکون کا باعث ہوں گے اور شاید یہی وجہ ہے کہ میت کے ہمراہ زرو جو اہر اور قیمتی موتیوں یہاں تک کہ خوردنوش کے سامان بھی دفن کر دیتے تھے، اور یہ غلط رسم اسی تصور کا نتیجہ تھی (ان سے مربوط رفتار سے قطع نظر) قرآن کریم اس بات کی تاکید کر رہا ہے مال و فرزند خود بخود (قطع نظر اس سے کہ اس کے اعمال کیسے ہیں؟) تقرب الہی کا ذریعہ نہیں بن سکتے اور نہ آخرت میں کسی کو نفع پہنچائیں گے^۱ اور بنیادی طور سے ایسے روابط اور اسباب کو ایک دن ختم ہونا ہے^۲ اور ہر انسان اپنا سرمایہ اور اپنے سے متعلق تمام اشیاء کو یہیں چھوڑ جائیگا^۳ اور بالکل تنہا خداوند عالم کی بارگاہ میں جائیگا^۴ اور صرف خدا سے معنوی روابط میں استحکام پایا جائیگا۔

اسی لئے صرف وہی مومنین جو اپنے شریک حیات، اولاد، اور قرابت داروں سے ایمانی رشتہ جوڑے ہوئے ہیں بہشت میں ایک ساتھ رہیں گے^۵۔ اس گفتگو کا حاصل یہ ہے کہ دنیا و آخرت کے مابین ارتباط دنیاوی موجودات کے درمیان پائے جانے والے تعلقات کی طرح نہیں ہیں اور ہرگز ایسا نہیں ہے کہ جو اس دنیا میں سب سے زیادہ قوی، حسین، خوشحال اور مالدار ہوگا، وہ آخرت میں بھی ویسا ہی محصور ہوگا ورنہ فرعون، قارون، وغیرہ آخرت میں زیادہ سعادت کے حق دار ہوں گے بلکہ ممکن ہے کہ وہ لوگ جو اس دنیا میں تنگ دستی ناتوانی اور رنج و مصبت کی زندگی گزار رہے ہیں وہ پروردگار عالم کے احکام پر عمل کرنے کے نتیجے میں بالکل سالم قوی اور حسین و جمیل محصور ہوں اور ابدی نعمتوں سے سرفراز ہوں۔ بعض نادان افراد کا خیال یہ ہے کہ آیہ شریفہ (وَمَنْ كَانَ فِي

^۱ سبأ، ۳۷،

^۲ شعراء، ۸۸، لقمان، ۳۳، آل عمران، ۱۰، ۱۱۶، مجادلہ، ۱۷،

^۳ بقرہ، ۱۶۶، مومنون، ۱۰۱،

^۴ انعام، ۹۴،

^۵ مریم، ۸۰، ۹۵،

^۶ رعد، ۳۳، غافر، ۸، طور، ۲۱،

^۷ اسراء، ۷۲، (جو اس دنیا میں اندھا ہو گا وہ آخرت میں اندھا اور گمراہ رہیگا)

براہ راست رابطہ پایا جاتا ہے درآن حالیکہ یہ لوگ اس بات سے غافل ہیں کہ اس آیت میں (اندھا) سے مراد ظاہری نابینا نہیں ہے بلکہ اس سے مراد دل کا اندھا ہونا ہے جیسا کہ دوسری آیت میں ارشاد ہوتا ہے: (فَانْهَآ لَا تَعْمٰی الْاَبْصَارُ وَلٰكِنْ تَعْمٰی الْقُلُوْبُ الَّتِیْ فِی الصُّدُوْرِ) آنکھیں اندھی نہیں ہوتیں بلکہ سینوں میں موجود دلوں میں اندھا پن پایا جاتا ہے، اور ایک دوسرے مقام پر اس طرح ارشاد ہے: (وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِکْرِیْ فَاِنَّ لَہٗ مِیْثَاقًا مَّضْمُوْمًا وَّشَحْرَہٗ یَوْمَ الْقِیَامَۃِ اَعْمٰی* قَالَ لَمْ یَشْرَ تَنِیْ اَعْمٰی وَتَدَّ کُنْثَ بَصِیْرًا* قَالَ کَذٰلِکَ اَشَکَّ اَیَّآتِ رَبِّکَ فَمِیْثَاقًا مَّضْمُوْمًا) جو میری یاد (کتاب) سے اعراض کریگا اس کو اپنی زندگی میں سختیوں پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑے گا اور ہم اسے قیامت میں اندھا محسوس کریں گے (کہنے والے نے کہا) مجھے اندھا کیوں محسوس کیا گیا باوجودیکہ میں مینا تھا خدا کیلک جس طرح میری نظائیں تجھ تک پہنچیں لیکن تونے اسے فراموش کر دیا اسی طرح آج تجھے بھلا دیا گیا پس دنیا و آخرت کا رابطہ اس رابطے سے جدا ہے جو دنیاوی سبب و مسبب (علت و معلول) کے درمیان ہوتا ہے۔

دنیا کی نعمتیں آخرت کی شقاوت (بد بختی) کا سبب بھی نہیں ہو سکتیں

دوسری طرف: بعض لوگوں کا گمان ہے کہ دنیا کی نعمتوں اور آخرت کی نعمتوں میں برعکس رابطہ برقرار ہے یعنی وہ لوگ آخرت کی سعادت تک پہنچ سکتے ہیں جنہوں نے دنیا کی نعمتوں سے کوئی سروکار نہیں رکھا ہے اور اس کے برعکس یعنی وہ لوگ جو دنیا کی لذتوں سے لطف اندوز ہیں وہ آخرت کی خوشبختی سے محروم رہیں گے اور (ان لوگوں نے اپنی بات کو ثابت کرنے کے لئے) آیات و روایات کا سہارا بھی لیا ہے جو اس امر پر دلالت کرتی ہے کہ دنیا پرستوں کے حصے میں آخرت کا کوئی حق نہیں ہے درآں حالیکہ یہ لوگ اس بات سے غافل ہیں^۱ (کہ یہ ان کے مدعی پر دلیل نہیں ہے) دنیا طلبی دنیا کی نعمتوں سے استفادہ کے معنی میں نہیں ہو سکتا بلکہ دنیا طلب وہ ہے جو دنیا کی لذتوں کو اپنا نصب العین بنالے اور اس کو حاصل کرنے کے لئے اپنی تمام صلاحیتوں کو بروئے کار لائے اگرچہ ممکن ہے اس تک نہ پہنچ سکے اور آخرت طلب وہ ہے جو دنیا کی سرمستیوں میں نہ کھو جائے بلکہ اس کا مقصد آخرت

^۱ حج، ۴۶

^۲ طہ، ۱۲۴-۱۲۶

^۳ بقرہ، ۲۰۰، آل عمران، ۷۷، اسراء، ۱۸، شوریٰ، ۲۰، احقاف، ۲۰،

کی خوشگوار زندگی ہو، اگرچہ ممکن ہے دنیاوی نعمتوں سے جی بھر کے فائدہ اٹھا چکا ہو جیسے حضرت سلیمان۔ اور دیگر بہت سارے انبیا کرام اور اولیاء خدا [ع] کہ جو دنیا کی بے پناہ نعمتوں سے مالا مال تھے لیکن ان نعمتوں کے ذریعہ آخرت کی سعادت اور تقرب الہی کو حاصل کرنے میں کوتاہاں رہے۔

بس دنیا و آخرت کی نعمتوں کے درمیان نہ ہی براہ راست رابطہ پایا جاتا ہے اور نہ ہی برعکس (بہ صورت منفی) بلکہ دنیا کی نعمتیں بھی اور مصیبتیں بھی خداوند متعال کی حکیمانہ تدبیر کی بنیاد پر انسانوں کے درمیان تقسیم کی گئی ہیں^۱ اور ساری چیزیں انسانوں کی آزمائش کا ذریعہ ہیں^۲ اور دنیا کی فانی نعمتوں سے دامن بھرا ہوا ہونا، یا اس سے محروم ہونا خود بخود رحمت الہی سے دوری یا نزدیکی کی علامت نہیں ہے اور سعادت (خوشبختی) یا شقاوت (بدبختی) کا سبب بھی نہیں ہے^۳

نتیجہ کلام

اس پوری گفتگو سے جو نتیجہ سامنے آتا ہے وہ یہ ہے کہ دنیا و آخرت کے درمیان ہر قسم کے رابطے کا انکار کر دینا خود قیامت کے انکار کے حکم میں ہے، لیکن نہ آخرت کی نعمتوں کے درمیان کوئی رابطہ ہے اور نہ دنیا کی نعمتوں اور آخرت کے عذاب کے درمیان اور نہ اس کے برعکس۔ اور بطور کلی دنیا و آخرت کے درمیان رابطہ، دنیاوی موجودات کے مابین پائے جانے والے رابطے کے جیسا نہیں ہے اور اس پر فیزیکس اور بیالوجی کے قوانین کا حکم نہیں لگایا جاسکتا بلکہ وہ جو نعمت یا عذاب آخرت کا سبب ہے وہ اسی دنیا میں انسان کے اپنے اختیاری اعمال ہیں، لیکن اس لحاظ سے نہیں کہ قوت کا خروج کرنا اور مواد میں تغیرات پیدا کرنا بلکہ اس لحاظ سے کہ نعمت اور عذاب کے سبب کا سرچشمہ ایمان اور باطنی کفر ہے۔ اور سیکڑوں آیات قرآنی سے اس مفہوم کو اخذ کیا جاسکتا ہے کہ قرآن کے نزدیک آخرت کی ابدی خوشبختی تک پہنچنے کا سبب خدا روز قیامت نیز انبیاء الہی پر ایمان رکھنا ہے اور

^۱ زخرف، ۳۲،

^۲ انفال، ۲۸، انبیاء، ۳۵، تغابن، ۱۵ اعراف، ۱۶۸، کہف، ۷ مائدہ، ۴۸، انعام، ۱۶۵، نمل، ۴۰، آل عمران، ۱۸۶،

^۳ آل عمران، ۱۷۹، مؤمنون، ۵۶، فجر، ۱۶، ۱۵،

خدا کے پسندیدہ اعمال جیسے نماز، روزہ، حج و زکوٰۃ، اور بندگان خدا کے ساتھ احسان (نیکی) اور امر بہ معروف (نیکیوں کا حکم دینا) نہی از منکر (برائیوں سے روکنا) کفار اور سنگمروں سے جہاد اور عدل و انصاف کرنا ہے۔ اور عذاب ابدی میں مبتلا ہونے کا سبب کفر، شرک و نفاق قیامت کا انکار انبیاء علیہ السلام کو جھٹلانا نیز گناہوں کا مرتکب ہونا، اور ظلم کرنا ہے اور بہت ساری قرآنی آیات میں اجمالی طور سے ایمان اور عمل صالح کو آخرت کی سعادت کا سبب جانا گیا ہے اور کفر و گناہ کو آخرت کی بد بختی کا باعث تصور کیا گیا ہے۔

سوالات

- ۱۔ دنیا و آخرت کے درمیان رابطے کے انکار میں کیا اعتراض ہو سکتا ہے؟
- ۲۔ آخرت کے لئے دنیا کے کھیتی ہونے کا کیا مطلب ہے وضاحت کیجئے؟
- ۳۔ دنیا اور آخرت کی نعمتوں کے درمیان کون سی نسبت پائی جاتی ہے؟
- ۴۔ دنیا کی نعمتوں اور آخرت کے عذاب کے درمیان کیا رابطہ ہے؟
- ۵۔ دنیا کے وہ کون سے امور ہیں جن کا آخرت کی سعادت یا شقاوت سے حقیقی رابطہ ہے؟

^۱ بقرہ، ۲۵، ۳۸، ۶۲، ۸۲، ۱۰۳، ۱۱۲، ۲۷۷، آل عمران، ۱۵، ۵۷، ۱۱۴، ۱۱۵، ۱۳۳، ۱۷۹، ۱۹۵، ۱۹۸، نساء، ۱۳، ۵۷، ۱۲۲، ۱۲۴، ۱۴۶، ۱۵۲، ۱۶۲، ۱۷۳، مائدہ، ۹، ۶۵، ۶۹، انعام، ۴۸، توبہ، ۷۲، یونس، ۴، ۶۳، ۶۴، رعد، ۲۹، ابراہیم، ۲۳، نحل، ۹۷، کہف، ۳۰، ۲۹، ۱۰۷، طہ، ۷۵، حج، ۱۴، ۲۳، ۵۰، ۵۶، فرقان، ۱۵، عنکبوت، ۷، ۵۸، ۹، روم، ۱۵، لقمان، ۸، سجدہ، ۱۹، سبا، ۴، ۳۷، فاطر، ۷، ص، ۴۹، زمر، ۲۰، ۳۳، ۳۵، غافر، ۴۰، فصلت، ۸، شوریٰ، ۲۲، ۲۶، جاثیہ، ۳۰، فتح، ۱۷، حدید، ۱۲، ۲۱، تغابن، ۹، طلاق، ۱۱، انشقاق، ۲۵، بروج، ۱۱، تین، ۶، بینہ، ۷، ۸،
^۲ بقرہ، ۲۴، ۳۹، ۸۱، ۱۶۱، ۱۶۲، آل عمران، ۲۱، ۵۶، ۸۸، ۸۶، ۹۱، ۱۱۶، ۱۹۷، ۱۹۶، ۱۷۷، ۱۷۶، ۱۳۱، نساء، ۱۴، ۵۶، ۱۲۱، ۱۴۵، ۱۵۱، ۱۶۱، ۱۶۸، ۱۶۹، ۱۷۳، مائدہ، ۱۰، ۳۶، ۷۲، ۸۶، انعام، ۴۹، توبہ، ۳، ۶۸، یونس، ۴، ۸، رعد، ۵، کہف، ۳۲، غافر، ۶، شوریٰ، ۲۶، جاثیہ، ۱۱، فتح، ۱۳، ۱۷، حدید، ۱۹، مجادلہ، ۵، تغابن، ۱۰، ملک، ۶، انشقاق، ۲۲، ۲۴، غاشیہ، ۲۳، ۲۴، بینہ، ۶

ترہنواں درس

دنیا و آخرت کے درمیان رابطہ کی قسم

مقدمہ

ہم کو یہ بات معلوم ہو چکی ہے کہ ایک طرف تو ایمان اور عمل صالح کے درمیان اور دوسری طرف تقرب پروردگار اور آخرت کی نعمتوں کے درمیان اور اسی طرح سے ایک طرف تو کفر اور گناہ کے درمیان اور دوسری طرف خدا سے دوری اور ابدی نعمتوں سے محرومی کے درمیان مناسبت اور براہ راست رابطہ پایا جاتا ہے۔ اور اسی طرح ایمان و عمل صالح اور عذاب آخرت کے درمیان اور کفر و گناہ اور ابدی نعمتوں کے درمیان برعکس نسبت پائی جاتی ہے۔ اور قرآن کریم کی روشنی میں ان نسبتوں کے اصول ہونے کے بارے میں کسی طرح کے شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہے اور ان کا انکار کرنا گویا خود قرآن کا انکار کرنا ہے۔ لیکن اس اہم اور ضروری گفتگو کے متعلق کچھ ایسے مسائل سامنے آتے ہیں کہ جس کے بارے میں بحث اور وضاحت کی ضرورت ہے، بطور مثال یہ کہ آیا مذکورہ روابط حقیقی ہیں یا تلمیحی؟ اور کیا یہ روابط، وضع و اعتبار (معاهدے) کے تابع ہے؟ ایمان اور عمل صالح کے درمیان کیا رابطہ ہے؟ اور کفر و گناہ کے درمیان کیا نسبت ہے؟ اور کیا خود اعمال صالح اور برے اعمال کے درمیان موثر اور متاثر ہونے کے اعتبار سے کوئی رابطہ پایا جاتا ہے یا نہیں؟

اس درس میں ہم سب سے پہلے مسئلہ سے متعلق گفتگو کرتے ہوئے اس بات کی وضاحت کرنا چاہیں گے کہ مذکورہ روابط فرضی اور قراردادی امور میں سے نہیں ہیں۔ رابطہ حقیقی ہے یا قرار دادی (فرضی) جیسا کہ ہم نے بارہا اس امر کی طرف اشارہ کیا ہے کہ دنیاوی اعمال اور نعمتوں کی آخرت کے عذاب کے درمیان کوئی معمولی یا مادی روابط نہیں پائے جاتے کہ جن کو فیزیکل یا کیمیاوی قوانین کی بنیاد پر بیان کرتے ہوئے اس کی تفسیر کی جائے، حتیٰ یہ تصور جو بعض لوگوں کا ہے کہ انسانی اعمال میں جو قوت

صرف ہوتی ہے وہ ان لوگوں کے نظریہ کی بنیاد پر جو اس بات کے قائل ہیں کہ مادہ اور قوت ایک دوسرے سے تبدیل ہو کر مجسم ہو جاتا ہے اور آخرت کی نعمتوں یا عذابوں کی شکل میں ظاہر ہوتے ہیں یہ ایک غلط تصور ہے کیونکہ ۱۔ ایک انسان کی گفتار اور کردار میں استعمال ہونے والی قوت کی مقدار اتنی بھی نہیں ہے کہ جو مجسم ہونے کے بعد ایک سبب کے برابر ہو سکے، چہ جائے کہ جنت کی بے شمار نعمتوں میں تبدیل ہو جائے۔

۲۔ یہ کہ مادہ اور قوت کا ایک دوسرے میں تبدیل ہونا کسی خاص عوامل و اسباب کے مطابق ہوتا ہے جس کا اعمال کی نیکی یا برائی اور فاعل (انسان) کی نیت سے کوئی واسطہ نہیں ہے اور کسی بھی طبعی (فطری) قانون کی بنا پر خالص اعمال اور دکھاوے کے اعمال میں امتیاز قائم نہیں کیا جاسکتا تاکہ یہ کہا جاسکے کہ ایک کی قوت نعمت میں تبدیل ہو گئی ہے اور دوسرے کی قوت عذاب میں بدل گئی ہے۔

۳۔ وہ قوت اور طاقت جو ایک مرتبہ کسی عبادت میں کام آچکی ہے ممکن ہے دوسری مرتبہ کسی گناہ میں استعمال ہو۔ لیکن ایسے رابطے کا انکار کرنا حقیقی رابطے کے مطلقاً انکار کے معنی میں نہیں ہے کیونکہ حقیقی ارتباطات کا دائرہ ناشائستہ اور غیر مجرب روابط کو بھی شامل ہے اور جس طرح علوم تجربی (تجرباتی علوم) دنیوی اور اخروی علوم، موجودات کے درمیان رابطہ سمیت کوٹا بت نہیں کر سکتا اسی طرح ان کے درمیان سمیت اور مسمیت کے رابطے کے باطل کرنے کے اوپر بھی قادر نہیں ہیں۔

اور اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ اچھے اور بُرے اعمال انسانی روح پر واقعی اثر رکھتے ہیں اور وہی روحی اثر ہے جو آخرت کی نعمت یا عذاب کا سبب ہے جسے دنیا کی خارق عادت (غیر معمولی) موجودات میں بعض نفسوں کے اثر انداز ہوتے ہیں ایسا فرض غیر معقول نہیں ہوگا بلکہ فلسفہ کے خاص اصول کی مدد سے اس کو ثابت بھی کیا جاسکتا ہے اور اس کتاب میں اس بیان کی گنجائش نہیں ہے۔

قرآنی دلیلیں

اگرچہ قرآنی بیانات اکثر مقامات پر فرضی اور قراردادیں راہلے کو ذہن سے نزدیک کرتے ہیں، جسے وہ آیات شریفہ جو اجر و جزا کی تعمیر پر مشتمل ہے لیکن دوسری آیتوں سے انسان کے اعمال اور آخرت کے ثواب و عقاب کے درمیان فرضی اور قراردادیں راہلے کے علاوہ دوسرے راہلے کا بھی استفادہ کیا جاسکتا ہے اس بنا پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ پہلے گروہ کی آیتوں کی تعمیر سمجھنے میں آسانی کے لئے اور اکثر لوگوں کی فکری سطح کی مناسبت سے ہے کہ جن کا ذہن ایسے مفاد ہم سے زیادہ مانوس ہوتا ہے۔ اسی طرح احادیث شریفہ میں بھی بے شمار دلیلیں موجود ہیں جو یہ بیان کر رہی ہیں کہ انسان کے اختیاری اعمال کی کئی ملکوتی اور مثالی شکلیں جو عالم برزخ اور قیامت میں ظاہر ہوں گی۔

اب ہم ان آیات شریفہ کو جو انسان کے اعمال اور آخرت کے نتیجوں کے درمیان حقیقی راہلے پر دلالت کرتی ہیں سامنے رکھتے ہیں۔^۱ (وَمَا تَقْدِرُوا إِلَّا فَنُكَلِّمُ مَن خَيْرُ تَجْدُوهُ عِنْدَ اللّٰهِ) ہر وہ نیکی جس کو تم نے پہلے سے بھیج دیا ہے خدا کے پاس اے پاؤ گے۔

۲۔ (يَوْمَ تَجِدُ كُلُّ نَفْسٍ مَّا عَمِلَتْ مِنْ خَيْرٍ مُّحْضَرًا وَمَا عَمِلَتْ مِنْ سُوءٍ تُوَدِّ لَوْ أَنَّ يَنفِرَ مَعَهَا يُنْفِرُ) اس دن جب ہر شخص اپنے انجام دئے ہوئے ہر اعمال خیر کو اپنے سامنے حاضر دیکھے گا، اور اپنے برے اعمال کو بھی دیکھے گا تو اس بات کی تمنا کرے گا کہ اس کے اور اعمال کے درمیان دوری اور فاصلہ ہو جائے۔

۳۔ (يَوْمَ يَنظُرُ الْمَرْءُ مَا قَدَّمَتْ يَدَاهُ) اس دن جب انسان دیکھے گا کہ اس کے ہاتھوں نے پہلے کیا بھیجا ہے۔

^۱ اجر کی تعبیر تقریباً نوے (۹۰) مرتبہ اور جزا کی تعبیر اور اس کے مشتقات کی تعبیر ایک سو سے زیادہ قرآن مجید میں استعمال ہوئی ہے۔
^۲ بقرہ ۱۱۰، اور سورہ مزمل آیت نمبر ۲۰ کا بھی مطالعہ کریں

^۳ آل عمران ۳۰
^۴ نبلہ ۴۰

۴۔ (مَنْ يَمَلْ مِثَالِ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَرَهُ * وَمَنْ يَمَلْ مِثَالِ ذَرَّةٍ شَرًّا يَرَهُ^۱) بس اگر کسی ایک نے ذرہ برابر بھی کار خیر انجام دیا ہے تو اسے (ضرور) دیکھے گا اور اگر کسی نے ایک ذرہ برابر بھی بُرا کام کیا ہے تو وہ بھی اسے دیکھے گا۔

۵۔ (لَ تَجْزُونَ إِلَّا مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ^۲) کیا وہ جزا جو نکلودی جائے گی ان اعمال کے علاوہ ہے جو تم نے (دنیا میں) انجام دیا ہے۔

۶۔ (إِنَّ الَّذِينَ يَكْلُونُ أَمْوَالَ الْيَتَامَىٰ ظُلْمًا إِنَّمَا يَكْلُونُ فِي بُطُونِهِمْ نَارًا^۳) بے شک وہ لوگ جو یتیموں کا مال ناحق (چھین) کر کھاتے ہیں گویا وہ لوگ اپنے شکم کو آگ سے بھرتے ہیں۔

ظاہر ہے کہ قیامت کے روز انسان کے لئے اس دنیا میں انجام دئے ہوئے اعمال کا دیکھ لینا اس کی جزا یا سزا نہیں ہو سکتی بلکہ یہ اس کی ملکوتی اور مثالی صورتیں ہیں جو مختلف نعمتیں اور قسم قسم کے عذاب کی شکل میں ظاہر ہو گئی اور انسان انہیں شکلوں کے ذریعہ نعمت سے سرفراز ہو گا یا عذاب میں مبتلا ہو گا جیسا کہ اس آخری ایہ شریفہ سے استفادہ ہوتا ہے کہ یتیم کے مال کو کھانے کی باطنی صورت آگ کا کھانا ہے اور جس وقت دنیا (قیامت) میں حقیقتیں کھل کر سامنے آئیں گی تب معلوم ہو گا کہ فلاں حرام غذا کا باطن آگ ہی تھی، اور پھر اس کے اندر جلنے کی تکلیف کو محسوس کرے گا اور پھر اس سے کہا جائے گا کیا یہ آگ اس حرام مال کے سوا کچھ اور ہے جو تو نے کھایا تھا؟

سوالات

۱۔ اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ اعمال کے مجسم ہونے کا مطلب یہ ہے کہ قوت (انرژی) جو کام کو انجام دینے میں کام آئی ہے وہ مواد میں تبدیل ہوتی ہے تو اس میں کیا حرج ہے؟

^۱ زلزال ۷، ۸

^۲ نمل ۹۰، اور سورہ قصص آیہ نمبر ۸۴ کی طرف رجوع کریں۔

^۳ نساء ۱۰،

۲۔ انسان کے اعمال اور اس کے آخری نتائج کے درمیان کیا رابطہ ہے؟ اس رابطے کو عقلی طور سے کیسے تصور کیا جاسکتا ہے؟

۳۔ اعمال کے مجسم ہونے پر کون سی آیات دلالت کرتی ہیں اور اجر و جزا جیسی تعمیر کے استعمال کرنے کا سبب کیا ہے؟

۴۔ کیا اعمال کے مجسم ہونے کی تفسیر یہ ہو سکتی ہے کہ خود اعمال اپنی اسی دنیاوی شکل میں ظاہر ہونگے اور کیوں؟

چونواں درس

ابدی خوشبختی یا بد بختی میں ایمان کا دخل

مقدمہ

ایک اور مسئلہ جو پیش آتا ہے وہ یہ ہے کہ آیا ایمان اور عمل صالح میں سے ہر ایک (الگ الگ) مستقل طور سے ابدی سعادت کا سبب ہیں یا دونوں ایک دوسرے کے ساتھ مل کر سعادت کا سبب بنتے ہیں؟ اور اسی طرح کیا کفر اور عصیان (گناہ) میں سے ہر ایک مستقل طور سے عذاب ابدی کا باعث ہیں یا دونوں باہم ایک ساتھ یہ اثر رکھتے ہیں؟ اگر ان دونوں مسئلوں میں ہم دوسری حالت کو مان لیں (یعنی دونوں مل کر سعادت یا شقاوت کا سبب ہیں) تو ایسی صورت میں اگر کوئی شخص صرف ایک چیز ایمان یا عمل صالح رکھتا ہو تو اس کا انجام کیا ہوگا؟ اسی کے مانند اگر کوئی انسان صرف کفر اختیار کرے یا صرف کسی گناہ کا مرتکب ہوا ہو، تو اس کی عاقبت کا کیا ہوگا؟ اور اگر ایک با ایمان شخص حد سے زیادہ گناہوں کا ارتکاب کرے یا ایک کافر انسان بے شمار کار خیر انجام دے تو کیا اس کی عاقبت بخیر ہوگی یا اس کے بھی بڑے انجام ہوں گے؟

اور کسی بھی صورت میں اگر کوئی انسان اپنی زندگی کے کچھ حصے ایمان اور عمل صالح کے ساتھ گزارے، اور زندگی کے کچھ حصے کفر اور گناہ سے آلودہ بسر کرے تو ایسے شخص کا کیا حشر ہوگا؟ یہ وہ مسائل ہیں جن کے سلسلے میں اسلام کے ظہور کی پہلی صدی سے بحث ہوتی چلی آرہی ہے، اور خوارج جیسے گروہ کے افراد کا عقیدہ یہ ہے کہ صرف گناہ کا ارتکاب ابدی شقاوت کا ایک مستقل سبب ہے اور صرف یہی نہیں، بلکہ کفر اور ارتداد کا باعث بھی ہے، اور دوسرا گروہ جیسے مرجئہ کہتے ہیں، اس گروہ کے افراد کا عقیدہ یہ ہے کہ صرف ایمان کا پایا جانا ابدی نجات کے لئے کافی ہے، اور گناہوں کا ارتکاب مومن کی سعادت کو کوئی ضرر نہیں پہنچا سکتا، لیکن حق بات یہ ہے کہ ہر گناہ ابدی شقاوت (بد بختی) کا سبب نہیں ہوتا، اگرچہ ممکن ہے گناہوں کی زیادتی ایمان کے سلب ہونے کی

وجہ بن جائے اور دوسری طرف ایسا بھی نہیں کہ ایمان رکھنے کی صورت میں سارے گناہ بخش دئے جائیں، اور کوئی گناہ اپنا بڑا اثر نہ رکھے۔ اس درس میں ہم سب سے پہلے ایمان اور کفر کی وضاحت کریں گے اور پھر یہ بیان کریں گے کہ ابدی سعادت اور بد بختی میں ایمان و کفر کا کیا دخل ہے اور دوسرے مسائل کو انشاء اللہ آئندہ درسوں میں بیان کریں گے۔

ایمان اور کفر کی حقیقت

ایمان ایک قلبی اور نفسیاتی حالت کا نام ہے جو کسی ایک مفہوم کو جاننے اور اس کی طرف میلان کے اثر سے پیدا ہوتی ہے اور انہیں دونوں اسباب میں شدت اور ضعف کی بنا پر کمال یا نقص پیدا ہوتا ہے، اور اگر انسان کسی شے کے وجود سے چاہے وہ غیر یقینی ہی کیوں نہ ہو، آگاہ نہ ہو تو اس پر ایمان بھی نہیں لاسکتا، لیکن غلط آگاہ ہونا یا اطلاع حاصل کر لینا کافی نہیں ہے، اس لئے کہ ممکن ہے جس سے آگاہی حاصل ہوئی ہے یا وہ اس کے بعض لوازمات انسان کی خواہش کے خلاف ہوں اور وہ اس کے برخلاف رجحان رکھتا ہو، اس بناء پر وہ اس کے لوازمات پر عمل کرنے کا فیصلہ نہ کرے۔

بلکہ اس کے خلاف عمل کرنے کا فیصلہ کر لے، جیسا کہ قرآن کریم فرعونوں کے بارے میں فرما رہا ہے، (وَجَدُوا بِهَا وَاسْتَفْتَيْنَاهَا أَنْفُسُهُمْ ظُلْمًا وَ غُلُوبًا) ظلم اور منزلت طلبی کے نشہ میں آیات الہی کا انکار کر دیا باوجودیکہ اس کا یقین کر چکے تھے اور جناب موسیٰ نے فرعون کو خطاب کر کے ارشاد فرمایا، (لَقَدْ عَلِمْتُمْ أَنَّا نَزَّلْنَا بِالْوَلَاءِ الرَّبَّ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ) بے شک تم جانتے ہو کہ ان آیات اور معجزات کو سوائے زمین و آسمان کے پروردگار کے کسی اور نے نہیں نازل کیا۔ باوجودیکہ وہ (فرعون) ایمان نہیں لایا تھا لوگوں سے کہتا تھا، (مَا عَلِمْتُ لَكُم مِّنْ آلَهِ غَيْرِي) میں تمہارے لئے اپنے علاوہ کسی کو خدا نہیں جانتا، اور صرف اس وقت جب ڈوبنے لگا تب اس نے کہا، (آتَتْهُ آتِلَہُ إِلَّا الَّذِیْ آتَتْ بِرَبِّہِ سِرَاطِیْلٌ) میں ایمان لایا اس خدا پر جس کے علاوہ کوئی خدا نہیں جس پر بنی اسرائیل

^۱ نمل، ۱۴

^۲ اسراء، ۱۰۲

^۳ قصص، ۳۸، ۴ - یونس، ۹۰

^۴ درس نمبر ۹ نو کا، مطالعہ کریں

ایمان لائے اور اس سے ہمیں یہ معلوم ہو گیا کہ مجبوری میں ایمان لانا قابل قبول نہیں ہے اگرچہ اس کو ایمان کا نام دیا جائے۔ پس ایمان کا دار و مدار قلبی رجحان اور اختیار پر ہے، علم و آگاہی کے برخلاف کہ جو بے اختیار بھی حاصل ہو جاتا ہے، اس بناء پر ایمان ایک قلبی اور اختیاری عمل تصور کیا جاسکتا ہے، یعنی عمل کے مفہوم کو وسعت دے کر ایمان کو بھی عمل ہی کے مقولے میں شمار کیا جاسکتا ہے، لیکن لفظ، کفر، کبھی عدم ایمان کے عنوان سے تعبیر ہوتا ہے اور ایمان کا نہ ہونا، چاہے شک اور جہل بیط کی وجہ سے ہو، یا جہل مرکب کے سبب، مخالف رجحان کی وجہ سے ہو، یا عدا انکار اور دشمنی کی وجہ سے، بہر حال کفر کہا جائے گا، اور کبھی صرف آخری قسم یعنی (انکار خدا) اور دشمنی سے مخصوص ہو جاتا ہے کہ جو ایک وجودی امر ہے اور ایمان کی ضد شمار کیا جاتا ہے۔

ایمان اور کفر کی حد (نصاب)

قرآنی آیات کریمہ اور روایات سے جو مطلب نکلتا ہے اس کی روشنی میں کم سے کم ایمان جو ابدی سعادت کے لئے درکار ہے وہ خدا کی وحدانیت اور اسکی اخروی جزا و سزا پر ایمان اور انبیاء علیہم السلام پر جو کچھ نازل ہوا اس کی صحت پر ایمان لانا ہے اور پھر اس کا لازمہ یہ ہے کہ خداوند عالم کے احکام پر عمل کرنے کا اجمالی ارادہ ہے، اور کم سے کم کفر جو ابدی بدبختی کے لئے کافی ہے وہ توحید میں شک یا نبوت، قیامت میں شک کرنا ہے یا ان چیزوں کا انکار کرنا جن کے بارے میں جانتا ہو کہ یہ انبیاء علیہم السلام پر نازل ہوئی ہیں۔ اور کفر کا بدترین مرتبہ اور آخری حد از روئے دشمنی تمام مذکورہ حقائق کا انکار کر دینا باوجودیکہ اس کی صحت کا علم رکھتا ہو اور دین حق سے جنگ و جدال کرنا ہے۔

اسی طرح شرک (توحید کا انکار) بھی کفر کے مصادیق میں ایک مصداق ہے، اور نفاق جو کفر باطنی کا نام ہے جس میں ہمیشہ دھوکا بازی پائی جاتی ہے اور اسلام کا اظہار کیا جاتا ہے اور منافقین (نقاب پوش کافر) کا انجام سارے کفار سے برا ہوگا جیسا خود قرآن کریم کا ارشاد ہے، (ان المنافقین فی الذکر الاصل من النار) ترجمہ: اس میں تو شک ہی نہیں کہ منافقین جہنم کے سب سے نیچے

^۱ درس نمبر ۹ نو کا، مطالعہ کریں
^۲ نساء، ۱۴۵،

طبقے میں ہونگے۔ ایک خاص نکتہ جس کی طرف توجہ دلانا ضروری ہے وہ یہ ہے کہ اسلام اور کفر فقہی مسائل جیسے طہارت، حلیت ذبیحہ کا حلال ہونا کاح کا جائز ہونا، میراث وارث ہونا یا نہ ہونا ایمان کے ملازم ہے، لیکن یہ ایمان اس ایمان اور کفر سے جو اصول دین میں موضوع بحث واقع ہوتے ہیں کوئی نسبت اور ملازمت نہیں رکھتے اس لئے کہ ممکن ہے کہ کوئی شخص شہاد تین پڑھے (خود پیغمبر کی گواہی دے) اور فقہی مسائل اس کے لئے ثابت ہوں در آن حالیکہ قلبی طور سے اس کے مضامین اور لوازم توحید اور نبوت پر ایمان نہ رکھتا ہو۔

دوسرا نکتہ یہ ہے کہ اگر کوئی انسان اصول دین کو پہنچانے پر قادر نہ ہو اور بعنوان مثال وہ دیوانہ اور بے عقل ہو یا سماج کے ماحول کی وجہ سے دین حق کو نہ پہچان سکے تو وہ اپنی کوتاہی کے لحاظ سے معذور مانا جائے گا، لیکن اگر کوئی شخص تمام امکانات اور شناخت کی تمام سہولتوں کے باوجود کوتاہی کرے اور شک کی حالت میں باقی رہ جائے یا بغیر کسی دلیل کے اصول اور ضروریات دین کا انکار کر دے تو ایسا شخص معذور نہیں سمجھا جائے گا (اس کا عذر قبول نہ ہوگا) اور ابدی عذاب میں مبتلا ہو جائے گا۔

ابدی خوشبختی یا بد بختی میں ایمان اور کفر کا دخل

اس بات کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہ انسان کا حقیقی کمال تقرب الہی کے زیر سایہ متحقق ہوتا ہے، اس کے برخلاف انسان کی بد بختی خدا سے دوری کے نتیجہ میں حاصل ہوتی ہے، لہذا خداوند عالم پر ایمان اور اس کی تکوینی و تشریعی ربوبیت پر ایمان رکھنا کہ جس کا لازمہ قیامت اور نبوت پر عقیدہ رکھنا ہے، انسان کے حقیقی کمال کا شجر جانا جاسکتا ہے کہ جس کے شاخ و برگ خدا کے پسندیدہ اعمال میں اور ابدی سعادت اس کا پھل ہے جو آخرت میں ظاہر ہوگا پس اگر کوئی انسان اپنے دل میں ایمان کے بیج کو نہ بوئے اور اس بابرکت پودے کو نہ لگائے اور اس کی پرورش نہ کرے بلکہ اس کے بجائے کفر اور گناہ کے زہریلے بیج کو اپنے دل کی کھیتی میں چمڑک دے تو گویا اس نے خدا کی دی ہوئی صلاحیتوں کو ضائع کر دیا اور اس نے ایک ایسے درخت کو پروان چڑھایا جس کا پھل (زقوم) دوزخی پھل ہوگا، ایسا شخص ہرگز ابدی سعادت سے ہمکنار نہیں ہو سکتا، اور اس کے نیک اعمال کا اثر اس دنیا سے

جو بھی عمل انجام دیا) ہم نے آکر ہر اس عمل کو فضا میں غبار کی طرح فشر کر دیا اور ایک دوسری آیت میں کافروں کے اعمال کو اس سراب سے تشبیہ دی ہے کہ جس کو دیکھ کر پیاسا انسان اس کی طرف دوڑتا ہے۔

لیکن جیسے ہی وہاں پہنچتا ہے وہ پانی نہیں ہوتا: (وَالَّذِينَ كَفَرُوا أَعْمَالُهُمْ كَسَرَابٍ بِقِيعَةٍ يَحْبُوهَا إِذَا جَاءَهُ لَمْ يَجِدْهُ شَيْءًا وَوَجَدَ اللَّهَ عِنْدَهُ فُتُورًا ۚ وَاللَّهُ سَرِيعُ الْحِسَابِ) اور جن لوگوں نے کفر اختیار کر لیا ان کے اعمال اس ریت کے مانند ہیں جو چٹیل میدان میں ہو اور پیاسا اسے دیکھ کر پانی تصور کرے اور جب اس کے قریب پہنچے تو کچھ نہ پائے بلکہ اس خدا کو پائے جو اس کا پورا حساب کر دے کہ اللہ بہت جلد حساب کرنے والا ہے۔

(اَوَلَمْ نَكُفِّرْ فِي بَحْرِ نَجِّي يَنْشَاهُ مَوْجٌ مِنْ فَوْقِهِ سَحَابٌ لُطْفًا بَعْضُهَا فَوْقَ بَعْضٍ إِذَا أَخْرَجَ يَدَهُ لَمْ يَكِدْ يَرَاهَا وَمَنْ لَمْ يَحْكَمْ اللَّهُ لَهُ نُورًا فَلَا مِنْ نُورٍ) یا ان کے اعمال کی مثال اس گہرے دریا کی تارکیوں کی سی ہے کہ جس کو لہروں نے ڈھانپ رکھا ہو اور اس کے اوپر تہ بہ تہا دل بھی ہوں کہ جب وہ اپنے ہاتھ کو نکالے تو تارکی کی بنا پر کچھ نظر نہ آئے اور جن کے لئے خدا نور نہ قرار دے اس کے لئے کوئی نور نہیں (کنایہ ہے اس بات سے کہ کافروں کی حرکت تارکی میں ہے اور وہ کہیں نہیں پہنچ سکتے) اور دوسری آیت میں خدا کا ارشاد ہے کہ دنیا پرستوں کے عمل کے نتیجے، اسی دنیا میں ان کو دے دے جائیں گے اور آخرت میں ان کے لئے کوئی حق نہ ہو گا جیسے یہ آیت شریفہ۔ (مَنْ كَانَ يُرِيدِ الْحَيَاةَ الدُّنْيَا وَزِينَتَهَا نُوفِ إِلَيْهِمْ أَعْمَالَهُمْ فِيهَا وَهُمْ فِيهَا لَا يُبْخَوْنَ * أُولَٰئِكَ الَّذِينَ لَيْسَ لَهُمْ فِي الْآخِرَةِ إِلَّا النَّارُ وَحَبَّطُوا صُغُرَهُمْ فِيهَا وَبَاطِلٌ مَّا كَانُوا يَعْمَلُونَ) جو شخص زندگانی دنیا اور اس کی زینت کے طلب میں ہم اسکے اعمال کا پورا پورا حساب میں کر دیتے ہیں اور کسی طرح کی کمی نہیں کرتے اور یہی لوگ جن کے لئے آخرت میں جہنم کے علاوہ کچھ نہیں ہے اور ان کے سارے کاروبار برباد ہو گئے ہیں اور سارے اعمال باطل و بے اثر ہو گئے ہیں۔

^۱ نور، ۳۹،

^۲ نور، ۴۰،

^۳ ہود، ۱۵، ۱۶،

سوالات

- ۱۔ ایمان اور کفر کے متعلق خوارج اور مرجئه کا نظریہ تحریر کرتے ہوئے ان کے مقابل میں قول حق کو بیان کریں؟
- ۲۔ ایمان اور کفر کی حقیقت اور علم و جہل سے اس کے رابطہ کو واضح کیجئے؟
- ۳۔ ایمان اور کفر کے نصاب کو بیان کریں؟
- ۴۔ شرک و نفاق کی کفر سے کیا وابستگی ہے؟
- ۵۔ ابدی سعادت و شقاوت میں ایمان و کفر کی تاثیر اور اس کے راز کو بیان کریں؟
- ۶۔ فقہی اسلام و کفر کی کلامی ایمان و کفر سے کیا نسبت ہے؟
- ۷۔ اس تاثیر پر قرآنی دلیلیں پیش کریں؟

پیشواں درس

ایمان اور عمل کا آپس میں رابطہ

مقدمہ

ہمیں یہ بات معلوم ہو چکی ہے کہ ابدی سعادت و ثقاوت کا اصل سبب ایمان اور کفر ہے، اور مستحکم ایمان ہمیشہ کی خوشنہی کی ضامن ہے ہر چند ممکن ہے کہ گناہوں کا ارتکاب محدود عذاب کا باعث بن جائے، اور دوسری طرف مستحکم کفر ہمیشہ کی بد بختی کا سبب ہے اور اس کے ہوتے ہوئے کوئی بھی نیک کام آخرت کی سعادت کا سبب نہیں ہو سکتا، اسی کے ضمن میں اشارہ کرتے چلیں، کہ ایمان اور کفر میں شدت اور ضعف کو قبول کرنے کی صلاحیت ہے اور ممکن ہے کہ بڑے بڑے گناہوں کے ارتکاب کی وجہ سے ایمان سے ہاتھ دھونا پڑے، اور اسی طرح نیک کام انجام دینا، کفر کی بنیادوں کو کمزور کر دیتا ہے، اور ممکن ہے کہ ایمان کے لئے راہ ہموار کر دے اس مقام پر ایمان اور عمل کے درمیان رابطے کے سوال کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے ہم اس درس میں اس سوال کے جواب کو بیان کریں گے۔

ایمان کا عمل سے رابطہ

گذشتہ بیانات سے واضح ہو چکا ہے کہ ایمان ایک قلبی اور نفسانی حالت کا نام ہے کہ جو علم و دانش کی وجہ سے مزید تقویت پاتے ہیں، اور اس کا لازمہ یہ ہے کہ با ایمان انسان اجمالی طور سے ان چیزوں کے لوازم پر جن پر ایمان رکھتا ہے عمل کرنے کا فیصلہ کرتا ہے اس بنا پر وہ شخص جو کسی حقیقت سے آشنا ہے، لیکن اس کا یہ فیصلہ ہے کہ وہ کبھی بھی اس کے لوازمات پر عمل نہیں کریگا وہ ہرگز ایمان نہیں رکھ سکتا یہاں تک کہ اگر عمل کرنے یا نہ کرنے کے سلسلے میں شک میں مبتلا ہو جائے تب بھی جانے کہ وہ ایمان نہیں لایا ہے۔

قرآن کریم کا ارشاد ہے (قَالَتِ الْأَعْرَابُ آمَنَّا قُلْ لَمْ تُؤْمِنُوا وَلَكِنْ قُولُوا أَسْلَمْنَا وَلَمَّا يَدْخُلِ الْإِيمَانُ فِي قُلُوبِكُمْ) یہ بدو عرب کہتے ہیں کہ ہم ایمان لے آئے ہیں تو (اے رسول) آپ کہہ دیجئے کہ تم ایمان نہیں لائے بلکہ یہ کہو کہ اسلام لے آئے ہیں ابھی ایمان تمہارے دلوں میں داخل ہی نہیں ہوا ہے، لیکن حقیقی ایمان کے بھی کچھ مراتب ہیں اور ایسا نہیں ہے ایمان کے ہر مرتبے کا لازمہ یہ ہو کہ اس سے مربوط تمام وظائف انجام دئے جائیں اور ممکن ہے کہ شہوانی یا غضبی دباؤ کمزور ایمان رکھنے والے انسان کو گناہ کے ارتکاب پر مجبور کر دے لیکن اس طرح نہیں کہ وہ ہمیشہ گناہوں میں ملوث رہے اور تمام لوازمات کی مخالفت کرتا رہے البتہ جتنا زیادہ ایمان میں استحکام پایا جائیگا اور جتنا زیادہ کامل ہوگا اتنا ہی زیادہ اس کے مناسب اعمال کو انجام دینے میں اثر رکھے گا۔ خلاصہ یہ ہے کہ ایمان ذاتی اور فطری طور سے اپنے لوازمات اور تعلقات پر عمل کرنے کا تقاضا کرتا ہے اور یہی تاثیر کی مقدار کا تقاضا بھی اس کی شدت و ضعف سے وابستہ ہے اور بالآخر انسان کا فیصلہ اور ارادہ ہی ہے جو کسی کام کو انجام دینے یا ترک کرنے کو متعین کرتا ہے۔

عمل کا ایمان سے رابطہ

انسان کا اختیاری عمل یا تو مناسب اور ایمان کے ساتھ ہوگا یا غیر مناسب اور ایمان کے خلاف ہوگا پہلی صورت میں ایمان کو تقویت حاصل ہوتی ہے اور دل کی نورانیت میں اضافہ ہوتا ہے، اور دوسری صورت میں ایمان کمزور اور انسان کا قلب تاریک ہو جاتا ہے اس بنا پر وہ اعمال صحیح جو ایک مومن کے ذریعہ انجام پاتے ہیں باوجودیکہ یہ اس کے ایمان سے کسب فیض کرتے ہیں مگر اس کی قوت ایمان اور ثابت قدمی میں اضافہ کرتے ہیں اور بہت سارے نیک کام کے لئے راہ ہموار کرتے ہیں اور اس آیت شریفہ کے ذریعہ تکامل ایمان میں عمل صالح کی تاثیر کو ظاہر کیا جاسکتا ہے۔ (إِلَيْهِ يَصْعَدُ الْكَلِمُ الطَّيِّبُ وَالْعَمَلُ الصَّالِحُ يَرْفَعُهُ) پاکیزہ

کلمات اور اچھے اعتقادات اللہ کی طرف بلند ہوتے ہیں اور عمل صالح انھیں بلند کرتا ہے^۱ اور اسی طرح متعدد آیتوں میں نیک اعمال انجام دینے والوں کے ایمان میں زیادتی اور نور و ہدایت میں اضافہ کو بیان کیا گیا ہے^۲ دوسری طرف اگر مقتضائے ایمان کے ساتھ ساتھ مخالف سبب اور محرک وجود میں آجائے، اور غیر مناسب عمل انجام دینے کا سبب بن جائے، اور اس شخص کا ایمان اتنا مستحکم نہ ہو جو اسے غیر شائستہ عمل سے روک سکے، تو اس کا ایمان کمزوری کی طرف مائل ہو جائیگا، اور گناہ کے دوبارہ انجام دینے کا خدشہ پیدا ہو جائیگا اور اگر یہ حالت اسی طرح باقی رہ گئی تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اصل ایمان کو زوال کی طرف جانے کا خطر پیدا ہو جائے گا اور (معاذ اللہ) اس کو کفر اور نفاق میں تبدیل کر دیگا، قرآن مجید، ان افراد کے بارے میں جو نفاق کا شکار ہو گئے ہیں فرماتا ہے (فَاعْتَبِرْهُمْ نِفَاقًا فِي قُلُوبِهِمُ إِلَى يَوْمِ يَلْقَوْنَهُ بَاِخْلَفُوا اللّٰهَ مَا وَعَدُوْهُ وَبَاِ كَا لِيُكَذِّبُوْنَ^۳) چونکہ ان لوگوں نے خدا سے وعدہ خلا فی کی اور جھوٹ بولے لہذا خدا نے ان کے دلوں میں نفاق کو داخل کر دیا ہے اس دن تک جس دن یہ لوگ خدا سے ملاقات کریں گے اور یہ ارشاد ہو رہا ہے (ثُمَّ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِينَ اَسَاءُوا السَّوْءُ اِيْ اَنْ كَذَّبُوْا بِآيٰتِ اللّٰهِ وَكَانُوْهُمُ اِيْتِرَءُوْنَ^۴) اور اس وقت ان لوگوں کا انجام جو بدترین گناہوں کا ارتکاب کرتے تھے یہ ہوا کہ انھوں نے خدا کی آیات کو جھٹلایا اور اسکا مذاق اڑایا۔ اور اسی طرح دوسری متعدد آیتوں میں گنہگاروں کے کفر اور تاریکی قلب اور سنگ دلی میں اضافہ کا ذکر کیا ہے^۵۔

نتیجہ

ایمان اور عمل کے آپس کے رابطے کو دیکھتے ہوئے اور انسان کی سعادت میں ان دونوں کے کردار کی طرف توجہ کرتے ہوئے انسان کی سعادت مند حیات کو ایک درخت سے تشبیہ دی جاسکتی ہے^۶ اس طرح کہ خداوند عالم کی وحدانیت اور اس کے بھیجے ہوئے رسولوں اور اسکے پیغامات اور روز قیامت پر ایمان رکھنا، گویا اس درخت کی جڑ کو تشکیل دیتا ہے اور ایمان کے لوازمات پر عمل

^۱ اس بنا پر کہ ضمیر فاعلی، العمل الصالح کی طرف اور ضمیر مفعولی الکلم الطیب کی طرف پلٹتی ہے۔
^۲ آل عمران ۱۷۳، انفال ۲، تو بہ ۲۴۹، کہف ۱۳، مریم ۷۶، احزاب ۲۲، محمد ۱۷، مدثر ۳۱،
^۳ تو بہ ۷۷،
^۴ روم ۱۰،
^۵ بقرہ ۱۰، آل عمران ۹۰، نسا ۱۳۷، مائدہ ۶۸، تو بہ ۳۷، اسراء ۶۰، ۸۲، صف ۵، نوح ۲۴،
^۶ رک: ابراہیم ۲۴ - ۲۷،

کرنے کا فیصلہ اس کے تنہ کی حیثیت رکھتا ہے کہ جو بغیر کسی واسطہ کے جڑ سے اگتا ہے اور وہ شائستہ اور مناسبات کا جو ریشہ ایمان سے مترشح ہوتے ہیں اس کی شاخ و برگ کی طرح میں، اور ابدی سعادت اس درخت کا پھل ہے اگر جڑ کا وجود نہ ہو، تو تنہ اور شاخ و برگ وجود میں نہیں آسکتے، اور میوہ بھی نہیں آسکتا، لیکن ہرگز ایسا نہیں ہے جڑ کے وجود سے مناسب شاخ و برگ اور بہترین پھلوں کا ہونا لازم ہے بلکہ کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے، درخت فضا اور زمین کی ناسازگاری اور مختلف آفتوں کی وجہ سے مرجھا جاتے ہیں اور اس میں مناسب شاخ و برگ نہیں اگ پاتے اسی صورت میں وہ درخت نہ صرف یہ کہ خاطر خواہ پھل نہیں دیتا بلکہ خشک ہو جاتا ہے اور بہت ممکن ہے اس درخت کی شاخ یا تنہ یا اسکی جڑوں میں قلم (پیوند) لگائی جاتی ہے ان سے دوسرے آثار ظاہر ہوں اور ممکن ہے اتفاقاً وہ پیوند (قلم) کسی دوسرے درخت میں تبدیل ہو جائے اور یہ ایسا ہی ہے جیسے ایمان کفر میں تبدیل ہو جائے۔ حاصل کلام یہ ہے کہ ایمان کو ایسے امور کے ذریعہ یاد کیا گیا ہے جو سعادت انسانی کا اصلی سبب ہے لیکن اس سبب کا اثر اعمال صالحہ کے ذریعہ لازم غذاؤں کے مکمل جذب ہو جانے پر مشروط (موقوف) ہے اور گناہوں سے پرہیز کے ذریعہ اس کے نقصان دہ امور کو دور کرنے اور آفتوں کو ختم کرنے پر موقوف ہے اور واجبات کا ترک کرنا اور محرمات کا ارتکاب کرنا ایمان کی جڑوں کو کمزور بناتا ہے اور کبھی کبھی ایمان کے درخت کو خشک کر دیتا ہے جس طرح غلط عقائد کے پیوند، اس کی حقیقت میں تبدیلی کا باعث بن جاتے ہیں۔

سوالات

- ۱۔ نیک اعمال میں ایمان کا کیا اثر ہے؟ وضاحت کیجئے؟
- ۲۔ نیک اور برے اعمال کا ایمان کی قوت اور کمزوری میں کیا اثر ہے شرح کیجئے؟
- ۳۔ ایمان اور عمل کے آپس کے روابط اور ان دونوں کا انسان کی سعادت سے کیا رابطہ ہے بیان کیجئے؟

چھپنواں درس

مقدمہ

بعض ایسے افراد جو اسلامی ثقافت سے کافی حد تک مانوس نہیں ہیں اور آگاہی نہیں رکھتے، اور اپنے ظاہری اور سطحی معیار کی بنیاد پر انسانی رفتار و اعمال کی قدر و قیمت کا اندازہ لگاتے ہیں، نیز محرک و فاعل کی نیت کی اہمیت کی طرف کوئی توجہ نہیں دیتے اور بہ تعبیر دیگر حُسنِ فعلی کے مقابلہ میں حُسنِ فعلی کو اہمیت نہیں دیتے یا دوسروں کی دنیاوی زندگی میں آسائش و آرام کے حوالے سے موثر ہونے کو معیارِ قدر و قیمت سمجھتے ہیں ایسے لوگ بہت سارے اسلامی عقائد اور معارف کی تحقیق اور اس کو سمجھنے میں گمراہی سے دوچار ہو جاتے ہیں، یا اس حقیقت کو سمجھنے اور بیان کرنے سے قاصر رہتے ہیں، من جملہ ایمان کا اثر اور اس کا اعمالِ صالحہ سے رابطہ اور کفر و شرک کا تباہ کن کردار اور بعض چھوٹے اور کم مدت اعمال کو بڑے اور طولانی مدت اعمال پر فوقیت و برتری کے سلسلہ میں کج فکری کا شکار ہو جاتے ہیں، مثلاً ایسا تصور کرتے ہیں وہ بڑے ایجادات کے مالک افراد جنہوں نے دوسروں کے لئے آسائش و آرام کے اسباب فراہم کئے ہیں یا وہ حریت پسند افراد جنہوں نے اپنی ملت کی آزادی کی راہ میں جنگ و جدال کا سامنا کیا ہے ان کو آخرت میں بلند و بالا مقام ملنا چاہیے ہر چند کہ وہ خدا اور قیامت پر ایمان نہ رکھتے رہے ہوں، اور کبھی کبھی نوبت یہاں تک پہنچ جاتی ہے کہ اسی دنیا میں انسانی قدر و قیمت اور زحمت کرنے والوں اور محنت کشوں کی آخری کامیابی پر ایمان رکھنے ہی کو انسانی سعادت کے لئے ایمان کی ضرورت بتاتے ہیں، اور حد تو یہ ہے خدا کے مفہوم کو بھی ایک قیمتی مفہوم اور اخلاقی موازنہ کے مطابق رقم کرتے ہیں۔

اگرچہ گزشتہ دروسوں میں جو بیان ہوا اس کی روشنی میں ایسی گفتگو اور ایسے خیالات کی خطا اور کمزوری کو بھی پہنچانا جاسکتا ہے، لیکن اس موجودہ زمانہ میں ایسے اٹھار کی نشر و اشاعت اور آئندہ کی نسل کے لئے جو خطرہ پیدا ہو گیا ہے اس کو بچانے کے لئے ضرو

ری ہے کہ اس کے بارے میں تھوڑی سی وضاحت کر دی جائے۔ البتہ ایسے مسائل پر ایک جامع اور مفید گفتگو کرنے کے لئے وسیع زمانہ اور سازگار حالات درکار ہیں۔ اس لئے اس مقام پر ان مسائل کے عقیدتی پہلو کو دیکھتے ہوئے اور اس کتاب کی مناسبت کا لحاظ کرتے ہوئے صرف بنیادی ترین مسائل کو بیان کرنے ہی پر اکتفا کرتے ہیں۔

انسان کا حقیقی کمال

اگر ہم سیب کے درخت کو ایک بغیر پھل کے درخت کے ساتھ تصور کریں اور دونوں کا مقابلہ کریں، تو سیب کے درخت کو بے پھل درخت سے زیادہ قیمتی ٹھا کر کریں گے، اور یہ فیصلہ صرف اس لئے نہیں ہے کہ انسان پھل دار درخت سے زیادہ فائدہ اٹھاتا ہے بلکہ اس لئے کہ پھل دار درخت کا وجود بے پھل درخت سے زیادہ کامل ہے اور اس کے آثار بھی اس سے زیادہ ہیں اس لئے اس کی قدر و منزلت بھی زیادہ ہوگی لیکن اگر یہی سیب کا درخت اگر کسی آفت کا شکار ہو جائے یا اس کو کوئی مرض لاحق ہو جائے اور اس کی نشوونما رک جائے تو یہ اپنی قدر و قیمت کھودے گا، اور ممکن ہے کہ اس کی گندگی اور دوسروں کے لئے نقصان کا سبب بن جائے۔ انسان کا بھی دوسرے تمام جانوروں کے مقابلہ میں یہی حکم ہے اور اس صورت میں جب وہ اپنے لائق اور مناسب کمال تک پہنچ جائے اور اس کے وجود سے اسکی فطرت کے مطابق آثار ظاہر ہونے لگیں، تو گویا وہ انسان جانوروں سے زیادہ قدر و قیمت کا حامل ہے لیکن اگر آفت و گمراہی کا شکار ہو جائے تو ممکن ہے کہ دورے سارے جانوروں سے بھی پست تر اور نقصان دہ ہو جائے جیسا کہ قرآن مجید میں ذکر ہوا ہے کہ بعض انسان سارے حیوانات سے بھی بڑے ہیں اور چوپایوں سے زیادہ گمراہ ہیں دوسری طرف سے اگر کسی نے سیب کے درخت کو صرف پھول کھلنے اور غنچے لگنے تک ہی دیکھا ہو تو وہ گمان کرے گا، کہ اس کی ترقی اور پھولنے پھلنے کی آخری حد یہی ہے اور اب اس سے زیادہ کمال اس میں نہیں پایا جاتا اسی طرح جنھوں نے صرف انسان سے متوسط کمالات کا مشاہدہ کیا ہے وہ انسان کے آخری کمال اور اس کی حقیقت کو نہیں درک کر سکتے اور صر

ف وہ ہی لوگ انسان کی واقعی قدر و قیمت کا اندازہ لگا سکتے ہیں کہ جو اس کے کمال کی آخری منزل کو پہچانتے ہیں لیکن انسان کا آخری کمال اس کا کمال مادی نہیں ہے اس لئے کہ جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے کہ انسان کی انسانیت کا تعلق ملکوتی روح سے ہے اور انسانی کمال بھی درحقیقت وہی روح کا کمال ہے جو اپنی اختیاری کارکردگی سے حاصل ہوتا ہے چاہے وہ قلبی اور اندرونی کا کرکردگی ہو یا، بیرونی اور اعضا و جوارح کی مدد سے حاصل ہونے والی کارکردگی اور ایسے کمال کا اندازہ کسی حسی تجربات اور پیمانے کے ذریعہ نہیں لگایا جاسکتا لہذا اس تک پہنچنے کے لئے آزمائشی وسائل کا سہارا نہیں لیا جاسکتا بس جو خود کمال تک نہیں پہنچ سکتا اور اس کو علم حضور می اور قلبی مشاہدہ کے ذریعہ نہیں پاسکتا اس کو چاہیے کہ اس کمال تک پہنچنے کی عقلی دلیل یا وحی پروردگار ر اور آسمانی کتابوں کا سہارا لے۔ لیکن وحی خداوند عالم اور قرآنی ارشادات اور اہلبیت عصمت و طہارت علیہم السلام کے نورانی بیانات کے لحاظ سے کسی بھی شک و تردید کا مقام نہیں ہے کہ انسان کا آخری کمال اسی کے وجود کا ایک مرتبہ و مقام ہے کہ جس کی طرف تقرب الہی کے عنوان سے اشارہ کیا گیا ہے اور اس کمال کے آثار رضائے پروردگار اور ابدی نعمتیں ہیں جو آخرت میں ظاہر ہوں گی اور اس تک پہنچنے کا کلی راستہ خدا پرستی اور تقویٰ ہے کہ جو تمام انفرادی اور اجتماعی زندگی کے تمام حالات میں شامل ہے لیکن عقلی نقطہ نظر سے اس موضوع کے لئے پیچیدہ ترین دلیلوں کو پیش کیا جاسکتا ہے کہ جس کے لئے کافی حد تک فلسفی مقدمہ اور تمہید کی ضرورت ہے، لیکن ہم یہاں بہت آسان گفتگو کرنا چاہتے ہیں۔

عقلی بیان

انسان فطری طور سے لامحدود کمالات کا خواہاں ہے علم اور قدرت ان کمالات کو ظاہر کرنے کا بہترین وسیلہ ہیں، اور ایسے کمال تک پہنچنا ہی لامحدود لذتوں اور ہمیشہ کی سعادت کا سبب ہے اور اس وقت یہ کمال انسان کے لئے میسر ہوتا ہے کہ جب انسان علم و قدرت کے لامحدود سرچشمہ اور کمال مطلق حقیقی یعنی خداوند عالم سے وابستہ ہو جائے، اور اسی رابطہ کو قرب خداوندی کا نام دیا

جاتا ہے بس انسان کا حقیقی کمال جو اس کا مقصد خلقت ہے خداوند عالم کے تقرب اور اس سے رابطہ کے زیر سایہ حاصل ہوتا ہے اور وہ انسان جو اس کمال کے سب سے کم اور پست مرتبے کو بھی اپنے پاس نہیں رکھتا یعنی جو شخص ضعیف ترین ایمان کا حامل بھی نہیں ہے وہ اس درخت کے مانند ہے جو ابھی پھل دینے نہیں لگا اگر ایسا درخت کسی آفتِ سماوی یا روگ و مرض کی وجہ سے پھل کی صلاحیت کو کھودے تو اس کی منزلت بے پھل درخت سے بھی زیادہ گر جائے گی اس بناء پر کمال اور انسانی سعادت میں ایمان کے کردار کی اہمیت اس لحاظ سے ہے کہ انسان کے روح کی اصل خصوصیات خداوند عالم سے علم و آگاہی اور اختیار کے ساتھ رابطہ قائم کرنا ہے اور بغیر اس رابطے کے مناسب کمال اور اس کے آثار سے محروم ہو جائے گا، بلکہ یوں کہا جائے کہ انسان کی انسانیت کا وجود نہیں ہو سکتا اور اگر انسان بڑے اختیارات کے ذریعہ ایسی بلند صلاحیتوں کو برباد کر دے، تو گویا اس نے اپنے اوپر بدترین ظلم کیا ہے اور وہ ابدی سزا کا مستحق ہوگا اور قرآن مجید ایسے لوگوں کے بارے میں فرماتا ہے ان شرّ الذّٰواب عند اللّٰہ الذّٰین کفروا فہم لائے و منون^۱ بے شک خدا کے نزدیک جانوروں میں کفار سب سے بدتر ہیں

پس وہ ایمان نہیں لاتے۔ خلاصہ یہ کہ ایمان اور کفر میں سے ہر ایک انسان کے لئے سعادت و کمال کی طرف ترقی کی حرکت یا عذاب و بدبختی کی طرف تنزیلی کی حرکت کو معین کرتا ہے اور ان میں سے جو بعد میں ہوگا وہی آخری اور عاقبت ساز اثر رکھے گا، (آخرت کی اچھائی یا بڑائی اسی کے قبضے میں ہے)۔ خواہش (محرك) اور نیت کا کردار مذکورہ اصل کو دیکھتے ہوئے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ انسان کے اختیاری کاموں کی حقیقی قدر و قیمت تب معلوم ہوگی، جب ہم یہ دیکھیں کہ وہ انسان کو حقیقی کمال یعنی قرب پروردگار تک پہنچانے میں کتنا اثر رکھتی ہے، اگرچہ بہت سے اعمال کسی نہ کسی طرح چاہے بعض امور کا سہارا لے کر ہی صحیح دوسروں کے بحال اور ترقی کے لئے راہ ہموار کرتے ہیں تو وہ اچھائی اور فضیلت سے متصف کئے جاتے ہیں، لیکن فاعل کی ابدی سعادت میں ان کی تاثیر اس اثر کے اوپر موقوف ہے جو روح کے بحال اور میں اعمال نے اثر چھوڑا تھا، دوسری جانب سے اگر دیکھا جائے تو خارج

^۱ زیادہ تفصیل معلوم کرنے کے لئے مؤلف کی کتاب (خود شناسی بر ای خود سازی) کی طرف رجوع کریں۔
^۲ انفالہ ۵۵،

افعال کا فاعل کی روح سے جو ارتباط ہے وہ ارادہ کے ذریعہ حاصل ہوتا ہے کہ یہ کام اس کے بغیر واسطہ کے ہے اور کام کا ارادہ مقصد اور نتیجہ کی محبت اور شوق و رجحان کی بنا پر وجود میں آتا ہے اور اسی کا نام خواہش اور سبب ہے جو روح کے اندر مقصد کی طرف بڑھنے کے لئے ایک حرکت پیدا کرتا ہے اور کام کے ارادہ کی شکل مجسم ہو کر ظاہر ہوتا ہے اس ارادی کام کی قدر و قیمت خواہش (سبب) اور فاعل کی نیت کے تابع ہے اور کام کے حسن کا بغیر فاعل کے حسن کے روح اور سعادت ابدی کے تکیال میں کوئی اثر نہیں ہے۔ اور یہی دلیل ہے کہ جو کام مادی اور دنیوی اسباب اور خواہشات کی بنا پر انجام پاتے ہیں وہ ابدی سعادت میں کوئی اثر نہیں رکھتے اور اگر اجتماعی اور معاشرے کی سب سے بڑی خدمت بھی (ریا) دکھاوے یا خود نمائی کے لئے ہو تو فاعل کو اس کا ایک ذرہ فائدہ نہیں پہنچے گا بلکہ ممکن ہے اس کے لئے نقصان اور روحی انحطاط کا باعث بن جائے اس لئے قرآن کریم آخرت کی سعادت میں اعمال صالحہ کی تاثیر کو ایمان اور قصد قربت *إِرَادَهُ وَجْهَ اللَّهِ وَابْتِغَاءَ مَرْضَاتِ اللَّهِ* پر مشروط اور موقوف جانا ہے حاصل کلام یہ ہے کہ نیک کام دوسروں کی خدمت کرنے میں منحصر نہیں ہے، دوسرا یہ کہ دوسروں کی خدمت کرنا بھی انفرادی عبادت کی طرح سعادت ابدی اور اخروی تکیال اور ترقی میں اس وقت موثر ہوگی کہ جب خدائی خواہشات اور آرزوؤں سے وابستہ ہو۔

سوالات

- (۱) ہر شئی کی حقیقی قدر و قیمت کس چیز میں ہے؟
- (۲) انسان کے آخری کمال کو کیسے پہچانا جاسکتا ہے؟
- (۳) ثابت کیجئے کہ انسان کا آخری کمال صرف ارتباط اور تقرب خدا کے زیر سایہ ہی حاصل ہو سکتا ہے؟
- (۴) ثابت کیجئے کہ نیک کاموں کی تاثیر انسان کی ابدی سعادت میں الہی مقصد اور مراد پر موقوف ہے؟

^۱ بقرہ ۲۴۶، نساء ۳۸، انفال ۴۷، مؤعون ۶،
^۲ نساء ۱۲۴، نحل ۹۷، اسراء ۱۹، طہ ۱۱۲، انبیاء ۹۴، غافر ۴۰، انعام ۵۲، کہف ۲۸، روم ۳۸، بقرہ ۲۶۵، ۲۰۷،

ستا و نواں درس

جط و تکفیر

مقدمہ

ایک اور مسئلہ جو ایمان و عمل صالح اور آخرت کی سعادت کے درمیان رابطے اور اس کے برخلاف کفر و گناہ اور ابدی شقاوت کے درمیان رابطے کے سلسلے میں پیش کیا جاتا ہے وہ یہ ہے کہ آیا ایمان اور کفر کے ہر لحاظ کا تعلق اس کے اخروی نتیجے سے ہے؟ اسی طرح کیا ہر اچھے اور برے اعمال کا رابطہ اس کی جزا یا سزا سے یقینی و ثابت نیز ناقابل تبدیل ہے؟ یا یہ کہ کسی نہ کسی طرح تبدیلی ایجاد ہو سکتی ہے؟ مثلاً نیک اعمال کے ذریعہ گناہوں کی تلافی کی جاسکتی ہے یا برعکس یعنی نیک کام کے اثر کو گناہ کے ذریعہ ختم کیا جاسکتا ہے؟ کیا وہ شخص جس نے اپنی حیات کے نصف حصے کو کفر و گناہ کی حالت میں گزارا اور باقی نصف زندگی کو ایمان اور اطاعت خدا میں بسر کیا ہے کچھ مدت تک عذاب میں گرفتار رہنے کے بعد اجر و ثواب کا مستحق ہو سکتا ہے؟ یا ایسا نہیں ہے بلکہ دونوں کو جمع کر کے جبری صورت میں اس کے لئے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے خوشنہی یا بد بخنہی کو معین کر دیا جائے گا؟ یا ایسا بھی نہیں ہے بلکہ کوئی اور راستہ نکالا جائے گا؟ یہ مسئلہ درحقیقت جط و تکفیر کے مسئلہ کے جیسا ہے، کہ جو قدیم زمانے سے اشاعرہ اور معتزلہ فرقوں کے علماء کلام کے درمیان موضوع بحث و گفتگو رہا ہے، اور ہم اس درس میں شیعوں کے نظریے کو خلاصہ کے طور پر بیان کریں گے۔

ایمان اور کفر کا رابطہ

گذشتہ درسوں میں ہم یہ جان چکے ہیں کہ بغیر اعتقادی اصولوں پر ایمان رکھے ہوئے کوئی عمل صالح ابدی خوشنہی کا ذریعہ نہیں بن سکتا بلکہ جملہ بدل کر کہا جائے کہ کفر اچھے اور شائستہ امور کو بے اثر بنا دیتا ہے، یہاں پر اس بات کا اضافہ ضروری ہے کہ انسان کی زندگی کے آخری لحاظ میں ایمان کا پایا جانا اس کے سابقہ کفر کے برے اثرات کو محو کر دیتا ہے، جس طرح روشن نور گذشتہ تاریکیوں کو برطرف

نیک و بد اعمال کا رابطہ

ایمان و کفر کے مابین موجود رابطہ کی طرح نیک و بد امور کے درمیان بھی اسی طرح کا رابطہ فرض کیا جاسکتا ہے، لیکن بطور کلی اس طرح نہیں کہ ہمیشہ انسان کے نامہ اعمال میں اس کے نیک کام ثبت ہو جائیں اور گزشتہ تمام برے اعمال اس سے مٹ جائیں (جیسا کہ بعض معترضی متکلمین کا نظریہ ہے) یا یہ کہ ہمیشہ دونوں اعمال کو جمع کر کے جبری صورت میں گزشتہ اعمال کی مقدار و کیفیت کو دیکھتے ہوئے اسی کے مطابق ثبت کر دیا جائے (جیسا کہ بعض دوسرے افراد کا نظریہ ہے) بلکہ اعمال کے متعلق تفصیل کا قائل ہونا پڑے گا یعنی اس طرح کہ بعض نیک اعمال اگر شایستہ طریقہ سے انجام دئے جائیں اور پیش خدا وہ امور قبول ہوں تو وہ برے اعمال کے اثرات کو ختم کر دیتے ہیں جیسے توبہ اگر مطلوب اور بہتر طریقہ سے انجام پائے، تو انسان کے گناہ بخش دئے جائیں گے^۱

اور یہ امر بالکل روشنی کی اس شعاع کی طرح ہے جو کسی خاص اور معین مقام پر پڑے اور اس جگہ کو روشن کر دے، لیکن ہر نیک عمل ہر گناہ کے اثر کو ختم نہیں کرتا، اور اسی لئے ممکن ہے ایک شخص مومن ایک مدت تک اپنے گناہوں کے عذاب میں مبتلا رہے اور آخر کار بہشت میں پہنچ جائے گو یا کہ انسان کی روح کے مختلف ابعاد (پہلو) میں اور اعمال نیک یا بد میں سے ہر ایک صرف ایک پہلو سے مربوط ہوتا ہے مثلاً وہ نیک عمل جو "الف" کے جنبہ سے متعلق ہے وہ "ب" کے جنبہ سے متعلق گناہوں کو محو نہیں کریگا، مگر یہ عمل صالح اتنا زیادہ نورانی ہو کہ جو روح کے دوسرے جوانب سرایت کر جائے یا گناہ اتنی زیادہ آلودگی رکھتا ہو کہ تمام پہلوں و اطراف و جوانب کو آلودہ کر دے جیسا کہ روایات شریفہ میں وارد ہوا ہے کہ قبول شدہ نماز گناہوں کو دھو دیتی ہے اور ان کے بخشش کا سبب بنتی ہے، اور قرآن کریم میں ارشاد ہے کہ (وَاقِمِ الصَّلَاةَ طَرَفِي النَّارِ وَزُلْفَا مِنَ اللَّيْلِ انِ الْحَسَنَاتِ تُذْهِبُ الْبِئَاتِ^۲) اے پیغمبر ﷺ آپ دن کے دونوں اطراف میں اور رات گئے نماز قائم کریں اس لئے کہ نیکیاں برائیوں کو ختم کر دینے والی ہیں۔ اور بعض گناہ جیسے عاق والدین، شراب پینا ایسے ہیں کہ جو ایک مدت تک عبادت کو قبول ہونے میں مانع ہو جاتے ہیں یا جیسے کسی کی

^۱ رجوع کریں، نساء، ۱۱۰، آل عمران، ۱۳۵، انعام، ۵۴، شوری، ۲۵، زمر، ۵۳، و..

^۲ ہود، ۱۱۴

مدد کرنے کے بعد احسان جتنا جو اس کام کے ثواب کو ختم کر دیتا ہے، جیسا کہ قرآن میں موجود ہے (لَا تَبْلُغُوا صَدَقَاتُكُمْ بِالْمَنِّ وَالْأَذَى^۱) اپنے احسانات اور صدقات کو احسان جتانے اور تکلیف پہنچانے کے ذریعہ ضائع نہ کرو، لیکن نیک و بد اعمال کے ایک دوسرے میں اثر انداز ہونا نیز اس کی نوعیت اقسام اور اس کی مقدار کو وحی خدا اور معصومین علیہم السلام کے کلمات کے ذریعہ معین کرنا پڑے گا، اور ان سب کے لئے کسی کئی قانون کو معین نہیں کیا جاسکتا۔ اس درس کے اختتام پر مناسب ہے کہ اشارہ کیا جائے کہ نیک و بد اعمال اس دنیا میں کبھی کبھی خوشحالی یا بد حالی، یا کسی نیک کام کی توفیق یا اس کے سلب ہو جانے میں اپنا اثر دکھاتے ہیں جیسا کہ دوسروں کے ساتھ نیکی کرنا، بالخصوص والدین اور قرابت داروں کے ساتھ احسان کرنا، طول عمر اور آفات و بلاؤں کے دور ہونے کا سبب بنتا ہے یا بزرگوں کی بے احترامی بالانحص معلم اور اساتذہ کی بے احترامی، توفیقات کے سلب ہو جانے کا باعث ہے، لیکن ان آثار کے مترتب ہونے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ انسان کو پوری جزا یا سزا اسے مل چکی، بلکہ جزا اور سزا کی اصلی جگہ قیامت ہے۔

سوالات

۱۔ جط و تکفیر کے معنی بیان کریں؟

۲۔ ایمان اور کفر کے درمیان کتنی طرح کے رابطے کا تصور کیا جاسکتا ہے؟ اور ان میں سے کون سا بہتر اور صحیح ہے؟

۳۔ اعمال نیک اور بد کے رابطہ کو کیسے فرض کیا جاسکتا ہے؟ ان میں سے کون سی صورت صحیح ہے؟

۴۔ آیا نیک و بد اعمال کے دنیوی اثرات آخرت کی جزا یا سزا کا مقام لے سکتے ہیں؟ یا نہیں؟

اٹھاونواں درس

مومنین کے امتیازات

مقدمہ

ہم خدا شناسی کے باب میں یہ جان چکے ہیں کہ خدا کے ارادہ کا اصل تعلق نیکیوں اور کمالات سے ہوتا ہے اور برائیوں اور نقائص کا تعلق ارادہ الہی سے بالتبع ہوتا ہے اسی کو دیکھتے ہوئے انسان کے متعلق بھی خدا کا اصلی ارادہ اس کی ترقی و تکامل اور ابدی خوشبختی تک رسائی اور وہاں کی ابدی نعمتوں سے فائدہ اٹھانے سے تعلق رکھتا ہے اور تباہکاروں اور گنہگاروں کا عذاب اور ان کی بدبختی جو ان کے برے انتخاب کے نتیجہ میں انہیں حاصل ہوئی ہے بالتبع خدا کے حکیمانہ ارادے میں شامل ہے اور اگر عذاب و اخروی بدبختی میں مبتلا ہونا خود انسان کے برے انتخاب کا نتیجہ نہ ہوتا، تو خدا کی بے پایان رحمت اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ اس کی ایک بھی مخلوق عذاب میں مبتلا نہ ہو لیکن یہ وہی خدا کی ہمہ گیر رحمت ہے کہ جس نے انسان کی آفرینش کا اقصاء اس کے اختیارات و انتخاب کی خصوصیت قرار دیا اور ایمان و کفر دونوں راستوں میں سے ہر ایک کے انتخاب اور اختیارات کا لازمہ ایک اچھے یا برے انجام تک پہنچ جانا ہے اس فرق کے ساتھ کہ نیک انجام تک پہنچ جانا، خدا کے اصلی ارادہ سے متعلق ہے اور دردناک عاقبت تک پہنچ جانا خدا کے تبعی ارادہ سے متعلق ہے اور یہی فرق اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ تکوین میں بھی اور تشریع میں بھی (یعنی خلقت میں بھی اور دستور العمل میں بھی) نیکی کے پہلو کو ترجیح دی جائے یعنی انسان فطری طور سے ایسا خلق کیا گیا ہے کہ نیک کام اس کی شخصیت کو بنانے میں گہرا اثر رکھیں اور تشریعی اعتبار سے مکلف کے لئے سہل و آسان ہو تاکہ سعادت کے راستہ کو طے کرنے اور ابدی

^۱ درس نمبر ۱۱ خدا شناسی کی طرف رجوع کریں۔

^۲ ہم دعائے کمیل میں پڑھتے ہیں، (فبا لبقین اقطع لو لا ما حکمت بہ من تعذیب جا حدیک و قضیت بہ من اخلاہ معا ندیک لجعلت النار کلبا بر دأ و سلا مأ و ما کانت لاحد فیہا مقراً ولا مقاماً۔

عذاب سے نجات پانے میں سخت اور جان لیوا تکلیفوں کا سامنا نہ کرنا پڑے اور جزا و سزا کے موقع پر بھی اس کی جزا کے پتے کو بھاری کر دیا جائے اور خدا کی رحمت اس کے غضب پر سبقت کر جائے اور خدا رحمت کا یہ تقدم و رجحان بعض امور میں مجسم ہو کر سامنے ظاہر ہو جاتا ہے کہ جس کے بعض نمونے ہمیں پر آپ کے سامنے ذکر کر رہے ہیں۔

ثواب میں اصناف

خداوند عالم راہ سعادت کے طلبگاروں کے لئے مقام انعام میں سب سے پہلی جس جزا کا قائل ہوا ہے وہ یہ ہے کہ صرف عمل کے برابر ثواب اپنے بندوں کو نہیں دیتا، بلکہ اس کو بڑھا کے عطا کرتا ہے یہ مفہوم قرآن مجید کی بعض آیتوں میں بالکل صاف بیان کیا گیا ہے، ہن جملہ سورہ نمل کی آیت نمبر (۸۹) میں ارشاد ہو رہا ہے، (مَنْ جَاءَ بِحَسَنَةٍ فَلَهُ خَيْرٌ مِنْهَا) جو کوئی بھی نیکی انجام دے گا اس سے بہتر اس کی جزا پائے گا۔ اور سورہ شوریٰ کی آیت نمبر (۲۳) میں ارشاد ہے (وَمَنْ عَمِلَ خَيْرًا فَلَهُ أَجْرٌ يُزِيدُ) جو کوئی بھی نیک کام انجام دے گا ہم اس کی نیکی کو بڑھا دیں گے۔ اور سورہ یونس کی آیت نمبر (۲۶) میں فرما رہا ہے (لَلَّذِينَ اسْتَوُوا الْخَيْرُ وَ زَيْدٌ) ان لوگوں کے لئے جنہوں نے نیکی کی ہے، نیکی بھی ہے اور اصناف بھی ہے۔

اور سورہ نساء کی آیت نمبر (۴۰) میں اس طرح آیا ہے کہ، (إِنَّ اللَّهَ لَظَلِيمٌ مُّثَالُ ذُرَّةٍ وَإِنْ تَكَ حَسَنَةً لِّمَنْ ضَاعَتْهَا وَ لَيْسَ مِنْ لَدُنْهُ أَجْرٌ عَظِيمًا) اللہ کسی پر ذرہ برابر ظلم نہیں کرتا انسان کے پاس نیکی ہوتی ہے تو اسے دوگنا کر دیتا ہے اور اپنے پاس سے اجر عظیم عطا کرتا ہے اور سورہ انعام کی آیت نمبر (۱۶۰) میں ارشاد الہی ہے: (مَنْ جَاءَ بِحَسَنَةٍ فَلَهُ عَشْرُ مِثَالِهَا وَمَنْ جَاءَ بِسَاءَةٍ فَلَهُ نَجْمٌ) (الْمِثْلُ مِثْلًا وَنَجْمٌ لَظَلْمُونَ) جو شخص بھی نیکی کرے گا، اسے دس گنا اجر ملے گا اور جو برائی کرے گا اسے صرف اتنی ہی سزا ملے گی اور کوئی ظلم نہ کیا جائے گا۔

^۱ (یرید اللہ بکم الیسر ولا یرید بکم العسر) بقرہ ۱۵۸، وما جعل علیکم فی الدین من حرج -

حج ۷۸،

^۲ سبقت رحمته غضبه

گناہانِ صغیرہ کی بخشش

سعادت کی راہ پر چلنے والوں کیلئے ایک دوسرا امتیاز یہ ہے کہ اگر مومنین بڑے گناہوں سے پرہیز کرنے لگیں تو خدا اتنا مہربان ہے کہ وہ ان کے چھوٹے گناہ بھی معاف کر دیگا اور اس کے اثر کو محو کر دیگا جیسا کہ سورہ نساء کی آیت نمبر (۳۱) میں ارشاد ہو رہا ہے (ان تجنبوا کبار ما تنہون عنہ تکفروا عنکم یناکلم وند حکلم ند خلا کر یا) اگر تم بڑے بڑے گناہوں سے کہ جن سے تمہیں روکا گیا ہے پرہیز کر لو گے تو ہم دوسرے گناہوں کی پردہ پوشی کر دیں گے اور تمہیں با عزت منزل تک پہنچا دیں گے۔

واضح رہے کہ ایسے لوگوں کے چھوٹے گناہوں کو بخشنے جانے کے لئے توبہ کی شرط نہیں ہے کیونکہ توبہ بڑے بڑے گناہوں (گناہ کبیرہ) کے بخشنے کا بھی سبب ہے۔

دوسروں کے اعمال سے استفادہ

مومنین کے لئے ایک دوسری برتری یہ ہے کہ خداوند عالم فرشتوں اور اپنے خاص چنے ہوئے بندوں کے استغفار کو ان مومنین کے حق میں قبول کرتا ہے، اور سارے مومنین کی دعاؤں اور استغفار کو ان کے حق میں قبول کرتا ہے۔

اور یہاں تک کہ ان اعمال کے ثواب جو دوسرے لوگ کسی مومن کے لئے ہدیہ کرتے ہیں اس کو بھی ان مومنین تک پہنچاتا ہے یہ مطالب آیات اور روایات میں بہت کثرت کے ساتھ بیان کئے گئے ہیں، لیکن چونکہ یہ موضوع شفاعت کے مسئلے سے بلا واسطہ رابطہ رکھتا ہے لہذا ہمیں چاہیے کہ قدر تفصیل سے اس موضوع پر روشنی ڈالیں اس لئے ہم اسی پر اکتفاء کرتے ہیں۔

سوالات

- ۱۔ رحمت الہی کے بہت کرنے کا راز کیا ہے؟
- ۲۔ تکوین و تشریح میں اس بہت کے مجسم ظاہر ہونے کو بیان کریں؟ ۳۹
- ۳۔ اس کے موارد کو انسان کی جزا و سزا میں وضاحت کے ساتھ بیان کریں؟

انٹھواں درس

شفاعت

مقدمہ

من جملہ ان خصوصیات میں سے ایک ایسی خصوصیت کہ جس کو خداوند عالم نے مومنین سے مخصوص کر دیا ہے وہ یہ ہے کہ اگر کوئی مومن شخص مرتے دم تک اپنے ایمان کی حفاظت کر لے جائے اور ایسے گناہوں کا ارتکاب نہ کرے، جو اس کی توفیقات کے سلب ہو جانے کا باعث بنے اور اس کی عاقبت کی بد بختی شک و شبہ یا انکار جحود کی منزل تک پہنچا دے، اور ایک جملہ میں یوں خلاصہ کر دیا جائے کہ اگر ایمان کے ساتھ اس دنیا سے اٹھائے تو وہ ہرگز ابدی عذاب میں مبتلا نہیں ہوگا اس لئے کہ اس کے چھوٹے گناہ، بڑے گناہوں سے پرہیز کرنے کی وجہ سے بخش دئے جائیں گے،

اور اس کے بڑے گناہ تو بہ و استغفار کے وسیلہ سے معاف کر دئے جائیں گے، اور اگر اسے ایسی توبہ کی توفیق حاصل نہ ہو سکی، تو دنیا کی مصیبتیں اور پریشانیاں اس کے گناہوں کے بوجھ کو ہکا کر دیں گی نیز برزخ اور قیامت کی ابتدائی سختیاں اس کے اعمال کے نقائص اور آلودگیوں کو دور کر دیں گی اور اگر اس کے باوجود اسکے گناہوں کی آلودگی پاک نہ ہو سکی تو شفاعت کے وسیلہ سے جو اولیاء خدا خصوصاً حضور سرور کائنات اور ان کے اہل بیت [ع] جو خدا کی وسیع و عظیم رحمت کی جلوہ نمائی کرتے ہیں، کے ذریعہ جہنم کے عذاب سے نجات پا جائیں گے اور بے شمار روایات کی روشنی میں وہ مقام محمود^۲ جس کا وعدہ پیغمبر ﷺ کو دیا گیا ہے وہ اسی مقام شفاعت کا نام ہے اور خود یہ آیہ شریفہ (وَلَوْ فِیْطِیْکَ رَبُّکَ فَتَرْضٰی)^۳ اور تمہارا پروردگار تمہیں اتنا عطا کر دے گا

^۱ (اِذْ خَرْتُ شَفَاعَتِیْ لَا هَلَّ الْکِبَارُ مِنْ اَمْتِیْ) میں نے اپنی شفاعت اپنے امت کے گنہگاروں کے لئے ذخیرہ کیا ہے، بحار لانوار، ج ۸ ص ۳۷-۴۰،

^۲ اسراء، ۷۹،

^۳ ضحیٰ، ۵

کہ تم خوش ہو جاؤ گے حضور کی شفاعت کے ذریعہ الہی بخشش کی طرف اشارہ ہے جو مستحق افراد کے شامل حال ہوگی۔ اس بنا پر گنہگار مومنین کی سب سے بڑی اور آخری امید اور آسرا شفاعت ہے لیکن اس کے باوجود خدا کے عذاب سے امان کا یقین نہیں کر لینا چاہیے بلکہ ہمیشہ یہ خوف دل میں جاگتا رہے کہ خدا نخواستہ اس سے کوئی ایسا فعل سرزد ہو جائے جو مرتے دم تک کبھی بھی اس کی عاقبت کی بربادی یا ایمان کے سلب ہو جانے کا سبب بن جائے، اور خبردار کہیں ایسا نہ ہو کہ دنیا کی محبت ان کے دلوں میں اس حد تک رسوخ کر جائے کہ (معاذ اللہ) وہ اللہ کی دشمنی کے ساتھ اس دنیا سے رخصت ہو اس لئے وہ لوگ یہ دیکھ رہے ہیں کہ خدا ہے جو ان کے اور ان کی محبوب اور معشوق اشیاء کے درمیان موت کے ذریعہ جدائی ڈال دیتا ہے۔

شفاعت کا مفہوم

شفاعت مادہ شفیع سے لیا گیا ہے جو جوڑے کے معنی میں ہے اور عرف عام میں اس کے یہ معنی ہیں کہ کوئی باعزت انسان کسی بزرگ شخصیت سے کسی مجرم کی سزا سے چشم پوشی یا کسی خدمت گزار کی اجرت میں اضافہ کی درخواست کرے اور شاید ایسے مقامات پر لفظ شفاعت کو استعمال کرنے کا نکتہ یہ ہو کہ مجرم انسان خود بخود بچنے جانے کا مستحق نہیں ہوتا، یا خدمت کار خود بہ خود اجرت میں اضافہ کا استحقاق نہیں رکھتا لیکن سفارش کرنے والے (شفیع) کی درخواست کا منسلک ہو جانا اسے اس کا مستحق بنا دیتا ہے عام حالات میں کوئی کسی سفارش کرنے والے کی سفارش کو اس لئے قبول کر لیتا ہے وہ اس بات سے ڈرتا ہے کہ اگر اس کی سفارش کو قبول نہ کرے گا تو وہ ناراض ہو جائے گا اور اس کا رنجیدہ خاطر ہونا اس کی الفت یا خدمت کی لذت سے محرومی کا سبب بنے گا، یا ممکن ہے کہ سفارش کرنے والے کی جانب سے نقصان پہنچنے کا باعث ہو وہ مشرکین جو اس دنیا کو پیدا کرنے والے خدا کے لئے انسانی اوصاف کے قائل تھے جیسے شریک حیات، مونس و مددگار دوست ہم مشغلہ ساتھی کی محبت کی ضرورت یا اپنے رقیب اور اپنے برابر کی شخصیت سے خوف وغیرہ، وہ خدا کے لئے ان سب صفات کے اس لئے قائل تھے کہ ان کی توبہ ان لوگوں کی طرف مبذول ہو جائے اور وہ اس کے غضب سے محفوظ رہیں، اور اسی لئے وہ لوگ بتوں اور مجسموں کے

مقابلہ میں فرشتوں اور جناتوں کی پرستش کرتے تھے اور کہتے تھے۔ (ہُوَ لَاعِ شَفَاعًا وَنَا عِنْدَ اللّٰہِ) ^۱ یہ سب خدا کے نزدیک ہماری شفاعت کرنے والے میں اور کہتے تھے: (مَا نَعْبُدُکُمْ اِلَّا لِیَقْبَلُنَا اِلَی اللّٰہِ زُلْفٰی) ^۲ ہم ان کی پرستش صرف اس لئے کرتے ہیں کہ ہمیں اللہ سے قریب کر دیں گے۔ اور قرآن مجید ان لوگوں کے جاہلانہ خیالات کو اس طرح باطل کرتے ہوئے فرماتا ہے: (لَیْسَ لَنَا مِنْ دُونِ اللّٰہِ وَلِیٌّ وَلَا شَفِیْعٌ) ^۳ لیکن غور و فکر کا مقام ہے کہ ایسے شفاعت کرنے والوں اور ایسی شفاعت کی نفی کرنے کے معنی مطلقاً شفاعت کا انکار کرنا نہیں ہے، خود قرآن مجید میں آیات موجود ہیں جو شفاعت کو (خدا کی اجازت اور اس کے اذن سے) ثابت کرتی ہیں (شفاعت باذن اللہ) اور وہ آیات شفاعت کرنے والوں اور بجلی شفاعت کی جائے گی ان کی شرائط کو بھی بیان کر رہی ہیں اور خدا کی جانب سے اجازت یافتہ شفاعت کرنے والوں کی شفاعت کا قبول ہونا، کسی خوف یا ضرورت کی وجہ نہیں ہے بلکہ یہ ایک ایسا راستہ ہے جسے خداوند عالم نے ان لوگوں کے لئے کھولا ہے۔

جن کے اندر رحمت الہی کی لیاقت کم پائی جاتی ہے اور اس کے واسطے کچھ شرطیں اور اصول قرار دیئے ہیں اور درحقیقت صحیح شفاعت پر عقیدہ، اور شرک آمیز شفاعت پر عقیدہ کے درمیان وہی فرق ہے جو فرق خدا کی جانب سے حاکمیت اور تدبیر، اور خود مختار حاکمیت و تدبیر کے درمیان میں ہے جو خدا شناسی کے باب میں بیان ہو چکی ہے کبھی کبھی شفاعت کا لفظ اس سے بھی زیادہ وسیع معنی میں استعمال ہوتا ہے اور انسان کے اندر دوسرے کے ذریعہ اچھا اثر ظاہر ہونے کو بھی شامل ہے جیسے ماں باپ اپنی اولاد کے متعلق یا اس کے برعکس اسی طرح معلم اور رہنما اپنے شاگردوں کے متعلق اور یہاں تک کہ موزن ان لوگوں کے متعلق جو اس کی آواز کو سن کر ناز کو یاد کرتے ہوئے مسجد کی طرف چل پڑتے ہیں شفاعت کریں گے اور درحقیقت ہر نیک اثر جو اس دنیا میں انجام دیا گیا ہے وہ شفاعت اور مدد کی شکل قیامت کے دن ظاہر ہوگا۔ دوسرا نکتہ یہ ہے کہ گنہگاروں کی توبہ و

^۱ یونس ۱۸، روم ۱۳، انعام ۹۴، زمر ۴۴، وغیرہ

^۲ زمر ۳

^۳ انعام ۷۰، ۵۱، سجدہ ۴، زمر ۴۴،

^۴ رجوع کریں، باب خدا شناسی درس نمبر ۱۶،

استغفار اسی دنیا میں ان کے لئے ایک طرح کی شفاعت ہے اور یہاں تک کہ دوسروں کے حق میں دعا کرنا اور خدا سے ان کی حاجتوں کو پورا ہونے کی درخواست کرنا درحقیقت خدا کے نزدیک شفاعت شمار کی جاتی ہے، کیونکہ یہ ساری چیزیں خدا کے نزدیک کسی انسان تک نیکی پہنچانے یا کسی سے شر کو دور کرنے کے لئے واسطہ ہے۔

شفاعت کے اصول

جیسا کہ اشارہ کیا جا چکا ہے کہ شفاعت کرنے یا شفاعت پانے کے لئے بنیادی شرط خدا کی اجازت ہے، جیسا کہ سورہ بقرہ کی آیت نمبر ۵۵ میں ارشاد ہوا ہے (مَنْ ذَا الَّذِي يَشْفَعُ عِنْدَهُ إِلَّا بِإِذْنِهِ) کون ہے جو اس کی بارگاہ میں اس کی اجازت کے بغیر سفارش کر سکے، اور سورہ یونس کی آیت نمبر ۳ میں یوں ارشاد ہے (مَا مِنْ شَفِيعٍ إِلَّا مِنْ بَعْدِ إِذْنِهِ) کوئی سفارش نہیں کر سکتا مگر اس کی اجازت کے بعد اور سورہ طہ کی آیت نمبر ۱۰۹ میں بھی ارشاد ہو رہا ہے: (يَوْمَ لَا تَنْفَعُ الشَّفَاعَةُ إِلَّا لِمَنْ أَذِنَ لَهُ الرَّحْمَنُ وَرَضِيَ لَهُ قَوْلًا) اس دن کسی کی سفارش کام نہ آئے گی، ہوائے ان کے جنہیں خدا نے اجازت دیدی ہو اور وہ ان کی بات سے راضی ہو۔

اور سورہ براء کی آیت نمبر ۲۳ میں فرماتا ہے: (وَلَا تَنْفَعُ الشَّفَاعَةُ عِنْدَهُ إِلَّا لِمَنْ أَذِنَ لَهُ) اس کے نزدیک کسی کی سفارش کام نہ آئے گی مگر اس کی جس کو اجازت دی گئی ہو ان آیات سے اجمالی طور سے خدا کی اجازت ثابت ہوتی ہے لیکن اجازت یافتہ افراد کی خصوصیت کا اندازہ نہیں ہوتا، لیکن دوسری آیات کے ذریعہ طرفین (شفاعت کرنے والے اور شفاعت پانے والے) کی شرطوں کو واضح کیا جاسکتا ہے جیسا کہ سورہ زخرف کی آیت نمبر ۸۶ میں ہے: (وَلَا يَكِلُ الَّذِينَ يَدْعُونَ مِنْ دُونِ الشَّعَائَةِ إِلَّا مَنْ شَهِدَ بِالْحَقِّ وَهُمْ يَعْلَمُونَ) اور وہ لوگ جو خدا کے علاوہ کسی اور کو آواز دیتے ہیں شفاعت کا حق نہیں رکھتے) اور کسی کو بھی شفاعت کا حق نہیں (مگر وہ جو حق کی گواہی دے اور علم بھی رکھتا ہو، شاید (مَنْ شَهِدَ بِالْحَقِّ) سے مراد اعمال کے اوپر گواہ فرشتے ہوں جو خدا کی تعلیم کے ذریعہ بندوں کے اعمال اور نیتوں سے واقف رہتے ہیں اور ان کی رفتار و کردار کی قدر و قیمت اور کیفیت پر شہادت دے سکتے ہیں جیسا کہ حکم اور موضوع کے تناسب سے استادہ کیا جاسکتا ہے کہ سفارش کرنے والوں کے پاس اتنا علم ہونا چاہیے

ہے کہ جو شفاعت پانے والوں کی صلاحیت کی تشخیص دے سکیں۔ اور یقینی طور سے ان دونوں شرائط کے حامل وہ معصومین [ع] ہیں، دوسری طرف سے بعض آیات سے استفادہ ہوتا ہے کہ شفاعت پانے والے مرضی خدا کے حق دار ہوں جیسا کہ سورہ انبیاء کی آیت نمبر ۲۸ میں ارشاد ہے: (وَلَا يَشْفَعُونَ إِلَّا لِمَنْ ارْتَضَىٰ) سفارش نہیں کر سکتے مگر یہ کہ خدا اس کو پسند کرے اور سورہ نجم کی آیت نمبر ۲۶ میں ارشاد ہے: (وَكُلُّ مَنْ مَلَكَ فِي السَّمَوَاتِ لَا تَغْنِي شَفَاعَتُهُمْ شَيْئًا إِلَّا مَنْ بَعْدَ أَنْ يَأْذَنَ اللَّهُ لِمَنْ يَشَاءُ وَيُرْضَىٰ) اور آسمانوں میں کتنے ہی ایسے فرشتے ہیں جن کی سفارش کسی کے کام نہیں آسکتی، جب تک خدا جس کے بارے میں چاہے اور پسند نہ کرے اجازت نہ دیدے۔

صاف ظاہر ہے کہ رضائے پروردگار کی منزل میں ہونے سے مراد یہ نہیں ہے کہ اس کے سارے اعمال پسندیدہ ہوں ورنہ شفاعت کی کوئی ضرورت نہیں ہے بلکہ مراد یہ ہے کہ خود شخص دین و ایمان کے لحاظ سے مرضی خدا کے مطابق ہو جیسا کہ روایات میں اسی عنوان سے تفسیر ہوئی ہے۔ دوسری طرف چند آیتوں میں ان لوگوں کی خصلت جن کی سفارش نہیں ہو سکتی بیان کی گئی ہے، جیسے سورہ شعراء کی آیت نمبر ۱۰۰ میں مشرکین کے قول کو نقل کر رہا ہے (فَالنَّاسُ شَافِعِينَ) اور سورہ مدثر کی آیت نمبر ۴۰ سے ۴۸ تک آیا ہے کہ مجرموں کے دوزخ میں جانے کے سبب کے بارے میں سوال کیا جائے گا تو وہ لوگ جواب میں ترک نماز، بیکسو کی مدد نہ کرنے روز قیامت کے جھٹلانے کی خصلت کو گنوائیں گے اس کے بعد ارشاد ہے (فَاَتَفَعَمُ شَفَاعَةُ الشَّافِعِينَ) اس آیت سے استفادہ ہوتا ہے کہ وہ مشرکین اور قیامت کا انکار کرنے والے جو خدا کی عبادت نہیں کرتے اور اس کے محتاج بندوں کی مدد نہیں کرتے، اور صحیح اصول و قوانین کے پابند نہیں ہیں۔

شفاعت ہر گز ان کے شامل حال نہیں ہوگی اور اس بات پر غور کرتے ہوئے کہ پیغمبر ﷺ کا استغفار بھی اس دنیا میں ایک طرح کی شفاعت ہے اور ان کا استغفار ان لوگوں کے حق میں جو اس بات کے لئے حاضر نہیں ہیں، آپ سے استغفار و شفاعت کی

^۱ امام صادقؑ اپنی زندگی کے آخری لمحات میں فرمایا: (إِنَّ شَفَاعَتَنَا لَا تَنَالُ مُسْتَخْفًا بِالصَّلَاةِ) ہماری شفاعت اس انسان تک نہیں پہنچ سکتی جو نماز کو ہلکا سمجھے۔ بحار الانوار، ج ۴ ص ۲

درخواست کریں شامل نہیں ہوگا اس سے اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ شفاعت کا انکار کرنے والا بھی شفاعت کا حق دار نہیں ہے جیسا کہ یہی مضمون احادیث میں ذکر ہوا ہے^۱ حاصل کلام یہ ہے کہ مطلقاً اور اصلی غارش کرنے والے کے لئے ضروری ہے کہ خدا کی اجازت کے علاوہ خود بھی مصیبت کا رنہ ہو اور دوسروں کے گناہ اور اطاعت کے مراتب کو سمجھنے کی قدرت رکھتا ہو نیز سچے پیروکار بھی ان کے زیر سایہ شفاعت کے کمترین مرتبہ کے مالک ہوتے ہیں جیسا کہ ایسے افراد شہداء اور صدیقین کے زمرہ میں محثور کئے جائیں گے^۲ اور دوسری طرف صرف وہ لوگ شفاعت پانے کا حق رکھتے ہیں جو خدا کی اجازت کے علاوہ خدا و رسول اور قیامت اور وہ چیزیں جو خدا نے نبی ﷺ پر نازل کی ہیں جیسے شفاعت کی حقانیت پر ایمان رکھنا، نیز اس اعتقاد پر آخر دم تک باقی رہنا ہے۔

سوالات

۱۔ شفاعت کے معنی اور اس کے استعمال کے موارد کو تفصیل سے بیان کریں؟

۲۔ صحیح شفاعت اور شرک آمیز شفاعت کے درمیان فرق بیان کیجئے؟

۳۔ شفاعت کرنے والے کے شرائط کی وضاحت کیجئے؟

۴۔ شفاعت پانے والے کے شرائط کی وضاحت کیجئے؟

^۱ منافقون ۶۵۔

^۲ (عن النبی ﷺ) مَنْ لَمْ يُمْنْ بِشَفَاعَتِي فَلَا اِنَّالَہُ اِلَہَ شَفَاعَتِي (جو میری شفاعت پر ایمان نہیں رکھتا خدا میری شفاعت کو اس کے شامل حال نہیں کرے گا، بحار لانوار ج ۸ ص ۵۸،

^۳ (وَالَّذِينَ آمَنُوا بِاللّٰهِ وَرَسُولِهِ اُولَٰئِكَ هُمُ الصّٰدِقُونَ وَالشّٰہِدَۃُ عِنْدَ رَبِّہِم) جو خدا اور رسول ﷺ پر ایمان لائے خدا کے نزدیک وہی لوگ صدیقین اور شہداء ہیں،

ساٹھواں درس

چند شبہات کا حل

شفاعت کا انکار کرنے والی آیتوں کا جائزہ

شفاعت کے متعلق بہت سے اعتراضات اور شبہات ذکر کئے گئے ہیں کہ جن میں سے بعض اہم شبہات کا ذکر ہم اس درس میں کرنا چاہتے ہیں: سب سے پہلا شبہ یہ ہے کہ قرآن مجید کی متعدد آیتیں اس بات پر دلالت کرتی ہیں، کہ قیامت کے روز کسی کی شفاعت کو قبول نہ کیا جائے گا، جیسا کہ سورہ بقرہ کی آیت نمبر ۴۸ میں ارشاد ہو رہا ہے (وَاتَّقُوا يَوْمًا لَا تَجْزِي نَفْسٌ عَنْ نَفْسٍ شَيْئًا وَلَا يُتَقَبَّلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ وَلَا يُؤْخَذُ مِنْهَا عَدْلٌ وَلَا هُمْ يُنصَرُونَ) اس دن سے ڈرو کہ جب کوئی کسی کے کام نہی آئیگا اور نہ ہی کسی کی سفارش قبول کی جائے گی اور نہ ہی کسی سے عوض اور بدلہ لیا جائے گا، اور نہ اس کی کوئی مدد کی جائے گا۔

جواب: اس کا جواب یہ ہے کہ ایسی آیات بے اصول اور استغالی (خود مختار) شفاعتوں کی نفی میں ہیں ہے کہ بعض لوگ جس کا اعتقاد رکھتے ہیں، اس کے علاوہ مذکورہ آیات عام میں اور یہ ان آیات کے ذریعہ جو شفاعت کے قبول کئے جانے پر دلالت کرتی ہیں تخصیص پاگئی ہے جیسا کہ گذشتہ درس میں ان کی طرف اشارہ کیا ہے۔

شبہ: شفاعت کے صحیح ہونے کا مطلب یہ ہے کہ خداوند عالم شفاعت کرنے والوں کے زیر اثر آگیا ہے یعنی ان لوگوں کی شفاعت خدا کے بخش دیئے جانے کا سبب بن گئی جبکہ وہ خدا فضل ہے۔

جواب: شفاعت کے قبول ہونے کا معنی زیر اثر آنا نہیں (متاثر) ہے جیسا کہ دعا اور توبہ کا قبول ہونا ایسا غلط معنی نہیں رکھتا کیونکہ

نکہ ان سارے مقامات پر بندوں کے کام رحمت الہی کے قبول کرنے کی آمادگی کا سبب اور ذریعہ میں اور اس اصطلاح (مقولے) کے لحاظ سے کہ قبول کرنے والے کی قابلیت شرط ہے نہ کہ انجام دینے والے کی فاعلیت۔

شبہ: شفاعت کا لازمہ یہ ہے کہ شفاعت کرنے والے خدا سے بھی زیادہ مہربان ہو گئے ہیں، کیونکہ ہمارا فرض یہ ہے کہ اگر ان کی شفاعت نہ ہوئی تو گنہگار عذاب میں مبتلا ہو جاتا یا اس کا عذاب دائمی ہو جاتا۔

جواب: شفاعت کرنے والوں کی ہمدردی یا مہربانی خدا کی بے پایا رحمت کی ایک جھلک ہے یا یوں کہا جائے کہ شفاعت ایک ایسا راستہ ہے جسے خود پروردگار عالم نے اپنے گنہگار بندوں کے لئے قرار دیا ہے اور حقیقت میں اس کی رحمت کے مجسم اور ظاہر ہونے کا سب سے اعلیٰ نمونہ ہے جو اس کے نیک اور منتخب بندوں کے ذریعہ ظاہر ہوتا ہے، اور اسی طرح توبہ اور دعا بھی دوسرے وسیلے ہیں کہ جنہیں خدا نے مرادوں کے پوری ہونے اور گناہوں کے بٹنے جانے کے لئے قرار دیا ہے۔

شبہ: ایک اور اعتراض یہ ہے کہ اگر گنہگاروں کے عذاب کے متعلق خدا کا حکم اس کی عدالت کا تقاضا ہوتا تو ان لوگوں کے لئے شفاعت کا قبول کر لینا اس کی عدالت کے خلاف ہو گا۔

جواب: جتنے بھی احکام الہی میں چاہے شفاعت سے پہلے عذاب کا حکم یا شفاعت کے بعد عذاب سے نجات کا حکم، اس کی عدل و حکمت کے مطابق ہے اور دونوں حکموں کے عادلانہ اور حکیمانہ ہونے میں دو ضدوں کے جمع ہونے والی نسبت بھی نہیں ہے اس لئے کہ اس کا موضوع الگ ہے اس کی وضاحت اس طرح کی جاسکتی ہے کہ عذاب کا حکم ارتکاب گناہ کا تقاضا ہے ان اسباب سے قطع نظر کہ جو گنہگار کے حق شفاعت کے قبول کا موجب ہے اور عذاب سے نجات کا مذکورہ حکم اسباب کے ظہور کا سبب ہے اور حکم کا بدلنا موضوع کی قید کے بدلنے کے تابع ہے بہت فراوانی کے ساتھ جس کی مثال احکام اور تکوینی مقدرات

اور تشریعی احکام و قوانین کے اندر مل جائیں گی اور اسی طرح اپنے اپنے زمانے کے اعتبار سے حکم منوخ اور حکم ناخ کے عا
دلائل ہونے میں کوئی منافات نہیں ہے، نیز دعا اور صدقہ دینے سے مصیبتوں کے برطرف ہونے کے حکیمانہ ہونے میں کوئی منافا
ت نہیں ہے اور شفاعت کے بعد گناہوں کے بچنے جانے کا حکم، شفاعت کے تحقق سے پہلے عذاب کے حکم کے منافی نہیں
ہے۔

شبہ: ایک اور اشکال یہ ہوتا ہے کہ خداوند عالم نے شیطان کی پیروی کو دوزخ کے عذاب میں مبتلا ہونے کا سبب جانا ہے: جیسا کہ
سورہ حجر کی آیت نمبر ۴۳، ۴۴ میں ارشاد فرماتا ہے (ان عبادي ليس لك عليهم سلطان الا من اتبعك من الغاوين)* وان جهنم لموعدهم
الجمعین) بیشک تو (اے ابلیس!) میرے بندوں پر مسلط نہیں ہو سکتا، مگر وہ گمراہ لوگ جو تیری پیروی کریں اور ان کی ہمیشہ کی
جگہ جہنم ہے اور حقیقت میں گنہگاروں کو قیامت میں عذاب میں گرفتار کرنا، خدا کی سنت ہے اور ہم یہ بھی جانتے ہیں سنت خدا،
تغیر و تبدیلی نہیں ہو سکتی جیسا کہ سورہ فاطر کی آیت نمبر ۴۳ میں فرماتا ہے (فَلَنْ تَجِدَ لِسِيَ اللَّهِ تَبْدِيلًا وَلَنْ تَجِدَ لِسِيَ اللَّهِ تَحْوِيلًا) تم ہرگز
سنت الہی میں تبدیلی نہیں پاؤ گے اور ہرگز سنت پروردگار میں تغیر نہیں پا سکتے لہذا کیسے ممکن ہے کہ یہ سنت شفاعت کے ذریعہ
ٹوٹ جائے؟

جواب: اس کا جواب یہ ہے کہ واجد الشرائط گنہگاروں کے بارے میں شفاعت کا قبول کرنا، خدا کی ناقابل تبدیل سنتوں میں سے
ایک ہے، اس کی تفصیل یہ ہے کہ خداوند عالم کی سنت حقیقی معیار اور ملاک کے تابع ہے اور کوئی بھی سنت جس کے سارے تقاضے
ضرے اور وجودی و عدمی شرائط پائے جائیں گے وہ تبدیلی کو قبول نہیں کر سکتی، لیکن وہ عبارتیں جو اس سنت پر دلالت کرتی ہیں
وہ پوری طرح سے موضوع اور اس کے تمام شرائط و قیود کو بیان نہیں کر رہی ہیں، اس رو سے ایسے مورا دپائے جاتے ہیں کہ
جہاں ظاہری طور سے آیات چند مختلف سنتوں کو شامل ہے جب کہ حقیقت میں آیت کا مصداق انحصار اور اقوی ملاک کا تابع ہے
لہذا ہر سنت اپنے موضوع کی واقعی قیود و شرائط کو دیکھتے ہوئے (نہ صرف وہ قیدیں اور شرطیں جو عبارت میں آئیں ہیں) ٹا

بت اور غیر قابل تغیر ہے انہیں میں سے ایک سنت کا نام شفاعت ہے جو خاص گنہگاروں کے لئے جن کے اندر معین شرائط پائے جاتے ہوں اور معین اصول و قوانین ان کے شامل حال ہے ثابت اور ناقابل تبدیل ہے۔

شبہ: شفاعت کا وعدہ، لوگوں کو گناہ کے مرتکب ہونے اور بے راہ روی میں گستاخ اور جبری بنا دیتا ہے۔

جواب: اس اعتراض کا جواب تو بہ قبول ہونے اور گناہوں کے ختم ہو جانے کے سلسلے میں بھی پیش کیا جاسکتا ہے وہ یہ ہے کہ شفاعت اور مغفرت کا شامل حال ہونا، کچھ شرائط کے اوپر موقوف ہے کہ گنہگار انسان ان شرائط کے حصول کا یقین نہیں حاصل کر سکتا اور شفاعت پانے کے من جملہ شرائط یہ ہیں کہ انسان اپنے ایمان کو تادم مرگ بچالے جائے اور ہم یہ جانتے ہیں کہ کوئی بھی انسان ایسی شرط کے پورے ہونے کا یقین نہیں کر سکتا دوسری طرف سے اگر کوئی انسان کسی گناہ کا مرتکب ہو گیا اور اسے اپنے اس گناہ کی بخشش کی کوئی امید ہو تو وہ مایوسی اور ناامیدی میں گرفتار ہو جائیگا اور مایوسی اس کے اندر گناہ کو ترک کرنے کے حوصلہ کو ضعیف کر دے گی نیز اسے آئندہ اسی غلط راستے پر چلنے کی ترغیب دلا دے گی اسی لئے الہی مربی کی روشن تربیت یہ ہے کہ ہمیشہ لوگوں کو خوف اور امید کے درمیان ور کے رکھے یعنی رحمت الہی اتنا امید وار نہ بنا دے کہ خدا کے یہاں سے اطمینان حاصل کر لیں، اور عذاب الہی سے بھی اتنا نہ ڈرا دے کہ رحمت خدا سے مایوس ہو جائیں اور ہم یہ جانتے ہیں یہ دونوں چیزیں گناہ ناکیرہ ہیں۔ شبہ: ایک اور اعتراض یہ ہے کہ عذاب سے نجات پانے میں شفاعت کی تاثیر کا مطلب یہ ہے کہ دوسروں کا کام (شفاعت کرنے والے) سعادت تک پہنچانے اور بد بختی سے نجات پانے میں اثر رکھتا ہے درآں حالیکہ اس آیہ شریفہ کے بحاظ سے (وَإِنْ لَيْسَ لِلْإِنْسَانِ إِلَّا مَا سَعَى) صرف شخص کی اپنی کوشش ہے جو اسے سعادت تک پہنچاتی ہے۔

جواب: انسان کی سعی اور کوشش منزل مقصود تک پہنچنے کے لئے کبھی تو بطور مستقیم ہوئی ہے، اور یہ کوشش راستہ کے آخری حصہ تک جاری رہتی ہے اور کبھی غیر مستقیم ہے جو مقدمات اور واسطوں کو فرہم کرنے کے ذریعہ ہوتی ہے، شفاعت پانے والا شخص بھی

سعادت تک پہنچنے کے مقدمات اور واسطوں کو حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے، اس لئے کہ ایمان لانا اور شفاعت کے استحقاق کے شرائط کا حاصل کرنا، سعادت تک پہنچنے کی راہ میں سعی و کوشش شمار کی جاتی ہے، چاہے یہ کوشش ناقص ہی کیوں نہ ہو، اسی لئے کچھ مدت تک برزخ کی مصیبتوں اور پریشانیوں اور عرصہ قیامت کی ابتدائی سختیوں میں گرفتار ہونا پڑتا ہے لیکن بہر حال خود اس نے سعادت کی جڑ یعنی ایمان کو اپنے دل کے اندر مضبوط کرتے ہوئے اس کو نیک اعمال کے ذریعہ اس طرح آبیاری کرتا رہتا ہے کہ زندگی کے آخری لمحات تک خشک نہ ہونے پائے لہذا اس کی آخری سعادت خود اسی کی سعی و کوشش کا نتیجہ ہے اگرچہ شفاعت کرنے والے بھی اس درخت کے بار آور ہونے میں اثر رکھتے ہیں، جس طرح دنیا میں بھی بعض دوسرے افراد انسانوں کی ہدایت اور ان کی تربیت میں موثر ہیں، اور ان کی تاثیر خود شخص کی سعی و کوشش کی نفی کے معنی میں نہیں ہے۔

سوالات

- ۱۔ شفاعت کی نفی کے اوپر دلالت کرنے والی آیتوں کے ہوتے ہوئے، شفاعت کے متحقق ہونے کا کیسے اعتبار کیا جاسکتا ہے؟
- ۲۔ آیا شفاعت کا لازمہ امور خداوند عالم میں دوسروں کا اثر انداز ہونا نہیں ہے؟
- ۳۔ کیا شفاعت کا لازمہ یہ نہیں ہے کہ دایہ، ماں سے زیادہ مہربان ہو؟
- ۴۔ شفاعت کا عدالت خدا سے کیا رابطہ ہے وضاحت کیجئے؟
- ۵۔ کیا شفاعت خدا کی سنت کی تبدیلی کا باعث نہیں ہے؟
- ۶۔ کیا شفاعت کا وعدہ گنہگاروں کی گناہی اور جور ہونے کا سبب نہیں ہے؟
- ۷۔ وضاحت کیجئے کہ شفاعت، انسان سعادت کے لئے خود انسان کی سعی و کوشش کے منافی نہیں ہے؟